مقدرِ انسانی

ترجمہ

ہیومن ڈسٹنی مصنفہ لیکامت دو نوائے

از

جناب عبدالمجید قریشی

سابق پروفیسر ریاضیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

مقدر اشاعت

ناشر

سید الطاف علی بریلوی

رجسٹرار

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

سعیدہ منزل

متصل سید گرلس کالج

ناظم آباد کراچی

تعداد طبع ... آٹھ روپے

مطبوعہ ... پریس کراچی

۱۹۵۹ء

مطبوعہ انجمن پریس کراچی

فہرست مضامین

صفحات

کتاب ۲

ارتقائے حیات

۵

کتاب ۳ ۲۱۷

بنی نوع انسان کا ارتقاء

از

سید الطاف علی بریلوی

کسی معیاری کتاب کا ترجمہ ایک اونچی تصنیف یا تالیف سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مترجم کے لئے لازم ہے کہ جس زبان کی اصل کتاب ہے اور جس زبان میں اس کو منتقل کیا جائے ان دونوں کا ماہر ہو اور ساتھ ہی مبحث کتاب پر بھی اس کو کامل عبور ہو۔ تاکہ وہ مضمون میں ڈوب کر اس کی تہ سے کتاب کا جوہر نکال سکے اور مصنّف کا اصل مافی الضمیر زیادہ سے زیادہ سریع الفہم زبان میں دوسروں تک پہنچا سکے۔

مشہور زمانہ سائنس داں اور مفکر لی۔ کامت۔ دو۔ نوائے کی کتاب "ہیومن ڈسٹنی" (مقدّر انسانی) میں مصنف نے کائنات میں انسان کا صحیح مقام اور روئے زمین پر اس کے وجود کا مقصد

متعین کرنے کے لیے بکثرت مادی و روحانی لاینحل مسائل کو سائنٹیفک طریق استدلال کے ذریعہ سلجھایا ہے۔ ان مسائل کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو اُردو زبان میں سمجھانے کے لئے ایک بڑے عالم و ادیب کی ضرورت تھی۔ اُستادِ محترم جناب عبدالمجید قریشی سابق پروفیسر ریاضی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی درخواست پر اس خدمت کے لئے تیار ہو جانا ایک ایسی خوش نصیبی ہے کہ اس پر جس قدر بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

سرسید اور محسن الملک کے بعد علی گڑھ میں بلند پایہ تصنیف و تالیف اور تراجمِ علمی کا کام قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے اکابرِ علم و فن کی قابلیتِ علمی کے دنیا میں یوں تو ڈنکے بجتے رہے، لیکن کوئی ایسی بلند پایہ تصنیف جو ان کی شایانِ شان ہوتی اور بقائے دوام حاصل کرتی معرضِ وجود میں نہ آسکی۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی بھی اسی اول درجے کے اکابرِ علی گڑھ میں سے ہیں اور دلی افسوس تھا کہ تقریباً پچاس سال تک علم اور اہلِ علم کی ہمیشہ خدمت کے باوجود وہ بھی کوئی کتاب اب تک نہ لکھ سکے تھے ....

لی۔ کامٹ۔ دو نوئے۔ کے عالمانہ ترجمہ نے اس کمی کو پورا کر دیا اور جس طرح مصنف کا نام ہمیشہ باقی رہے گا اس کے فاضل مترجم کو بھی دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۹ء   (الطاف بریلوی)

دیباچہ از مترجم

جنوری ۱۹۵۳ء کے رسالہ "العلم" میں ڈاکٹر ایل۔ کامٹے۔ نواسٹے کی تصنیف "مقدر انسانی" پر میرا تبصرہ شائع ہوا۔ میں نے اس میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس تصنیف کا ترجمہ اردو میں ہونا مناسب ہے تاکہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستان میں ایسا نیا علم کلام مرتب ہو سکے جو ابنِ آدم کی عقلی، سائنٹیفک معلومات، اور مذہب کی لازوال حقیقتوں کو ہمارے نوجوان طالبعلموں کے ذہنی نقشے میں ہم آہنگی کے ساتھ بٹھلا دے۔ جیسا کہ مصنف نے بھی کہا ہے اور ہم سب کا تجربہ بھی یہی ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ گروہ کے دماغوں میں یہ حقیقتیں الگ الگ خانوں میں رکھی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کا منہ چڑاتی رہتی ہیں۔ اور اعمال میں خلوص کے بجائے ریاکاری کی تخلیق کرتی رہتی ہیں۔ مقدرِ انسانی میں مصنف کا مقصد اسی تفریق کو دور کر کے مذہب اور سائنس میں مصالحت پیدا کرنا ہے

ڈاکٹر نوائے کی نظر سائنس پر وسیع اور ہمہ گیر ہے لیکن مذہب کے اعتبار سے وہ عیسائیت کے ماورائے اور مذاہب سے ناواقف ہیں اور "کل حزب بما لدیہم فرحون" کے مصداق ہیں۔ ایک صحیح اور سائنٹیفک اصول تو وہی ہے جو اسلام کا ہے کہ صداقت اصلاً سب مذاہب کے پاس ہے عملاً سب نے کھو دی ہے۔ اور عیسائیت کے بارے میں بھی جو مصنف نے برتری کی رائے اکثر موقعوں پر ظاہر کی ہے وہ جذباتی ہے۔ کسی جگہ بھی دلائل سے اس برتری کی توثیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اہم اور قابل توجہ چیز ان کا طریقہ استدلال ہے جو مذہب کی من حیث الکل ضرورت اور صداقت کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ سات برس تک جب اس کے ترجمے کی طرف کسی نوجوان نے توجہ نہ کی تو مجبوراً مجھے اس کام کو کرنا پڑا۔ ترجمے میں پہلی مشکل تو مصطلحات کی تھی جو ابھی تک اُردو میں مکمل طور پر دستیاب نہیں۔ یہ مہم اپنی بساط کے مطابق سر تو کر لی گئی لیکن اطمینان نہیں ہوا۔ دوسری مشکل ان جانوروں اور پودوں کے نام ہیں جو مختلف ارضی زمانوں میں وجود میں آئے اور مٹ گئے۔ ان کے فرضی نام جو مغرب کے علمانے قائم کئے ان کے لئے مترادف نام پیدا کرنے کی

میں نے سعی نہیں کی البتہ تشریح کر دی ہے اور جہاں حواشی کی ضرورت تھی اسے پورا کر دیا ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو پیش آئی وہ مصنف کا طرزِ تحریر ہے۔ ڈاکٹر موصوف فرانسیسی ہیں اور کتاب انہوں نے انگریزی میں لکھی ہے۔ ان کا اندازِ خیال اور اسلوبِ بیان فرانسیسی ہے جو خود انگریزی زبان میں بھی غیر مانوس ہے۔ جن صاحبان نے اس کتاب کو دیکھا ہوگا وہ اتفاق کریں گے کہ اکثر جگہ مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ میں نے انکے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایک آدھ جگہ مفہوم واضح نہیں ہوا۔

خدا سے دعا ہے کہ جس غرض سے یہ کتاب ترجمہ کی گئی ہے وہ پوری ہو۔ والسلام

عبدالمجید قریشی

۹۰ سول لائینز سرگودھا

۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء

پیری لیکامت دونوائے۔

مختصر سوانح حیات (از ادارۂ اشاعت)

ڈاکٹر دونوائے، جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور ایک فرانسیسی ماہر سائنس داں ہیں، ایک فن کار خاندان کے پہلے شخص ہیں جن کے دل میں سائنس کی کشش پیدا ہوئی۔ ان کی والدہ ہرمین لیکامت، دونوائے کئی ناولوں کی مصنف تھیں جنہیں سے Amitie Amoureuse کا ترجمہ سولہ زبانوں میں ہوا اور فرانسیسی زبان میں چھ سو مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی۔ ان کے والد فن تعمیر کے ماہر تھے جنہوں نے رومانیہ کے کلیساؤں کے تعمیری نقشے مرتب کئے، اور ان کے (دادا جولین اودی نو) شیشوں پر نقاشی کرنے والے آخری ماہرین میں سے تھے جنہوں نے Chartres اور دوسرے کلیساؤں کی کھڑکیوں کی نقاشی کی تجدید کی۔ Corneille[1] ان کے اجداد میں سے ایک تھا۔

---

[1] از مترجم) طامس کارنیل (۱۶۰۹ - ۱۶۲۵) مشہور فرانسیسی ڈرامہ نویس۔

ڈاکٹر نواے کی پیدائش ۱۸۸۳ء میں پیرس میں ہوئی۔ ان کی تعلیم سار بون میں ہوئی اور شعبۂ قانون میں اس وقت ان کے پاس ال ال بی، پی ایچ بی، اور ایس سی ڈی کی سندیں ہیں ۱۹۱۵ء میں جب کہ ڈاکٹر نواے فرانسیسی فوج میں ایک افسر تھے ان کی ملاقات ڈاکٹر الیکس کارل سے ہوئی۔ اور ان کے زیر اثر انہیں ان اہم مسائل میں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا، گہری دلچسپی پیدا ہوگئی ڈاکٹر نواے نے جنگی ہسپتال کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے جو الجبرائی تحقیقی کام معمل میں کیا اس کی بدولت راک فیلو انسٹی ٹیوٹ نیویارک کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسا مسئلہ حل کر ڈالا جو مدت سے ماہرین عضویات کا دردِ سر بنا ہوا تھا، یعنی زخموں کے عمل اندمال کیلئے ریاضیاتی ضابطہ کی دریافت، بہ الفاظ دیگر انہوں نے ایک ایسی الجبری مساوات ڈھونڈ نکالی جس کی بدولت زخم کے عمل اندمال کو نگاہ میں رکھنا ممکن ہوگیا اور پہلے سے یہ اندازہ کرلینا آسان ہوگیا کہ سطحی زخم کتنی مدت میں پوری طرح بھر جائے گا۔ ریاضی پہلی مرتبہ کامیابی کے ساتھ ایک حیاتیاتی مسئلے میں استعمال ہوئی (۱۹۱۷)۔ اس ضابطے میں مریض کی عمر شامل حساب کرکے زخم کے اندمال کی رفتار سے مریض کی اصلی عضویاتی عمر معلوم

کی جاسکتی ہے۔ بعدازاں اسی کی بدولت وہ "حیاتیاتی زمان" کا ایک قطعی جدید تصور قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو جامد اشیا کے طبعی زمان سے مختلف ہوتا ہے، اس کی رفتار امتداد بھی مختلف ہوتی ہے اور ضابطہ بھی مختلف (حسابی ضابطے کی بجائے اس کا ضابطہ لوگارتھمی ہوتا ہے)۔ اس کا فلسفیانہ ماحصل یہ ہوا کہ بچے کے لئے زمانی قدر وہی نہیں ہوتی جو جوان کے لئے ہوتی ہے۔ یہ انقلاب آفریں دریافت ۱۹۳۶ء میں فرانس میں شائع ہوئی؛ لندن اور نیو یارک میں ۱۹۳۷ء میں۔ بحیثیت راک فیلر انسٹیٹیوٹ کے رفیق کارکن کے انہوں نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۸ء تک زیادہ تر خون کے خواص پر تحقیقی کام کیا ہے جسمیں زہر یا متعدی بیماریوں سے محفوظ رہنے کے اساسی مسائل کا خاص طور پر خیال پیش نظر رہا۔ انہوں نے بیس کے قریب نئے مظاہر دریافت کیئے جو آج جراحی اور صنعتی معملوں میں مستعمل ہیں۔ ضمناً منجملہ بہت سے آلات کے جو انہوں نے ایجاد کیئے اور درست کئے ایک آلہ ایسا نکلا جس کی مدد سے، پہلی مرتبہ، بعض سالموں کے تین ابعاد محسوب کئے اور طبعی کیمیا کی اساسی مستقل مقدار (THE ABROULEO CONSDUT -AUUT) کا بلاواسطہ تعین کر کے شائع کیا۔ جس آلے (سطحی تناؤ کا ترازو)

غلے کی بدولت یہ دریافتیں کیں اس پر "فلاڈیلفیا کے فرینکلن انسٹیٹیوٹ" نے ۱۹۲۲ء میں ان کو انعام دیا اور یہ آلہ اب بھی بشمول یو-ایس-اے کے بہت سے ملکوں میں صنعتی پیمانے پر تیار کیا جاتا ہے ۱۹۲۱ء میں وہ پیرس واپس آگئے۔ ۱۹۲۷ء تک وہ پاسچر انسٹی ٹیوٹ کے اہم شعبے حیاتیاتی طبیعات کے افسر اعلیٰ کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں وہ ساربون میں "Ecole des Hautes Etudes" کے ناظم و نگران مقرر ہو گئے۔

۱۹۲۳ء میں ان کی امریکہ کی خاتون میری بشپ ہیری مین سے شادی ہوئی اور وہ جب سے ان کی تحقیقاتی کام میں ان تھک رفیق کار رہیں۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں وہ نازی حکومت کے تحت پیرس میں مقیم رہے لیکن ۱۹۴۲ء میں وہاں سے بھاگ نکلے اور اپنا تحقیقی کام جاری رکھنے کے لیے یونائیٹڈ سٹیٹس میں آ گئے۔

۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں وائی ایم سی اے کی بڑی اور بحری شعبے کی کفالت میں انہوں نے اس ملک کے وسیع دورے کئے اور بیسیوں فوجی کیمپوں اور یو-ایس او کلبوں میں بین الاقوامی مسائل پر تقریریں کیں اور نازیوں کے زیر حکومت

جو ان کو تجربات حاصل ہوئے تھے ان کی توضیح وہ بیان کرتے رہے۔ اب وہ کیلی فورنیا میں رہتے ہیں۔

اپنی بھرپور زندگی کے دوران میں، جوانی کے عالم میں انہوں نے سر ولیم ریمزے[1] سے تعلیم پائی اور پاسٹری، اور مادام کیوری سے۔ قریب دوسو مقالے ان کے شائع ہوچکے ہیں جن میں زیادہ تر اعلٰے خالص علمی قسم کے ہیں۔ اپنی تحقیقاتوں اور سائنس کے فلسفے پر سات تصنیفیں بھی ان کی شائع ہوچکی ہیں۔ ان تصانیف میں سے ایک L'Avenir de L'Esprit, ۱۹۴۲ء کے مقبوضہ فرانس میں آٹھ ماہ کے اندر بائیس دفعہ شائع ہوئی اور فرانسیسی اکاڈیمی نے اس کتاب کی تصنیف پر ان کو انعام دیا۔

آج ڈاکٹر نوائے کو وسیع شہرت حاصل ہے اور ہر ملک کے ماہرین سائنس ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

---

[1] سر ولیم ریمزے انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مشہور انگریز ماہر کیمیا۔ (از مترجم)

۱۹۴۳ء میں سوئٹزر لینڈ کی لوزان یونیورسٹی نے ان کی تین تصنیفوں، L'Homme devant la اور Le Temps et la Vie، L'Avenir de l'Esprit, اور Science، کو گزشتہ دس برس کی سائنٹیفک فلسفہ پر بہترین کتابیں قرار دے کر ان کو آرنلڈ ریمان انعام دیا اور ان کی قابلیت کو سراہا۔
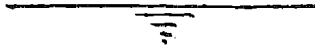
دیباچہ

(از مصنف)

اس خیال کے پیش نظر کہ ہر تعلیم یافتہ مرد اور عورت اس سے مستفید ہو سکے یہ کتاب آسان زبان میں لکھی گئی ہے اور حتی الامکان علمی مصطلحات سے گریز کیا گیا ہے مگر اس سے مطالب کی صحت بیان متاثر نہ ہو۔

بایں ہمہ چونکہ یہ نئے خیالات اور ان کی توجیہات کو انگیز کرتی ہے اور فکر کو دعوت دیتی ہے اس لیے ممکن ہے کہ ناظرین سے غیر معمولی ہمہ تن متوجہ رہنے کی سعی کا مطالبہ کرے۔ ممکن ہے کہ ان کے مطالعہ کی رفتار سست رہے اور کتاب کے بعض حصوں پر بار بار غور کرنا پڑے لیکن کوئی چیز اس میں ایسی نہیں جسے ایک ذہین عورت یا مرد سمجھنے پر آمادہ ہو تو سمجھ نہ سکے۔

جس طرح خوراک بغیر چبا کر کھائے ہوئے ہضم ہو کر جزو بدن نہیں بن سکتی بعینہ اسی طرح خیالات بھی بغیر غور و فکر اور سمجھے سکے

اپنائے نہیں جا سکتے۔ مصنف نے اپنے اسلوب بیان کو واضح بنانے کی پوری کوشش کی ہے لیکن کسی اوزار کے استعمال کے متعلق خواہ کتنی ہی صاف ہدایتیں کیوں نہ دی جائیں کوئی شخص محض ان کو پڑھ کر اس اوزار پر دسترس حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے اوزار کو ہاتھ میں لے کر مشق بہم پہونچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم ناظر سے استدعا کرتے ہیں کہ ان خیالات پر جو اس کے جاننے بوجھے نہیں دسترس حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرے کہ وہ ان خیالات پر تنقید کرے ان کو اجزا میں تحلیل کرے اور بن پڑے تو ان کے لئے متبادل خیالات پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

موجودہ زمانہ کے علمی مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ علم کی شدید واقفیت حاصل کرلینا کافی نہیں۔ ہر ایک مہذب انسان کا ان مسائل پر بحث کرنا تو درکنار ان کو سمجھ لینا بھی آسان نہیں۔ وقتاً فوقتاً اس امر واقعہ کی بدولت حقیقت کو توڑ موڑ کر ظاہر کرنے اور عوام کو بہکانے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اگر موجودہ مسیحی[1] تہذیب کو بچانا ہے تو صالح عزم اور یقین رکھنے والے لوگ اس امر سے آگاہ ہوجائیں کہ انہیں زندگی میں کیا فرض ادا کرنا ہے اور

---

[1] یہی صورت اسلامی تہذیب و ثقافت کے لئے بھی درپیش ہے۔

ضرور کرنا ہے۔

مستقبل کو بنانے میں ہر شخص پر ایک مشترکہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے لیکن یہ ذمہ داری صرف اسی طرح ایک تعمیری سعی میں رونما ہو سکتی ہے جب لوگ اپنی زندگی کے مقاصد اور اپنی جدو جہد کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہوں اور ایک اعلیٰ مقدر انسانی پر یقین رکھتے ہوں۔

چونکہ مصنف کے پیش نظر مقصد اس یقین اور اعتماد کو باقاعدہ ٹھوس بنیادوں پر قائم اور ثابت کرنا ہے اس لئے اسے امید ہے کہ ناظر کو غور و فکر کی زحمت اٹھانے کا صلہ یہ ملے گا کہ ان نہایت اہم مسائل کے متعلق جو ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان کو دعوتِ فکر دیتے آئے ہیں ایک واضح تصوّر اس کو حاصل ہو جائے گا۔

پی - ایل - این

ٹی. لا. ڈکٹ مویشی خانہ
کولوریڈو ۱۹۴۵ء
لاکوانٹا ، البٹا ڈینا
کیپلے فورنیا ۱۹۴۶ء

مقدمہ

(از مصنف)

حال ہی میں نوع انسانی تاریخ کے ایک نہایت ہی تاریک دَور میں سے گزری ہے۔ اور چونکہ گزشتہ جنگ دُنیا کے دور دراز گوشوں تک پھیل گئی تھی اور اس کی عدیم المثال تباہ کاری نے ہماری ان سب دلفریب اُمیدوں کو جو انسان نے اپنے قابلِ فخر تمدّن کی استواری اور استقلال کے متعلق قایم کرلی تھیں برباد کردیا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ یہ دَور تاریخ کے جملہ ادوار سے زیادہ المناک ثابت ہو۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی ممالک میں ایک عام بے چینی طاری وساری ہوگئی تھی۔ یہ کوئی نیا منظرِ فطرت نہ تھا۔ انسانی ضمیر جس کو پہلی جنگ کے ماقبل پچاس برس کی میکانیکی ترقی نے مدہوش کر رکھا تھا۔ یہ بے چینی فقط اس ضمیر کی بیداری کا پتہ دیتی تھی۔

تمدن کے مادی پہلو کی تیز رفتار بالیدگی نے انسان کی دلچسپی کو اتنا انگیز کیا کہ وہ ہر فردا کے ساتھ ایک نئے اعجاز کا بے صبری سے

منتظر رہنے لگا۔ حقیقی مسائل یعنی مسائلِ انسانی کو حل کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا۔ رفت نئی ایجاد کے حیرت انگیز اور شاندار انکشافات نے جو ۱۸۰۰ء کے بعد سے تقریباً علی التواتر رونما ہوتے رہے انسانوں کو مسحور کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے بچے سرکس کو دیکھ کر ایسے مسحور ہو جاتے ہیں کہ انہیں کھانے تک کا ہوش نہیں رہتا[1]۔

ایجادوں کا یہ عظیم الشان منظر حقیقت کا مظہر قرار پایا۔ اور حقیقی اقدار نئے اختر کی چمک دمک میں ایسی ماند پڑیں کہ عوام کی نگاہ میں ان کا درجہ گر گیا اور حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اس پر مزید یہ ستم ہوا کہ انیسویں صدی کے دانش وروں اور ماہرین سائنس نے حقیقی اقدار پر بحث کرنے وقت بجائے کوئی حل پیش کرنے کے فقط سوالیہ نشانات یا اشتباہات پیدا کرنے پر اکتفا کر کے ہمارے فہمیدہ عوام کے دماغوں کو پہلے ہی سے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس تغیر کو بہ آسانی اور بغیر کسی روحانی صدمے کے قبول کر لیں۔

ایسے لوگ بھی بہت تھے جنہیں اس آنے والے خطرہ کا پہلے سے اندیشہ تھا اور انہوں نے خطرے کی گھنٹی بھی بجائی لیکن کسی نے اس پر

---

[1] آج بھی روس اور امریکہ کے سیارے اور جوہری گولے یہی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

توجہ نہ دی۔ اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ ایک نیا "معبود باطل" پیدا ہو گیا تھا اور ایک نئی توہم پرستی یعنی "کل جدید لذیذ" پر ایمان رکھنے والی عقیدت نے عوام پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ مزید براں اس فہمیدہ طبقے یعنی آنے والی آفت سے ڈرانے والے پیش بینوں کے پاس اس رجحان کا مقابلہ کرنے کے لئے فرسودہ اور وقت کی ضروریات سے لگا نہ کھانے والے دلائل کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ دنیا دن بدن متغیر ہو رہی تھی جس میں ہر گذشتہ روز کے ملبوس کی جگہ امروز کا بھڑکیلا اور غیر متوقع لباس لیتا جا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ انسانوں کی نوخیز جماعت اس چمک دمک سے چکا چوند میں پڑی ہوئی آنکھیں پھاڑے اس نئے منظر کو استحسانی اور وجدی کیفیت سے تک رہی تھی بلکہ سائنس اور اپنی ذات کی بے پناہ طاقت نے ان کے قلوب میں ایمان کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ راسخ العقیدہ فہمیدہ بزرگ اس رجحان کا مقابلہ تو کر رہے تھے مگر ان کے دلائل میں کہنہ لفظیں اور فرسودگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے الفاظ جوانی کی سطوت سے معرا تھے۔ اور ضمیر کی بیداری کے لئے ان کی پر جوش استدعائیں یوں بے کار ہو گئیں کہ ضمیر کا کوئی خواستگار نہ رہا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو ضمیر کو بالاعلان ایک انوکھی دقیانوسی اور فضول چیز سمجھنے لگے۔ کلیساؤں نے بہت کچھ

ہاتھ پیر مارے لیکن اپنی تبلیغ میں تجدید کی روح پھونکے بغیر ان
کوششوں کے نتائج اتنے باروور نہ ہوئے کہ وہ عالمگیر تخریب اخلاق کو
یا عوام کے انحراف اور بے اطمینانی ہی کو روک لیتے۔ بجز اس ناکامی
کے اور کچھ نتیجہ نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ لازمی تعلیم نے عوام کی ذکاوت
کے لئے نئے راستے۔ شاہراہیں اور کوچے کھول دیئے تھے۔ وہ زیادہ
ہوشمند ہوئے بغیر عقلی استدلال کے ہتھکنڈوں کا استعمال سیکھ گئے۔
ایک انتہا درجہ کا دلفریب اوزار۔ ایک نیا کھلونا ان کے ہاتھ میں
آگیا تھا اور وہ اس فریب میں مبتلا ہوگئے کہ اس کا استعمال کرنا بھی
وہ جانتے ہیں۔ اس اوزار نے سنسنی خیز نتائج پیدا کئے اور رفتہ رفتہ
ان کی مادی زندگی کی قلب ماہیت کر ڈالی اور لامحدود توقعات
کو برانگیختہ کر دیا۔ یہ طبعی امر تھا کہ وہ عزت جو اَب تک پادریوں
کے لئے وقف تھی بتدریج ان لوگوں کو منتقل ہوگئی جو فطری قوتوں
پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کر رہے تھے اور فطرت کے اسرار
کی تہہ کو پہونچ رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مادہ پرستی صرف مادی فنون کے واقفکاروں
ہی میں نہیں پھیل رہی تھی بلکہ عوام بھی اس کا کلمہ پڑھنے لگے تھے
عقل کی اس بیماری کا ازالہ کرنے کے لئے بھی عقلی استدلال ہی کو کام

میں لانا چاہئے تھا۔ ریاضیاتی استدلال کا توڑ صرف دوسرے ریاضیاتی استدلال ہی سے ہوسکتا ہے۔ علمی دلائل کا اگر مقابلہ کرنا ہو تو ویسے ہی علمی دلائل پیش کرنا ضروری ہیں۔ اگر ایک قانون داں یہ ثابت کرنا چاہے کہ آپ غلطی پر ہیں تو آپ کا اپنے مقدمے میں جذباتی یا منطقی استدلال مفید نہیں ہوگا۔ وہ تو جبھی قائل ہوگا جب آپ قانون کی ان دفعات کو جن کو وہ اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے پیش کر رہا ہے قانون ہی کی دوسری دفعات سے غلط ثابت کر دیں۔ آپ کا برسرحق ہونا تنہا آپ کو کامیاب نہ کر سکے گا۔ مخالف کے اعتراضات کو موضوعی (SUBJECTIVE) اور نفسیاتی دلائل سے رد کرنا ایسا ہی ناممکن ہوگا جیسے غلط کنجی سے کسی دروازہ کو کھولنا۔

بتدریج ہم کو یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ فلسفہ لاادریت اور فلسفہ مادیت فطرت کی علمی تفسیر کے ناگزیر منطقی نتائج ہیں۔ یہ قطعاً دعویٰ غلط ہے اگر ہمیں ایک کی بے دست و پا کر دینے والی توضیحات اور دوسرے کی تباہ کن توجیہات کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمیں دشمن ہی جیسے ہتھیاروں سے اسی کے میدانِ عمل میں اس پر حملہ کرنا چاہئے اس کی بداعتقادی یا محض اس کے منفیانہ اعتقاد کی وجہ سے اگر

ہم لا ادریہ کو قائل نہ بھی کر سکے تو اس کی توقع ضرور ہے کہ ایک غیر طرفدار اور راست باز ناظر جو اس سعی کے نشیب و فراز کو بغور مطالعہ کرے گا یہ جان جائے گا کہ پلّہ کس حریف کے ہاتھ رہا۔

بہ الفاظ دیگر فی زمانہ اگرچہ ہیں کہ جذباتی اور روایتی دلائل جو کبھی اَن پڑھ عوام کی اخلاقی بیداری کے لئے کافی ہو جاتی تھیں الحاد کو نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہو جائیں گی تو یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم قلعہ رواں یا جنگی آہن پوش موٹروں کا مقابلہ سواروں کے رسالوں سے تو نہیں کرسکتے اور نہ ہوائی جہازوں کا تیر و کمان سے۔ مذہب کی بیخ کنی کے لئے علم (SCIENCE) کا استعمال کیا گیا ہے تو ہم کو علم ہی کے ذریعہ اس کو مستحکم بھی کرنا ہوگا۔ گزشتہ پانچ صدیوں میں دُنیا ترقی کی دوڑ میں کافی آگے نکل گئی ہے۔ اس امر کا تسلیم کرنا اہم ہے اور نئے احوال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ناگزیر ہے۔ ہم اب نیویارک سے سین فرانسسکو گھاس ڈھونے والی کشتیوں میں نہیں جاتے اور نہ ہی جادوگرنیاں کہہ کر عورتوں کو نذرِ آتش کر سکتے ہیں جیسا کہ سترھویں صدی میں بعض ممالک میں ہوتا تھا۔ متعدی بیماریوں کا علاج آج مسہلوں اور فصد کھولنے سے نہیں کرتے لیکن اس بڑے خطرے کا جو انسانی معاشرے کو تباہ و برباد

کر رہا ہے ہم اب بھی انہیں دو ہزار برس پرانے اوزاروں سے کرنا چاہتے ہیں اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ ہمارے پاس ایک بڑا ذخیرہ ان قوی اوزاروں کا موجود ہے جو فوری نہ سہی لیکن یقینی کامیابی کے بالآخر ضامن ہیں۔

اس کتاب کی تصنیف سے مصنف کے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ انسان نے جو علمی ذخیرہ آج تک جمع کیا ہے اس کا تنقیدی نگاہ سے معائنہ کر کے منطقی اور عقلی نتائج اس سے اخذ کرے۔ ایسا کرنے سے مصنف کو یقین ہے کہ ہم پر واضح ہو جائے گا کہ یہ نتائج لابدی طور پر ہستی خالق کائنات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ تصنیف ہستی باری تعالےٰ پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تو بس اتنی ہی مفید ہے کہ وہ ان علمی دلائل کو کامیابی کے ساتھ حریفوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ان کے لئے لکھی بھی نہیں گئی۔ اس کے اصلی مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے دل میں زندگی کے کسی لمحہ میں بعض مقالات یا تجربات کی بنا پر شکوک پیدا ہو گئے ہوں۔ اس کے پیش نظر وہ لوگ ہیں جو اپنی اُس شخصیت میں جس کو وہ معقولی (RATIONAL) خیال کرتے ہیں اور اپنی دوسری شخصیت میں جو روحانی، مذہبی اور جذباتی ہے تضاد پاتے ہیں۔ یہ ان

صالح عزم والے ناظرین کے لئے ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی کا نصب العین ایک فائق ضمیر کا حصول ہے اور یا نصراحت انسانی خوبیوں کے ہم آہنگ امتزاج سے اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا ہے۔ یہ ان سب لوگوں کے لئے ہے جو اپنی جدو جہد اور ابتلاؤں کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ یہ ان کیلئے ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کی جدو جہد پایۂ تکمیل کو پہنچکر نظام کائنات کا جزو صالح بن جائے۔ اور جو اپنی بساط کے مطابق اس کائناتی نظام کے مدد ہیں اور اس طرح اپنی اغراض کے تنگ دائرے سے ماورا جاکر اپنی ہستی اور تمناؤں کو ایک نتیجہ تدبر کا حامل بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ان سب اشخاص کے لئے ہے جو انسانی عظمت کی حقیقت اور اس کائنات میں اس کے مقصد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ان کے لئے بھی ہے جو ابھی تو ان حقیقتوں کے قائل نہیں لیکن اسکے خواہشمند ہیں کہ ان کو یقین ہو جائے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے پہلے ہمیں انسانی قوتِ خیال کے عمل کی نوعیت (MECHANISM OF THOUGHT) پر غور کرنا ہوگا تاکہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے تصوّرات (CONCEPT) اور ہمارے استدلال کو کتنی حقیقی قدر و قیمت دی جا سکتی ہے اور مادّین (MATERIALISTS) کے تصورات اور استدلال کو کتنی۔ موخرالذکر

گروہ میں بعض لوگ تو پرخلوص ہیں اور انہیں اپنی دماغی عقلوں پر ایک بے تصنع اعتماد ہے مگر ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اتنے مخلص نہیں اور ان کا خیال ہے کہ عوام کو علمی (SCIENTIFIC) پردے (STAGE) کے پیچھے نہ آنے دینا چاہیئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو یہ پتہ چل جائے کہ دارالتمثیل (SCENERY) کے پردے اور دیگر لوازمات بھی پیچھے اور ٹاٹ ہی کے بنے ہوتے ہیں جن کی بدولت فرضی واردات اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اکثر ابہامات اور تضادات کو ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کو خود یہ نظر ہی نہ آتے ہوں حقیقت الامر بھی یہی ہے کہ یہ کام دارالتجربہ (LABORATORY) میں کام کرنے والوں کا ہے بھی نہیں کہ وہ توضیح کی مشکلات۔ نظریوں کی خامی اور اضافیت کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ کام سائنس کے فلسفیوں کا ہے۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ایسے فلسفی بہت شاذ ہیں اور جو ہیں ان کا اسلوب بیان ایسا ہے جس کو خاصے تربیت یافتہ عوام بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ہماری رائے میں ہر غیر ماہر دنیا دار کو جدید علمی اور فلسفیانہ خیالات سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور ان خیالات کا استعمال بھی اتنا اس کو آجانا چاہیئے کہ وہ علمائے مادیات

کے دلائل سے نہ گمراہ ہوسکیں اور نہ مرعوب۔ کیونکہ اس گروہ کے لوگوں کا خواہ وہ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں، استدلال غلطی سے ہمیشہ مبرا نہیں ہوتا۔

اگر ناظر کو مقدّر انسانی کے لیے دلچسپی ہے تو ہمیں امید ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ اس بے پایاں مسئلے سے عہدہ برا ہونے کے لئے ہم اسی وقت کمربستہ ہوسکتے ہیں جب ہم کو یہ معلوم ہوجائے کہ انسانی غور وفکر جس کی مدد سے اس پر عبور حاصل کرنا ہے اسکی ناگزیر کوتاہیاں کیا ہیں۔ جب طبیعیات کے علماء کسی مفروضے (HYPOTHESIS) کی جانچ کے لئے ناپ تول کرتے ہیں۔ جب کوئی ہیئت داں کسی کوکب کے محل وقوع کی صحت کی پڑتال کرتا ہے تو ان کو اپنے اوزاروں کا درجۂ صحت ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ انکے عملی مشاہدوں میں غلطی کا قطعۂ اعتدال یا حد اوسط (MEAN ERROR) کیا ہے۔ اپنے اندازوں میں اس کا وہ لحاظ رکھتے ہیں اور جملہ علوم (SCIENCES) کی کتابوں میں ایک ضروری باب اغلاط کے احصار (CALCULUS OF ERROR) کا ہوتا ہے۔ ہمارا موضوع تحقیق انسان ہے۔ اس میں جو اوزار استعمال ہوتا ہے وہ دماغ ہے۔ تحقیق کی سعی کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ

اس ادبار کی کوتا ہیاں کیا ہیں۔ اس طرح کی تحقیقات اڈبن کی علمی اور ریاضیاتی استدلال میں اچھی خاصی کمزوریاں ظاہر کرے گی۔ یہ کمزوریاں اتنی سنگین ہیں کہ ہماری موجودہ علمی معلومات کی اصلی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے استدلال کی علمی قدر وقیمت کو غارت کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد ہم کائنات میں انسان کے صحیح مقام پر غور کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں مسئلہ ارتقا (EVOLUTION) کا گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہ مطالعہ ہمیں ایک ایسے مفروضے کے دعوے کی طرف رہنمائی کرے گا جو بنی نوع انسان کے ارتقا کو عومی کائناتی ارتقا میں ضم کر دے گا اور اس کے منطقی نتائج کو پختہ کرنے میں مدد دے گا۔

مصنف کے پیش نظر بالصراحت نوع انسانی کی بھلائی ہے۔ اس کو یقین واثق ہے کہ موجودہ بے اطمینانی کلیتاً اس امر کی بدولت ہے کہ ذہانت نے اس سائنس کا سہارا لے کر جو ابھی خود عالم طفولیت میں ہے ان عقیدوں کو تباہ کر دیا ہے جن کی بدولت فرد کی زندگی کا کچھ مفہوم تھا۔ اس کی جدوجہد کے لئے ایک وجہ پیدا ہوتی تھی اور ایک اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی تھی۔ یہ مذہبی عقائد تھے۔ اس غارت گری کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو زندہ رہنے

کی ہی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

آزاد قوت ارادی کی نفی۔ اخلاقی ذمہ داری کی نفی۔ فرد انسانی کو ایک طبعی۔ کیمیاوی وحدت تصور کرنا۔ اسے ذی حیات مادے کا ایک ذرہ خیال کرنا جو اور حیوانات سے کچھ مختلف نہیں۔ مادہ پرست علما کے ایسے گمان ہیں جو ناگزیر طور پر ایک مہذب اور با اخلاق انسان کے وجود کو ختم کر دیتے ہیں۔ روحانیت اور رجا کے قاطع ہیں اور انسانی زندگی کے کلیتاً بے مصرف ہونے کا خوفناک اور ہمت شکن احساس پیدا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا بحیثیت انسان کے مابہ الامتیاز ہی یہ ہے کہ وہ مجرد تصورات (ABSTRACT IDEAS) اور اخلاقی تصورات اور روحانی تصورات کا حامل ہے اور یہی امتیاز اس کے لئے مایۂ ناز بھی ہے۔ یہ تصورات اتنے ہی اہم ہیں جتنا اس کا جسم اور یہی اس کے وجود کو وہ قدر و قیمت اور اہمیت عطا کرتے ہیں جو ان کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لئے اگر ہم اپنی زندگی کو بامعنی بنانا چاہتے ہیں جدوجہد کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں تو علمی اور عقلی طریقے سے ان تصورات کی قدر و قیمت کو نئے سرے سے بحال کرنا چاہئے

ہمارے نزدیک اس مقصد کو حاصل کرنے کا صرف یہ ہی طریقہ ہے کہ ان کو ارتقا کا ہی ظہور سمجھ کر عمومی ارتقا میں مدغم کیے کی کوشش کریں بعینہ اسی طرح جیسے آنکھیں۔ ہاتھ اور واضح قوت نطق ارتقا کا ظہور سمجھے جاتے ہیں۔

یہ واضح کرکے دکھلانا ہے کہ ہر شخص کو ایک معین خدمت ادا کرنا ہے اور یہ کہ وہ اس کو ادا کرنے یا نہ کرنے میں بالکل مختار ہے۔ وہ ایک سلسلے کی ایک کڑی ہے اور خس کا تنکا نہیں ہے جو سیلاب حوادث میں بہا چلا جا رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ انسانی عظمت بے معنی جملہ نہیں اور جو انسان اس پہ یقین نہیں رکھتا اور اس عظمت کو حاصل کرنے کی سعی نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو حیوان کے درجے پر گرا دیتا ہے۔

مصنف موجودہ علمی حاصلات کی مدد سے ان خیالات کو ذیل کے صفحات میں ناظر کے غور و فکر کے لئے پیش کرنا چاہتا ہے۔

کرۂ ارض پر حیات کے زمانے

کل مدت	تقریبی مدت	تفصیلات احوال حیوانات نباتات وغیرہ	اقران	ازمنہ	ادوار
پانچ کروڑ چالیس لاکھ برس	دس لاکھ برس	نوع انسانی ۔ برفانی سیلاب	موجودہ قرن جدید ترین قرن (PLEISTOCENE)	زمانہ رابع ارضی	متعلق بہ جدید دورحیات (CENOZOIC)
	ساٹھ لاکھ برس	ہاتھی ۔ گینڈا ۔ ہرن	جدید تر (PLIOCENE)	زمانہ ثالث ارضی ذوات الثدی کا زمانہ	
	ایک کروڑ بیس لاکھ برس	لیسٹوڈان (ہاتھی سے مشابہ جانور جو اب معدوم ہیں)	جدید (MIOCENE)		
	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ برس	ٹیلیو تھیریم (لمبی گردن کا ذوات الثدی جو اب معدوم ہے) موتیوں کا آنا	قریب جدید (OLIGOCENE) طلوع زمانہ ثالث		
	دو کروڑ برس	اعلیٰ قسم کے آنول نالی والے ذوات الثدی	(EOCENE)		

حاشیہ مترجم :-

کرہ زمین جب وجود میں آگیا اور اس کے ٹھنڈا ہو جانے کے بعد جب سطح زمین پر حیات نمودار ہوئی تو اس کے بعد کے زمانے کو ماہرین علم طبقات الارض نے طبعی احوال، نباتات، اور جانداروں کے اصناف وغیرہ کے اعتبار سے پانچ دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ جو نقشے میں ادوار والے کالم میں درج ہیں۔ پھر ہر دور کو حیات کی مختلف شکلوں کے وجود میں آنے کے اعتبار سے ذیلی زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ذیلی زمانوں میں جو حیات کی بڑی بڑی اصناف تھیں وہ دکھلائی گئی ہیں اس کے بعد ہر زمانے کو قرنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہم نے ERA کا ترجمہ دور (جمع ادوار) کیا ہے AGE کا ترجمہ زمانہ اور PERIOD کا ترجمہ قرن ۔

قرنوں کے نام بالعموم ان ممالک ۔ علاقوں ۔ چٹانوں ۔ پہاڑوں کی نسبت سے رکھے گئے ہیں جن کی چٹانوں کے طبقات ۔ کوئلہ کے طبقات کھریا مٹی کے طبقات وغیرہ میں حیات کے آثار پر تحقیق کی گئی ۔ مثلاً وسطی دور حیات کے ذیلی زمانے ثانی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا کھریا مٹی سے انگلستان سے متعلق ہے ۔ دوسرا جورا پہاڑ جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے بیچ میں ہے اس سے منسوب ہے اور JURASSIC کہلاتا ہے ۔ تیسرا

ر TRIASSIC) یہ کسی خاص جگہ سے منسوب نہیں مگر اور تین ذیلی قرنوں
جن میں جرمنی میں بعض طبقات الارض پر تحقیقات ہوئی ان تینوں قرنوں
کو ملا کر ایک نام دیا گیا۔ اسی طرح ابتدائی دور حیات یعنی PALEOZOIC)
کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پہلے کا نام روس کی ایک قدیم سلطنت پرمیا
کی چٹانوں کی دریافتوں کے لحاظ سے ~~ان کی~~ پر مسبب
PERMIAN کا نام دیا گیا اسی طرح (DEVONIAN) انگلستان کے
علاقے ڈیون شائر سے منسوب ہے کیونکہ وہاں کے حجری آثار سے حیات
کی مختلف شکلوں کا حال معلوم کیا گیا۔ اسی طرح سلورین ایک قدیم
قوم کے نام پر ہے جو انگلستان اور ویلز میں بستی تھی اور سلورین کہلاتی
تھی۔ کیمبریا ویلز کا قدیم لاطینی نام ہے اور یہ زمانہ ویلز میں جو طبقات الارضی
تحقیقات ہوئی اس کے نام پر ہے

کتاب اوّل

مناہجِ تحقیق

کائنات کے متعلق ہمارا داخلی تصور۔ اس تصوری تمثال کی ماہیت
علت۔ تخیل۔ مشاہدے کا پیمانہ

انسان کو کائنات کا ادراک دو مختلف راہوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ بالآخر دونوں طریق سے ایک ہی نتیجہ حاصل ہو۔ پہلا راستہ وحی کا ہے۔ یہ راہ راست ہے لیکن انسانوں کی کثیر تعداد کے لئے یہ راستہ بند ہے اور عقلی دلائل سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ خوش نصیب ہے وہ گروہ جس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا راستہ کلیتاً علمی اور عقلی ہے۔ اس راستے پر چل کر جو ہدایت ہم کو حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم انسان کو کل یعنی کائنات کے عناصر میں سے ایک عنصر سمجھیں اور اسے خارجی دنیا کا ایک تفاعل* (FUNCTION) قرار دے کر اس کا مطالعہ کریں۔ یہ منہاج تحقیق اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم کائنات کی توضیح اس طرح کریں جس طرح انسانی دماغ اس کو محسوس کرتا ہے یا اس کا تصور

---

* تفاعل (FUNCTION) ریاضی کی ایک اصطلاح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے کائنات متغیر ہوتی ہے ویسے انسان بھی متغیر ہوتا رہتا ہے (مترجم)

اصطلاح

کرتا ہے۔ اگر یہ توضیح کافی بسیط ہوگی تو خود انسان کا اس میں ایک مقام ہوگا
اور اس طرح پر جو تصور قائم ہوگا اس کی مدد سے ہم اس قابل ہو جائیں گے
کہ انسان کا صحیح ماحول میں مطالعہ کر سکیں۔ بد نصیبی یہ ہے کہ ہمیں اس
حقیقت کو یاد رکھنا ہوگا کہ اس طرح پر جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ذہن
کی تعمیر کردہ ہوتی ہے اور نتیجتاً اس کا دارومدار دماغ کی ساخت پر، نظام
حواس پر جو خارجی دنیا سے ہمارا سابقہ قائم کرتا ہے، اور اس منطقی نظام
استدلال پر ہے۔ جو بلا واسطہ حسی مشاہدات کی توضیحات کی تہ میں ہے۔
چونکہ اس کا احتمال ہے کہ مندرجہ بالا نقاط سب ناظر کے لئے اجنبی
ہوں۔ اس لئے ان کی وضاحت ضروری ہے۔

خارجی دنیا یعنی فطرت کا علم ہم کو حسی قویٰ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔
ہم آنکھ کے ذریعہ جس کی ساخت فوٹوگرافی کے آلے سے ملتی جلتی ہے، ثوابت،
سورج، پہاڑ، جمادات اور انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ اشیاء کے منقلب عکس آنکھ
کے پیچھے پردہ شبکی (RETINA) پر پڑتے ہیں۔ پردہ شبکی بہت حساس خلیوں
پر مشتمل ہے جو عرفاً مخروط اور سلاخ (CANES&RODS) کہلاتے ہیں۔ ان عناصر کا
رد عمل بصری اعصاب کی وساطت سے دماغ کے خاص مرکز میں
منتقل ہوتا ہے۔ یہی رد عمل بصری نقوش کے موجب ہوتے ہیں۔ اسلئے چیزوں کو آنکھ
نہیں دیکھتی، دماغ دیکھتا ہے۔

علاوہ بریں یہ کہنا بھی درست نہیں کہ بصری نقش ہر حالت میں

خارجی حقیقت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض لوگوں کو رنگ
دوسرے لوگوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ رنگ دھیا یا رنگ اندھا
کہلاتے ہیں۔ جب ہم پھول کو سرخ یا کھیت کو ہرا کہتے ہیں تو ہم مشاہدہ
کرنے والوں کی ایک کثرت کے لئے ذہنی استثناء ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہی وہ
اکثریت ہے جسے ہم معیاری جماعت (NORMALITY) کہتے ہیں۔

فریبِ نظر کی بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ چھڑی کا کچھ حصہ پانی میں
ہو اور کچھ حصہ باہر تو چھڑی ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ متوازی خطوط کے
درمیان اگر لہر یا شکل کے خطوط آڑے پھیلا دیئے جائیں تو متوازی خطوط ایک
دوسرے سے ہٹتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ سفید شکلیں کالی شکلوں سے
بڑی معلوم ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ قوتِ لامسہ بھی ہر حالت میں قابلِ اعتبار
نہیں ہوتی۔ اگر ہم درمیانی انگلی کو انگشتِ شہادت پر چڑھا کر قینچی کی صورت
بنائیں اور ان کے نیچے گولی رکھ کر اس کو انگلیوں سے پھیریں تو ایسا
معلوم ہوتا ہے جیسے دو گولیاں ہوں۔ آلۂ سماعت بھی ایک ہی ردِ
عمل کو ہر شخص پر ہمیشہ ایک سا ظاہر نہیں کرتا۔ ماہرانِ موسیقی ایک
غلط سُر کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں اور ایسے نغموں سے لطف اندوز ہوتے
ہیں جو اکثر فن سے ناواقف لوگوں کو ذرا بھی خوش آہنگ نہیں معلوم
ہوتے۔ مختلف لوگوں کے ذائقے کے ردِ عمل کو جانچنے کا کوئی طریقہ نہیں(۱)

(۱) دیکھیے اگلا صفحہ

انتہا یہ ہے کہ ہم خواہ قطب شمالی پر ہوں یا قطب جنوبی پر یا خطِ استوا پر ہم سب یہ خیال کرتے ہیں کہ چلتے ہوئے ہمارا سر "اوپر"[2] کی طرف ہے۔ اور اب بھی بعض ایسے لوگ ہیں، جو یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ زمین گول ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں کا ماحصل یہ ہے کہ اشیاء کے بلاواسطہ اور سطحی مشاہدہ کرنے سے ہم ہمیشہ اس نتیجے کو اخذ کرنے کے مجاز نہیں کہ ان کی حقیقت بعینہٖ ایسی ہے جیسے ہمارے حواس بتا رہے ہیں۔ حواس کے بلاواسطہ تاثرات کی اصلاح کرنے اور ہمارے دماغوں میں ان اشیا کے متعلق جنہیں ہم خارجی دنیا کہتے ہیں ایسے تصورات قائم کرنے کے لئے جو ان کے مطابق ہوں استدلال اور تجربے کا دخل ضروری ہے۔ یہ خارجی یا معروضی دُنیا اپنی اس داخلی تصویر سے جو حواس کی اطلاعات پر دماغ میں بنتی ہے، مختلف ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اوپر یہ ذکر کیا تھا کہ ہمارے خارجی دُنیا کے تصوّر کا دارومدار حواسی نظام۔ اور دماغ کی

---

[1] چائے اور شراب بنانے والی کمپنیوں کے پاس ایسے ماہر ہوتے ہیں جو ذائقوں کے ذرا ذرا سے فرق کو بتا دیتے ہیں۔ (مترجم) [2] قطب شمالی کا "اوپر" قطب جنوبی کا "نیچے" ہے اور خطِ استوا کا "اوپر" قطب شمالی کے "اوپر" کے ساتھ زاویہ قائمہ بناتا ہے (مترجم)

ساخت پر ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ تصور ریاضیاتی (RELATIVE) ہے قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ جب ہم خارجی دُنیا کی توضیح کریں تو ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ہم منطقی نظام استدلال کا ذکر ابھی کر چکے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ یہ نظام استدلال معیاری (STANDARD) ہے۔ یا یہ کہ منطقی استدلال اور اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ ریاضیاتی استدلال حکمی اور ناگزیر طریقے پر حقیقت نما ہے۔

ہر حالت میں ایسا خیال کرنا درست نہیں۔ ہمیں انسانی قوتِ خیال کے متعلق چوکس رہنا چاہیئے کیونکہ اولاً تو اس وجہ سے کہ اس کی تحریک کسی حواسی مشاہدے سے ہوتی ہے (اور اس کی قدر مشکوک ہے) اور یہ نہیں تو کسی ایسے مشاہدے سے جو معمولی فہم و فراست (COMMON SENSE) پر مبنی ہوتا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ معمولی فہم و فراست پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ سوجھ بوجھ ہے جس کی بدولت ہم زمین کو چپٹی خیال کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ دو شاقولی خطوط متوازی ہیں حالانکہ وہ دونوں زمین کے مرکز پر جاکر ایک دوسرے سے ٹکرا باہم زاویہ بناتے ہیں۔ اور ہمارا یہ گمان تو قطعی غلط ہے کہ کوئی متحرک خطِ مستقیم میں حرکت کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہر حرکت

کو متعین کرنے کے لیے ہمیں زمین کی محوری اور سورج کے گرد مداری
حرکت ہی کو زیرِ غور نہیں لانا پڑتا۔ بلکہ خود پورے مدار کی حرکت۔ اور
پورے نظامِ شمسی کی وہ حرکت جو اسے ہرقلیس (HERCULESE)
برج کی طرف لیے جا رہی ہے، وغیرہ وغیرہ کو بھی محسوب کرنا ہوگا۔
اس طرح پر ایک بندوق کی گولی یا کوئی ہوائی جہاز جو بہ اضافتِ زمین
کچھ عرصہ کے لئے ایک خطِ مستقیم میں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے
ہیں اگر ان کو کسی بڑے نظام کی اضافت (SYSTEM OF REFERENCE)
سے جیسے کوئی قریبی ستاروں کا نظام ہے دیکھنا ممکن ہو تو وہ گولی
اور ہوائی جہاز ایک ایسے طریق (TRAJECTORY) پر حرکت کرتے
ہوئے دکھائی دینگے جس کی شکل ایک قسم کے کارک نکالنے والے پیچ
(CORKSCREW) سے ملتی جلتی ہوگی۔ ہم کی حس مشترک ہم کو بتاتی
ہے کہ استرے کے پھل کی دھار ایک علی الاتصال خطِ مستقیم ہے لیکن اسے
اگر خوردبین کی مدد سے دیکھیں تو ایک لہریا لکیر معلوم ہوگی جیسے کسی بچے
نے کھینچا ہو۔ معمولی فہم و فراست فولاد کو ٹھوس بتاتی ہے۔ ایکس شعاعیں
(X RAYS) اسے مسام دار ظاہر کرتی ہیں۔ اور مادے کی ساخت
کے متعلق جدید نظریے ہم کو یہ بتاتے ہیں کہ مادہ اصل میں کروڑوں بے انتہا
چھوٹے کائناتوں (MINIATURE UNIVERSES) سے مرکب ہے

کائنات مجموعہ

جو نہایت حیرت انگیز تیز رفتار سے حرکت کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ راستوں پر ہیں۔

اس لئے اگر استدلال کی ابتدا یا مقدمہ ہی غلط ہو تو لابدی اور منطقی طور پر جو نتیجہ حاصل ہوگا وہ بھی غلط ہوگا۔ یونانی ایسے استدلال کو سفسطانہ (SOPHISTIC) یعنی باطل استدلال سے موسوم کرتے تھے۔ سفسطانہ طریق استدلال کو منطقیانہ اور محکم طریق استدلال سے جو سائنس اور فلسفے میں بالاستقلال استعمال ہوتا ہے ممیز کرنا اکثر آسان نہیں ہوتا۔ منطقی استدلال صغریٰ اور کبریٰ قایم کرکے نتیجے اخذ کرنے کا نام ہے۔ (THE SYLLOGISM)

چونکہ فطرت کو سمجھنے اور اس کی توضیح کرنے کے لئے ہمارے پاس بجز حواس اور قوائے عقلی یعنی دماغی خلیوں (CELLS) کی اطلاعات کے اور کوئی ذریعہ نہیں اس لئے ہم کو بے حد چوکس رہنا چاہئے اور یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جو تصوّر فطرت کا ہم تعبیر کرتے ہیں وہ اضافی ہے اور یہ اضافیت فطرت کے متعلق اطلاعات کو قلمبند کرنے والے آلے یعنی انسان سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی حکمت (SCIENCE) مظاہر قدرت کے طبیعیاتی مطالعے پر مبنی ہوتی ہے۔ اس مطالعے سے جو اطلاعات ہم کو حاصل ہوتی ہیں

ہم ان کو ضابطوں کے ذریعے مربوط کرتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر ان کے
درمیان کبھی بلحاظ ماہیت اور کبھی بلحاظ کمیت ربط پیدا کرتے ہیں۔
لیکن مظاہر فطرت کی یہ صورت وہ ہے جو صرف ہمارے دماغ میں
وجود پذیر ہوتی ہے۔ ہر ایک کے لئے ایک خارجی معروضی علت ہوتی
ہے مگر ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس علت اور مظاہر کی اس صورت
میں جو ہمارے دماغوں پر مرتسم ہوتی ہے مطابقت کلی ہے۔

ہم نے لفظ "علت" کا استعمال کیا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے
ایک لفظ ہے جس کے متعلق ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ وہ اس کے مفہوم
سے واقف ہے۔ بایں ہمہ یہی لفظ بہت سے مسائل کو جنم دیتا ہے
سبب
اگر ہم علت کے تخیل کا معمولی فہم و فراست (COMMON SENSE)
عام
(جس کے متعلق ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اس کے اخذ کردہ نتائج سے
ہم کو چوکس رہنا چاہیئے) کے سادہ نقطہ نظر سے مطالعہ کریں تو یہ نہایت
ہی پیچیدہ ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی واضح منطقی تعریف کرنا
مشکل ہے۔ پہلی نظر میں تو ہر واقعے کے لئے ایک علت ہوتی ہے بلکہ اکثر
تو ایک سے زیادہ بھی۔ آیئے مثال کے طور پر توپ کے گولے پر غور کریں
کیا ہم گولا چھوٹنے کی ننھی سی تھیا دم ٹوپی (PERCUSSION CAP)
کو سمجھیں جس پر ضرب پڑنے سے گولا چھوٹا یا گولہ انداز کے ہاتھ کو جس نے

زنجیر کھینچی۔ یا بارود کی اتنی مقدار کو علت قرار دیں جو گولہ چلانے کے لئے ضروری ہے لیکن ہاتھ کی حرکت کے بغیر یہ بارود صدیوں ساکن پڑا رہتا۔ پھر یہی نہیں ہاتھ کی جگہ بھی کسی کل کا استعمال ممکن ہے اور تصادم ٹوپی کا دھماکہ کسی اور نہایت خفیف عمل سے ممکن ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مکھی کا پر بھی اگر ایک لمحے کے لئے کسی ہلکی سی روشنی کی کرن کی راہ میں حائل ہو جائے۔ ایسی روشنی کی کرن دوربین کے ذریعہ ثوابت میں سے کسی ایک ستارے میں سے لائی جا سکتی ہے اور اس میں اتنی قوت پیدا کر لینا ممکن ہے کہ وہ ایک ٹن وزن کے گولے کو تیس میل دور پھینک دے۔ ۱۹۳۳ء میں آرکٹیورس (ARCTURUS) ستارے سے ایک چالیس[1] سال پہلے کی چلی ہوئی روشنی کی کرن کے ذریعہ ایک بہت بڑے بجلی کے بٹن پر قابو رکھ کر شکاگو کی نمائش میں بجلی کی روشنی کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ توپ کے گولے سے جو تباہی آئے اس کی ذمہ داری ستارے پر ڈالنا مہمل بات ہوگی۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ ہلکی سی روشنی کی کرن جو ستارے سے مدتوں پہلے

---

[1] یہ ستارہ زمین سے اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی چالیس سال میں ہم تک پہونچتی ہے یعنی آج جو روشنی کی کرن ہم کو پہونچ رہی ہے وہ چالیس سال پیشتر وہاں سے نکلی تھی۔ یاد رہے کہ روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ (مترجم)

نکلی تھی گولا چلانے میں وہی اہم فریضہ ادا کرے گی جو بارود کرتا۔
پھر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جس کارخانے میں بارود بنا تھا
اس کے مزدور یا وہ علم کیمیا کے ماہر جنہوں نے بارود ایجاد کیا یا وہ
سرمایہ دار جنہوں نے کارخانہ تعمیر کرنے کے لئے سرمایہ بہم پہونچایا یا وہ
خود یا ان کے والدین یا آبا و اجداد اس تباہی کے موجب ہیں۔ یہ اہم
ذمہ داری کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہر ایک پر آتا ہے اور ہر اُس شخص پر آتا ہے
جس نے توپ کے بنانے میں حصّہ لیا۔ اور یوں یہ ذمہ داری بتدریج
کلیتاً غائب ہوئے بغیر گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ ابتدائے کائنات
تک ممتد ہو جاتی ہے۔

اس طرح خود بخود ہم علت اولیٰ تک جا پہنچتے ہیں اور مسئلہ غیر
محسوس طریقے پر مادی حدود سے نکل کر فلسفے اور مذہب کی سرحد میں
جا داخل ہوتا ہے۔ علل کی تلاش میں پڑیں تو ناممکن ہے کہ مادّی حدود
سے غیر مادی حدود میں جا نکلنے کو روکا جا سکے۔ کیونکہ نفسیاتی علل کا ذکر
ناگزیر ہے۔ یعنی ان محرکات کا ذکر جن کی بدولت توپ و تفنگ اور
بارود معرض وجود میں آئے اور گولے چلے۔ وہ محرکات نہ ہوتے تو
نہ گولا ہوتا اور نہ توپ نہ بارود نہ تصادم ٹوپی کا دھماکا نہ گولہ انداز اور
نہ ہی اس منظم کوشش کا تسلسل ہوتا جس کے پیشِ نظر گولا پھینکا جاتا

ضروری تھا۔

لہذا مادی نقطۂ نظر سے ہم مجبور ہیں کہ علّیت کو محض تقدم کا مترادف قرار دیں۔ ہر وہ مظہر فعل یا خیال جو کسی دوسرے مظہر سے ہمیشہ پہلے وقوع پذیر ہو اس کی علّت قرار دیا جاسکتا ہے۔ تجرباتی اعتبار سے علت کی حیثیت زمان میں توالی یا تسلسل کی ترتیب کے سوا اور کچھ نہیں مگر یہ اندازِ فکر کچھ تسلی بخش نہیں اور لفظ علت کی عام طور پر جو قدر تعریف کی جاتی ہے وہ اس سے غیر معمولی طور پر محدود ہو جاتی ہے۔ تخلیق سائنات کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی جب کبھی انسان کا معاملہ زیرِ غور آتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے ارادے اور مرضی کو ایک اثر آفریں علت تصوّر کیا جائے۔ لیکن خود یہ علّت بھی تو نتیجہ یا اختتام ہے ایک یا بہت سے ایسے غیر معمولی طور پر پیچیدہ سابق اسباب کے سلسلوں کا کہ اس کو علّت قرار دینے کی اہمیت ہی زائل ہو جاتی ہے۔ اگر ہم زمان کی لمبی قرنوں کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں تو یہ حقیقت اور بھی اجاگر ہوتی ہے۔ اگر ہم ان مظاہر فطرت پر غور کریں جو (بلحاظ ہمارے) نہایت درجے سُست رفتار سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ جن کا وجود ارضیاتی دوروں (GEOLOGICAL PERIODS) میں مکمل ہوا تو ہم ان کی کوئی ابتدائی اثر آفریں

علّت انسانی ارادے میں تلاش نہیں کرسکتے بشرطیکہ ہم سائنس کے حدود کے ورا جاکر مذہب میں نہ داخل ہوجائیں یہی وجہ ہے کہ مادّیین اثر آفرین علّت کے منکر ہیں اور کلیتاً بخت واتفاق (CHANCE) کا سہارا لیتے ہیں۔ آگے چل کر ہم پر واضح ہو جائے گا کہ یہ مفروضہ (HYPOTHESIS) اطمینان بخش نہیں اور اس کو تسلیم کرلینے سے ہم کو منافی نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر آج تک اس حقیقت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اچٹتی ہوئی نگاہ بعض ایسے مسائل پر ڈالی ہے جو معروضی یا خارجی دنیا اور انسانی دماغ کے باہمی رابطوں سے بحث کرتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ ان روابط سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے احساسات اور تخیلات کی علّت اور خود خیالات کے درمیان ہیں۔ ایسی صورت میں تقدم کی حد کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر کسی ایسے واقعے کے سبب کو تلاش کیا جائے جس سے کوئی انسانی سرگرمی عمل پذیر ہوئی ہو تو عموماً یہ سعی کسی نفسیاتی حالت پر مبنی ہوتی ہے یعنی جہاں تک کہ ہم واقعی اندازہ لگا سکتے ہیں یہ حالت غیر مادی ہوگی۔ ٹھیٹھ مادّہ پرست کے نزدیک تو نفسیاتی مظہر کی بنیاد بدیہی طور پر مادی ہی ہوگی کیونکہ اس کا ظہور انسانی دماغ کی

خلیوں (CELLS) کے عمل سے رونما ہوا ہے۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ سائنس کی موجودہ معلومات کی بنا پر اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی ایک ہی خیال یا جذبے ~~(جذبہ)~~ نے ہمارے ارادے کے کسی فعل کو وجود میں لانے کیلئے جو کام (WORK)[1] کیا ہے اس میں جو توانائی کی اکائیاں (UNITS OF ENERGY) صرف ہوئی ہیں ان کو محسوب کرسکیں تو صرف یہی نہیں کہ ایسا کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ ہمارے لئے تو ان کی کیفیت کے تخیل پر دسترس حاصل کرنا بھی شاید کبھی ممکن نہ ہوگا۔ ہمارے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ دو فیصلوں میں سے کسی ایک فیصلے کو اختیار کرنے کی علت کا ہم ادراک کرسکیں۔ پھر یہ فیصلے بھی کیسے ایک تعمیری اور دوسرا تخریبی۔ ایک خیر محض اور دوسرا شر محض۔ اب انسانی نقطۂ نظر سے یہی وہ امر ہے جو وقیع ہے۔ بعض ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنے فوائد۔ اپنی صحتوں اپنی جانوں کو ہمیشہ خطرے میں ڈال کر ایسے عمل کا انتخاب کرکے تکمیل کو پہنچاتے ہیں جو کار خیر ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی فوری بھلائی کی خاطر یا اپنی خواہشات نفسانی کے زیر اثر بدکرداری کا راستہ اختیار کرتے ہیں فرض کیجئے کہ جو توانائی (ENERGY) ان کے خیالات میں صرف

---

[1] کام (WORK) ریاضی کی اصطلاح ہے۔ اور کام = قوت × فاصلہ (مترجم)

۲۵ = ۵۵۵

ں ہوتی ہے اس کی کیت کو کسی دن محسوب کرنا بھی ممکن ہو جائے تو بھی ہمارے
ا ر علم میں کچھ اضافہ نہ ہوگا کیونکہ شاید ہی یہ ممکن ہو کہ ہم "ہاں" اور "ناں" کے
الفاظ میں جو توانائی خرچ ہوتی ہے اس کا کوئی بین مادی فرق معلوم
کر سکیں۔

اگر یہ فرق معلوم بھی ہو جائے تو یہ سوال تو پھر بھی باقی رہے گا کہ
وہ کیا سبب تھا جو "ہاں" یا "ناں" کہنے کا محرک ہوا۔ اس مضمون کو ختم کرنے
سے پہلے ہم خاص طور پر اس استنباط کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے
ہیں جو صفحات (۱۰، ۱۱) کی بعض مثالوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہمارے بعض
ذہنی فریب تو اس امر کی بدولت پیدا ہوتے ہیں کہ ہم جب کسی مظہر فطرت
کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اسے روز مرہ کی زندگی کے چوکھٹے میں رکھ کر
اس پر غور کرتے ہیں۔ مثلاً یہ اضافت ارض خط مستقیم میں حرکت ایک
حقیقت ہے لیکن یہ اضافت کائنات یہ نتیجہ باطل ہے۔ اس بات کا اطلاق
صرف حواس کی فریب کاریوں پر ہی نہیں اس کا اطلاق انسان کے
جملہ مشاہدات پر ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بلحاظ کسی منتخب کردہ نظام حوالگی
(SYSTEM OF REFERENCE) کے ہوتے ہیں۔ نظام حوالگی سے ہماری
مراد صرف پیمانہ مشاہدہ سے ہے۔ یہ توضیح طلب ہے۔

فرض کیجیے کہ ہمارے پاس دو سفوف ہیں۔ ایک سفید (مثلاً آٹا)

اور دوسرا کالا (مثلاً باریک پسا ہوا کوئلہ یا کاکلک) اگر ہم ان دونوں کی آمیزش کریں تو مرکب بھورے رنگ کا سفوف ہوگا۔ جس میں اگر آٹے کا سفوف مقابلتاً زیادہ ہے تو رنگ ہلکا ہوگا اور اگر کاکلک کا سفوف زیادہ ہے تو رنگ گہرا ہوگا۔ یہ مرکب اگر بالکل برابر مقدار کے سفوفوں سے بنا ہے تو ہمارے مشاہدے کے پیمانے سے یعنی خورد بین کی مدد کے بغیر معائنہ کرنے سے تو زیر مطالعہ مظہر ہمیشہ ایک بھورے رنگ کا سفوف ہوگا۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایک کرم جس کی جسامت آٹے یا کاکلک کے ذرات کے برابر ہے اس مرکب میں گھوم پھر رہا ہے تو اس کو کوئی بھورا مرکب دکھائی نہ دے گا۔ بلکہ اسے ہر قدم پر سفید یا کالی گول چٹانیں ہی نظر آئیں گی۔ اس کے مشاہدے کے پیمانے پر "بھورے سفوف" کا مظہر کوئی وجود نہیں رکھتا۔

یہی بات چھاپے کی تصویر یا کندہ نقش کے لئے بھی درست ہے۔ اگر ہم مکبر شیشے کے ذریعہ جارج واشنگٹن کی تصویر کا معائنہ کریں تو ناک ایسی معلوم ہوگی جیسے سفید اور کالے نقطوں کا ایک تار ہو۔ خورد بین کے نیچے اسی کو رکھ کر دیکھیں تو ہمیں کاغذ کے ترکیبی ذرات کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ جن کا رنگ اگر تصویر روشنائی کے ذریعہ نمایاں کی گئی ہے تو بھورا یا کالا ہوگا ورنہ سفید۔ اصلی مظہر یا نقش یعنی واشنگٹن کی تصویر

کا وجود باقی نہ ہوگا۔ اس کا اُسی وقت تک تھا جب تک مشاہدے کا پیمانہ ہمارے معمول انسانی پیمانے کے مطابق تھا۔

بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے نقطۂ نظر سے یہ مشاہدے کا پیمانہ ہی ہے جو کسی مظہر فطرت کی تخلیق کرتا ہے۔ جب بھی ہم مشاہدے کے پیمانے کو بدلتے ہیں، ہم کو نئے مظہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

انسانی مشاہدے کے پیمانے کے مطابق جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے استرے کے پھل کی دھار ایک ہموار خط ہے۔ خوردبین کے پیمانے کے مطابق وہ ٹوٹی پھوٹی مگر مجسم لکیر ہے۔ کیمیائی پیمانے پر لوہے اور کاربن کے جوہر (ATOMS) ہیں۔ تحت جوہری (SUB-ATOMIC) پیمانے پر برقیئے (ELECTRONS) ہیں جن میں استمراری حرکت ہے اور جو کئی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے گردش کر رہے ہیں۔ یہ جملہ مظاہر حقیقت میں اسی اساسی مظہر یعنی برقیوں کی حرکت کا تماشا ہیں۔ ان میں جو فرق ہے وہ صرف مشاہدے کے پیمانے کی بدولت ہے۔

اس بنیادی حقیقت کی طرف سب سے پہلے سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے علم طبیعیات کے ماہر پروفیسر چارلس یوجین گوائے (متوفی ۱۹۴۲ء) نے توجہ دلائی۔ اسکی بدولت ہم بہت سی چیزوں کو سمجھنے اور بہت سنگین مغالطوں سے بچنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کے دوران میں ہم کئی بار اس حقیقت کی طرف رجوع کرینگے کیونکہ بعض نمایاں تضادوں کی توضیح کرنے کیلئے ہم اکثر مشاہدے کے پیمانے کا ذکر کرینگے۔

۲

علمی (SCIENTIFIC) طرز تحلیل ۔ علم (SCIENCE) کی غایت ۔ علمی ضابطے ۔ سائنس کا عدم تسلسل اور عدم مقلوبیت تحلیل ۔ انسان کے بنائے ہوئے خانے (COMPARTMENTS) علمی ضابطوں کی تعبیر ۔ احتمال (PROBABILITY)

اب جبکہ ناظر کو بعض ان مغالطوں سے آگاہ کردیا گیا ہے جن کا منبع انسانی دماغ ہے تو ہم ان مناہج تحقیق کا جائزہ لے سکتے ہیں جن کو انسانی دماغ کائنات کی توضیح کرنے اور مستقبل میں ہونے والے وقوعوں کی پیش بینی کے لئے کام میں لاتا ہے ۔ یہ جائزہ ناگزیر ہے کیونکہ ہمیں توقع ہے کہ ہم اپنے دلائل کو علمی مناہج تحقیق اور ریاضیاتی طریق استدلال پر استوار کرکے یہ ثابت کرسکیں گے کہ حیات انسانی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ دونوں طریق ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم کسی برتر اور ورائے ارضی طاقت کے عمل دخل کو تسلیم کریں ۔

انسان جس کے مقدر کے تعین میں ہم کو دلچسپی ہے بے پایاں موجودات کا ایک جز ہے اور جملہ حیوانات میں وہی اس قابل ہے کہ وہ فطرت کا مشاہدہ کرے ۔ تجربات کرے اور واقعات کے مابین روابط اور ضابطے قائم کرے ۔

وہ بیک وقت تجربے کا موضوع بھی ہے اور مشاہد بھی۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں
کہ ان ضابطوں کا علم جو ذی حیات ہستیوں میں کارفرما ہیں کرۂ ارض پر
انسان کے وجود کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے یعنی ان رشتوں کو
جو اسے دیگر ذی حیات پیکروں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور اسکے
امتیازی خصوصیات کو اُجاگر کر سکتے ہیں تو ہمیں جملہ کائنات کا ابتدائے
آفرینش سے ارتقائی مطالعہ کرنا چاہیئے ہاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا
چاہیئے کہ ہمارے مشاہدے کا آلہ ہمارے مشاہدات میں کجی اور التباس بھی پیدا کر سکتا ہے۔

ایسا ہی جب ہم کسی اجنبی ملک میں وارد ہوتے ہیں اور چاہتے
ہیں کہ اس کی اقتصادی۔ معاشرتی اور ذہنی زندگی کا مطالعہ کریں تو
ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم اس کے مادی وسائل۔ صنعت و حرفت
روایات۔ عالی حوصلگی کا جائزہ لیں۔ اس کی تجارتی۔ علمی اور فنی حاصلات
کو جانچیں اور اس کے نظام تعلیم اور مذہب پر غور کریں۔ اس غایت کی
تکمیل کے لئے ہم کو موٹے موٹے واقعات اور چھوٹے چھوٹے جذبات پر
بھی غور کرنا ہوگا اور مادی واقعات اور اخلاقی اسباب پر بھی توجہ دینی ہوگی
اگر ہم ایسا کرنے سے قاصر رہے تو بیان نامکمل اور ناموزوں ہوگا۔

ناظرین کو اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا چاہیئے کہ مادیین اور
نام نہاد آزاد خیال فلسفی (جو کافی حیرت کی بات ہے کہ آزاد قوت ارادی

یا اختیار کو تسلیم نہیں کرتے) ہمیشہ یہ دعوے کرتے ہیں کہ انکیلئے وہی عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں اور اپنے عقائد کی بنیاد علم پر استوار کرتے ہیں۔ اب یا تو ہم انکے دعاوی کو بغیر جائزہ لئے تسلیم کرلیں یا پھر انکو بحث کیلئے للکاریں۔ اگر ہم مبارزت طلبی اختیار کرتے ہیں تو ہم مجبور ہیں کہ علم کی زیریں بنیادوں کی تہہ تک رسائی حاصل کریں اور اپنے یقین کو مضبوط اساس پر قایم کریں۔ ایسا کرنے میں مادیین کی دلائل کی کمزوری کو ہم افشا کردیں گے لیکن اس کے لئے نہ صرف علمی حاصلات کا ہی تفصیلی تجزیہ کرنا ہوگا بلکہ علمی طریق تخیل کا بھی۔ موجودہ باب میں یہی مقصد ہمارے پیش نظر ہے۔

علم کا نصب العین پیش بینی ہے اور حقیقت کو پالینا نہیں جیسا کہ اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے۔ سائنس واقعات اشیاء اور مظاہر کے تفصیلی جائزے کو پیش کرتی ہے۔ اور ان کے ان باہمی روابط کو تلاش کرتی ہے جن کو ہم ضابطے کہتے ہیں تاکہ مستقبل کے واقعات کے متعلق پیش گوئی کی جاسکے۔ مثلاً اجرام سماوی کی حرکات کا مطالعہ کرنے کے بعد علم ہیئت ایسے ضابطے قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے جن کے ذریعہ ان اجرام کے مقامات بہ اضافت ارض ایک لامحدود مستقبل تک محسوب کرنے کے ہم قابل ہیں۔ ایک حیرت انگیز مشین یعنی سیاروں کے نظام کا ایک ڈھانچہ (PLANETARIUM) بنا لیا گیا ہے جو سیاروں کی حرکات کو دکھلاتا ہے اور سمائے شب کے

ماضی اور مستقبل کو ایک چھت کے گنبد پر تحلیل کرتا ہے۔

اسی طرح طبیعات اور کیمیا ٹھوس۔ سیال اور گیس جیسے اجسام کے سالموں اور جوہروں کے اتصال وغیرہ کے دنیروں کو بیان کرتے ہیں اور ان سے ایسے ضابطے قائم کرتے ہیں جو جہالت کے تحیر کو علم کے تیقن میں بدل دیتے ہیں۔

لیکن ہمیں انسان کے ان موضوعی ضابطوں کو جنہیں اسکی ذہانت نے جنم دے کر واقعات پر عاید کردیا ہے ان حقیقی اور ابدی ضابطوں کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کردینا چاہیئے جو کہ شاید ابدالآباد تک ہماری دسترس سے باہر رہیں گے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں ہمارے ضابطے ہمارے دماغ کی ساخت اور حواس کے اعضاء پر منحصر ہیں اور شعور کے احوال اور حواس کے نقوش کے تسلسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ تسلسل خارجی حقیقت کے بالکل مطابق ہو۔ اور حقیقی ضابطے ان ضابطوں سے مختلف نہ ہوں جو ہم نے قایم کئے ہیں لیکن ہم یہ ثابت نہیں کرسکتے۔ فطرت کی حسنِ ترتیب اور ایک سے محرکات کا سب انسانوں پر یکساں ردِعمل پر جو ہم کو پختہ یقین ہے یہ ضابطے تو صرف اسی کا اظہار کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم ان ضابطوں کا مندرجہ ذیل طریق پر بیان کرسکتے ہیں۔

جب ہم تجربتاً یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض واضح حالات کے عقب میں ہمیشہ کچھ معین مظاہر ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جو یکساں طور پر اول الذکر حالات کے ساتھ علت اور معلول کے رشتہ سے پیوست ہوتے ہیں۔ تو ہم اس مشاہدے کو ایسے الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں جن کی مدد سے جب کبھی ویسے حالات موجود ہوں تو ہم پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ وہی مظاہر کمیتاً یا کیفیتاً رونما ہوں گے۔

مثلاً جب کبھی کوئی پتھر یا کوئی اور ٹھوس چیز خلا میں سے زمین کی سطح پر گرتی ہے تو وہ ہمیشہ پہلے ثانیہ میں ایک ہی فاصلہ طے کرے گی خواہ اس کا وزن کتنا ہی ہو۔ یہ اوپر سے زمین کی سطح پر گرنے والی اشیاء کا ضابطہ کہلاتا ہے۔ جب کبھی کسی گیس کو اتنا دبایا جائے کہ اس کا حجم دب کر پہلے حجم کا نصف ہو جائے تو بائل میریٹ (BOYLE) (MARIOTTE) کا ضابطہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ گیس کا دباؤ دگنا یا تقریباً دگنا ہو جائے گا۔

علمی ضابطے ہمیشہ استقرائی ہوتے ہیں یعنی ان میں معلول سے علت کی طرف استدلال ہوتا ہے۔ وہ واقعات کے تابع ہوتے ہیں اور ان سے انحراف ممکن نہیں۔ ان ضابطوں کی اضافیت انسان کے ساتھ ہے جو غور کرتا ہے اور ان کو ضبط تحریر میں لانے کا آلہ ہے اور وہ صرف

صرف اس ربط یا سلسلۂ روابط کا اظہار کرتے ہیں جو انسان اور خارجی
علل کے مابین ہوتا ہے۔ علل جو نفسیاتی احوال کا تواتر پیدا کرتے ہیں
یہ ضابطے انہیں کو بیان کرتے ہیں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر اضافی
اور داخلی ہوتے ہیں اور ان کا جواز قطعی طور پر انسان تک محدود رہے
اور اس بات پر منحصر ہے کہ ایک سے خارجی محرکات اور افراد پر بھی
یکساں ردِعمل پیدا کرتے ہیں۔

لہذا یہ بیّن ہے کہ ایسے جملوں کا جیسے 'علمی حقیقت'
(SCIENTIPIC TRUTH) بہت ہی محدود مفہوم لینا چاہیئے اور
جیسا کہ عوام اکثر کرتے ہیں ان کو کلیتاً سچ مچ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ مطلق
مفہوم کے اعتبار سے کوئی "علمی حقیقت" حقیقت نہیں۔ یہ جملہ" سائنس
سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے" (AD VERITATEM PER
SCIENTIUM) ایک مہمل جملہ ہے۔ ہمارے تجربے میں تو صرف
احساسات کے چند اصناف آتے ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے عقب
میں ایک ہی ترتیب سے ظاہر ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ہم گمان
کرتے ہیں کہ ایک محدود مستقبل تک وہ اسی یکسانیت کے ساتھ آئیں گے
ہماری 'علمی حقیقت' کی اصلیت فقط اتنی ہی ہے۔ جب تک ہم کو یہ نہ
معلوم ہو جائے کہ طبیعی کیمیادی مظہر اور ان مظاہر میں جو "حیات" سے متعلق

ہیں اور ان نفسیاتی کیفیتوں میں جو رونما ہوتی ہے کیا باہم روابط ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہم پوری اہمیت سے واقف ہیں۔

یہ آخری جملہ شاید کچھ غیر واضح معلوم ہو اس لئے مصنف پھر ناظر سے درخواست کرتا ہے کہ وہ دلچسپی کے ساتھ غور کرنے کی سعی کرے۔ انسان جو خارجی اطلاعات کو وصول کرنے منضبط اور مرتب کرنے کا ایک آلہ ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو ان مظاہر کا جن پر اس کا علم مشتمل ہے اسکی ذات سے الگ بحیثیت مظاہر کوئی وجود نہیں۔ کائنات میں تمام اقسام اور جسامت کی شعاعوں کی موجیں موجود ہیں ان میں سے قلیل تعداد ایسی موجوں کی ہے جن کو ہمارے حواس روشنی۔ گرمی اور آواز وغیرہ میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جوہر اور سالمے (یعنی مادہ) موجود ہیں جو ہمارے اعصاب کے سروں سے مس کرتے ہیں تو ہمارے دماغوں میں وہ احساسات پیدا کرتے ہیں جنکو ہم کیفیات (QUALITIES) کہتے ہیں جیسے سختی۔ نرمی۔ ذائقہ اور بو وغیرہ جن کا خارجی اشیا میں کوئی وجود نہیں اور جو ہمارے اعصابی نظام اور فطرت کے باہمی ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ اگر انسان کا بیچ حذف کر دیا جائے تو ہمارے احساسات کے علل تو موجود ہیں لیکن احساسات کے ساتھ کسی قسم کی یگانگت ان میں نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ریڈیو کے وصول کرنے والے آلات

حذف کر دیئے جائیں مگر ریڈیو کی شعاعوں کے جاری کرنے والی مشینیں بدستور باقی ہوں تو نہایت شیریں نغمے فضا میں جاری رہیں گے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ خاموش لہریں ہمارے چاروں طرف موجزن ہونگی مگر ہم کو علم نہ ہوگا۔ ضرورت ایک ایسے پیچیدہ آلے کی ہوگی جو ان برقی مقناطیسی موجوں کا پتہ لگا کر ان کے طول کو بدل کر ان کو آواز کی موجوں میں تبدیل کرے تاکہ ہوا ان کو اپنے کندھوں پر لے کر چاردانگ عالم میں نشر کر دے۔ علّت اپنے معلول سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔

یہی بات فطرت کے متعلق بھی درست ہے۔ انسان فطرت کے پیغامات وصول کرنے والا آلہ ہے اور اشیاء کے خواص کو ان خواص میں تبدیل کر دیتا ہے جو ہمارے مشاہدے کے پیمانے پر ہم کو محسوس ہوں یہ احساس خواہ ہم کو بلا واسطہ حاصل ہو یا بالواسطہ ان اوزاروں کے ذریعہ جو دماغ کی حسن تدبیر کی بدولت معرض وجود میں آئے ہیں۔ مظاہر جن کی یوں قلب ماہیت ہوتی ہے یا یوں سمجھئے کہ انسانی صفات سے متصف ہو جاتے ہیں ہمارے علم کے موضوعات بنتے ہیں۔ اس لئے یہ علم کلیتًا بشری ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مظاہر فطرت جن کے متعلق ہم تحقیق و تفحص کرتے ہیں وہ سب نہیں تو ان کی بہت بڑی اکثریت مشاہد یعنی انسان اور معروضی مظاہر کے مجموعے کا نتیجہ ہے۔ اور فلسفیانہ نتائج

کے پیشِ نظر جو ہم علمی تجربوں اور نظریوں سے اخذ کرنے کے مجاز ہیں مندرجہ بالا توضیح بہت وسیع اہمیت رکھتی ہے۔

یہ ہم نے جو اوپر کہا تھا کہ کسی مظہرِ فطرت کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کے لئے اس کے معروضی (خارجی) علت کا جان لینا ہی کافی نہیں بلکہ یہ جاننا بھی لازمی ہے کہ جو داخلی۔ حیاتیاتی اور نفسیاتی مظاہر اس علت کی بدولت سامنے آتے ہیں ان میں اور علت میں کیا روابط ہیں۔

مندرجۂ بالا تصریحات سے ایک حد تک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم میں تسلسل نہیں۔ بلا شک وشبہ علم ابھی علیحدہ خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہم ایک مثال لے کر اس کو واضح کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی صاحب بصیرت مثلاً ان ضابطوں کی تحقیق کرنا چاہتا ہے جو انسانی معاشروں میں کارفرما ہیں اور دُنیا کے تمام ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ شاید یہ زیادہ مفید ہوگا کہ سب معاشروں کے قدر مشترک یعنی انسان پر پہلے غور کیا جائے۔ یقیناً یہ تسلیم کر لینا بالکل معقول ہوگا کہ جو ضوابط انسانی معاشروں میں عمل پیرا ہیں وہ فرد انسانی کی صفات اور نمایاں خصوصیات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا وہ مشاہد فرد انسانی کی تحقیق شروع کر دیتا ہے اور یوں بغیر جانے بوجھے وہ ایک ایسے چوکھٹ کے پار ہو جاتا ہے جس کو اُلٹے پاؤں واپس آنے پر پار کرنا

ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ نفسیات اجتماع کو افراد کی نفسیات سے اخذ کرنا ممکن نہیں۔

یا پھر چونکہ وہ علم کی وحدت پر یقین رکھتا ہے یعنی اس امر کا کہ کائنات کے جملہ مظاہر باہم مربوط ہیں اور سادہ مظاہر کی مکمل تفہیمات زیادہ پیچیدہ مظاہر کی طرف خود بخود رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ انسانی جسم کے متعلق اس کی عدم واقفیت ایک سنگین رکاوٹ ہے اور طے کرتا ہے کہ انسانی رویئے کے اسباب تو انسانی تشریح الابدان (ANATOMY) اور عضویات (PHYSIOLOGY) کے مطالعے ہی میں تلاش کرنے ضروری ہیں۔ یوں وہ پھر غیر محسوس طور پر ایک دوسری چوکھٹ کو پار کرتا ہے جس سے پہلے کی طرح رجعت ناممکن ہے۔ عضویات قدرتاً اس کی رہنمائی حیاتیاتی کیمیا کی طرف کر دیتا ہے۔ یہ تیسری رجعت کی قاطع چوکھٹ ہے۔ حیاتیاتی کیمیا کے بعض جزئیات سمجھنے کے لئے وہ مجبوراً غیر نامی علم کیمیا کی طرف رجوع کرتا ہے جو حیاتیاتی کیمیا کی لازمی اساس ہے۔ اس طرح وہ اتنی ہی آسانی سے اس دہلیز کو بھی عبور کر لیتا ہے جیسا کہ اوروں کو اپنی اصول پسندی کو قائم رکھتے ہوئے وہ نہ صرف سالموں (MOLECULES) میں دلچسپی لینے لگتا ہے بلکہ جوہروں (ATOMS) میں بھی جن سے سالمے بنتے

ہیں اور یوں بے ساختہ پن سے ان کے تعمیری جسمیوں کے عناصر (CONSTITUITIVE CORPUSCULAR ELEMENTS) برقیوں، برکزیوں (PROTONS) وغیرہ تک جا پہونچتا ہے۔ یہ آخری دہلیز ہے۔ جب وہ اس حد تک پہونچ جاتا ہے تو اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ مقلوب طریق کو کام میں لاکر اُلٹے پاؤں ان مسائل تک پہونچ سکے جہاں سے وہ چلا تھا۔

وہ اپنے قدموں کے نقش پر واپس یوں نہیں جا سکتا کہ ہمارے مشاہدے کے پیمانے (یعنی ہمارے اعصابی نظام پر جوہروں کے ردِعمل کا اثر) کے مطابق جوہروں کے خواص کا ان کی برقیاتی ترکیب کے ساتھ اب تک کوئی علاقہ پیدا نہیں کیا جا سکا۔ پھر جوہروں کے خواص اور سالموں کے خواص میں کوئی ربط پیدا نہیں کیا جا سکا۔ سوڈیم (SODIUM) ایک دھات ہے۔ کلورین (CHLORINE) ایک زہرآلود گیس ہے اور دونوں کے اتصال سے جو مرکب بنتا ہے وہ سوڈیم کلورائڈ یعنی کھانوں میں پڑنے والا بے ضرر نمک ہے۔ جن جوہروں سے مل کر یہ مرکب بنا ہے ان کے خواص کو سامنے رکھ کر ہم نمک کے خواص کی پیش بینی کے قابل نہیں۔ اُلٹے پاؤں اپنے قدموں کے نشان پر جانا یوں ناممکن ہے کہ حیات کے خواص اور بے جان مادے

کے خواص میں کوئی واسطہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسان کے خیال اور نفسیات کو زندہ مادّہ کے طبعی۔ کیمیائی اور حیاتیاتی خواص سے اخذ کرنا ناممکن ہے۔ بہ الفاظ دیگر جب عالم (SCIENTIST) مشاہدے کے کسی ایک پیمانے سے کسی دوسرے پیمانے کی طرف جاتا ہے تو اسکے سامنے بالکل نئے مظاہر فطرت آتے ہیں اور اپنے مقصد سے وہ دور سے دور تر ہوتا جاتا ہے۔

ہمارے مثالی مشاہد نے صحیح منہاج تحقیق شروع کیا یعنی تحلیل (ANALYSIS) اس مثال نے اس منہاج طریق کی معذوریوں کو نمایاں کر دیا ہے کہ جتنا بھی انسان تحلیل میں عمق پیدا کرے اتنا ہی وہ اصلی مسئلے کے حل سے دور ہوتا جاتا ہے جس کو حل کرنے کا اس نے قصد کیا تھا۔ وہ مسئلہ اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے اور تحقیقات سے جو مظاہر اس کے سامنے آتے جاتے ہیں ان کی مدد سے وہ اس مسئلے کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ منطقی طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ ان مظاہر کے درمیان کوئی علاقہ ہونا چاہئے۔

اس سے چارلس یوجین گائے (CHARLES-EUGENE GUYE) کے بیان کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ "یہ مشاہدہ کا پیمانہ ہی ہے جو مظاہر فطرت کی تخلیق کرتا ہے"۔ مشاہدہ کے پیمانہ کا دارومدار انسان

پر ہے۔ وہی پیمانے کا خالق ہے۔ فطرت میں خود مختلف پیمانہائے مشاہدہ
کا کوئی وجود نہیں۔ فطرت خود تو ایک بے پایاں ہم آہنگ اور مربوط
مظہر ہے کسی ایسے پیمانے پر جو انسان کے دماغ کی ساخت کی بدولت
کلیتاً اس کے قابو سے باہر ہی رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ساخت ایسی ہے کہ وہ
فطرت کو من مانے خانوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس کے جدا جدا ٹکڑے
کر کے اس پر غور کرتا ہے۔

پھر بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ فی زمانہ ایک اور سنگین سدِ راہ
ہے جو نظری علم کو فلسفہ کا ایک کامیاب اوزار نہیں بننے دیتی۔ ممکن
ہے یہ رکاوٹ عارضی ہو۔ توقع ہو سکتی ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ سدِ راہ
اٹھ جائے لیکن آج ہم اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ مختصراً مندرجہ
ذیل طریق پر اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ جوہر کی تعمیر تحت جوہری ذرات یعنی
مرکزیوں (PROTONS) برقیوں (ELECTRONS) اور معتدلوں
(NEUTRONS) سے ہوتی ہے۔ لیکن جوہر کی دنیا اور برقیوں کی
دنیا کے درمیان آج ایک ناقابلِ عبور غار حائل ہے۔ وہ ضابطے جو
برقیوں کے حرکات اور وتیرے (BEHAVIOUR) کو واضح کرتے
ہیں وہ اور ہیں اور جو جوہروں میں کارفرما ہیں وہ اور۔ بہ الفاظِ دیگر

مادی جوہر اپنی پیدائش پر کائنات میں نئے ضابطے لے کر آتے ہیں۔ ایسے ضابطے جن کی امتیازی خصوصیت ہے عدم تقلیبی (IRREVERSIBILITY) ہے۔ اور اس امتیاز کا برقیوں کی دنیا میں وجود نہیں پایا جاتا۔ مادی مظاہر (ہمارے مشاہدے کے مطابق) صرف ایک ہی سمت میں واقع ہوتے ہیں۔ مخالف سمت میں کبھی نہیں۔ اس کے برعکس برقی مظاہر میں یہ عدم تقلیبی نہیں پائی جاتی۔ موجودہ علم طبیعات کے مطابق اس میں تقلیب ممکن ہے۔

بدیہی وجوہات کی بنا پر اب ہم اس اساسی اہم مسئلے پر زیادہ بحث نہیں کریں گے۔ چونکہ ناظر کے لئے اس بات کو ذہن میں رکھنا نہایت اہم ہے اس لیئے ابتداء کار ہی میں اتنا جتا دینا چاہتے تھے کہ کائنات کی ارتقائی تاریخ کے تسلسل میں بے قاعدگی ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب ہم پہلے تحقیقات حیات میں اور پھر خود انسان کے متعلق تحقیق میں اسی قسم کی خلا دکھائیں گے تو وہ ان کو قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے گا۔

ہم نے گزشتہ اوراق میں دیکھا ہے کہ علم کا مقصود آنے والے واقعات کے متعلق پیش گوئی کرنا ہے اور یہ پیش بینی واقعات کے تواتر کی باقاعدہ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جب کسی تواتر کی ترتیب مستقل بنیاد پر

قایم ہو جاتی ہے اور اتنی عمومی ہوتی ہے کہ اس میں استثنا کی گنجائش نہیں ہوتی (جیسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) تو اس تواتر کو ایک متفقہ رسمی زبان یعنی ریاضیات کے مختصر علامات میں ظاہر کر دیا جاتا ہے اور یہ ضابطہ بن جاتا ہے۔

اگرچہ ایسا ضابطہ دیکھ کر ہم کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جس مظہر کو وہ بیان کرتا ہے ہم اس کے پورے نظام ترکیب کو سمجھتے ہیں تاہم یہ ہے ایک فریب ہی لیکن اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسان کا اولین مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ وہ خیال کرنا چاہتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اور وہ اس اعتقاد سے مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔ ہر ماہر برقیات (ELECTRICIAN) اپنے خیال میں یہ سمجھتا ہے کہ برقی بیٹری (دھاتوں کا تیزابی سلسلہ) کیسے چالو ہوتا ہے لیکن کوئی ممتاز ماہر طبیعات اس کی اس رائے سے متفق نہیں ہوگا اور وہ تسلیم کرے گا کہ باوجود اس کے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیشین گوئی کر سکتا ہے کہ بیٹری کیسے عمل کرے گی۔ وہ اب تک پوری طرح یہ نہیں سمجھا کہ وہ کیوں اس طرح پر عمل کرتی ہے۔

علم کس طرح پیشین گوئی کرنے اور اپنے ضابطے بنانے میں کامیاب ہوتا ہے؟

آج کل جو طریقہ تحقیق عمومی طور پر مستعمل ہے وہ شماریات

(STATISTICS) کا طریق تحقیق ہے۔ یعنی وہ منہاج تحقیق جس کی بنیاد موثر مفردات کی بہت بڑی تعداد پر ہوتی ہے مشاہدہ کے کسی پیمانے پر نتیجہ کی صحت زیر غور مفردات کی تعداد پر منحصر ہوگی آئیے ایک مثال سے اس کو واضح کریں۔

ہر شخص اس امر سے واقف ہے کہ زندگی یا آگ کا بیمہ کرنے والی کمپنیوں کا دارو مدار ان شماریات پر ہوتا ہے کہ سال میں اوسطاً کتنے آدمی مرتے ہیں یا کتنے گھر جلتے ہیں۔ تجربے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ معین شرائط کے تحت کئی کروڑ افراد کی آبادی میں سالانہ اموات کی تعداد بہت کم بدلتی ہے۔ بشرطیکہ معین شرائط ایک سال سے دوسرے سال تک کلیتاً متغیر نہ ہوجائیں۔ یہی بات آتش زدگی کی وارداتوں کے متعلق درست ہے۔ فرض کیجئے کہ دس لاکھ بیمہ شدہ افراد میں سے اوسط شرح سالانہ ہزار میں تین اموات ہے۔ یعنی سال بھر میں تین ہزار تو کمپنی بیمہ کرنے کے نرخ اس طرح محسوب کرے گی کہ اپنی آمدنی میں سے نہ صرف اپنے قانونی معاہدے کی ادائیگی کرے بلکہ کمپنی کے حصہ داروں کو منافع بھی ادا کرسکے۔ کمپنی کے تخمینہ کی صحت اس امر سے واضح ہوجاتی ہے کہ سوائے جنگ، وبا یا کسی اور ہیجان عظیم کی صورت کے کمپنی ہر سال نفع کماتی ہے۔ یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ تخمینے کی صحت

اور کمپنی کو جو منافع اس کی بدولت ملتا ہے دونوں کا دارو مدار بیمہ شدہ افراد کی تعداد پر منحصر ہے۔ اگر بیمہ شدہ افراد کی تعداد صرف دس ہو اور وہ سب ایک ہی مکان میں رہتے ہوں اور ان میں سے تو کسی وبا یا حادثہ کی وجہ سے مر جائیں تو کمپنی کا دیوالہ نکل جائے گا۔ جب سو افراد دس مختلف مکانات میں رہتے ہوں تو کمپنی کے امکانات بہتر ہونگے کیونکہ یہ قرین قیاس نہیں کہ وبا یا کوئی حادثہ پورے سو کے سو افراد موت کے گھاٹ اتار دے۔ اور اگر بیمہ شدہ افراد کی تعداد ایک کروڑ ہو تو کمپنی کے منافع اور کامیابی کے امکانات کلیتًا یقینی ہو جاتے ہیں۔

اب ناظر کو یاد ہوگا کہ تحلیلی منہاج تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہم ہر قسم کے مادہ کو دانہ دار سمجھیں یعنی یہ کہ مادہ بالآخر نہایت درجے صغیر مفردات پر مشتمل ہے جن کے خواص یکساں ہیں اور جن کو سالمے کہا جاتا ہے۔ پھر ان سالموں کی خود اپنی تعمیر اور بھی چھوٹے عناصر سے ہوتی ہے یعنی جوہروں سے۔ جوہروں کے ورا طریق تحلیل نئے منفرد مفردات کا پتہ دیتا ہے یعنی برقیئے اور مرکزے جو برقی ذرات ہیں اور جن میں سے مادیت غائب ہے اگرچہ ان میں اب بھی مادے کی ایک خاصیت یعنی کمیت پائی جاتی ہے۔ اس طرح پر مادے اور برق کے درمیان ایک پل تو قائم ہو گیا لیکن اس پل کے ذریعہ ایک کی حدود سے نکل کر

دوسرے کی حد میں جانا محفوظ نہیں ہے۔ کیونکہ جو ضابطے مادّے کے لئے وضع ہوئے ہیں جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں ان کا اطلاق برقیوں پر نہیں ہوتا اور نہ ہی برقی ضابطوں کا اطلاق مادّے پر۔

چونکہ ہم کو ایک ایسی کائنات کا سامنا ہے جو بے انتہا تعداد کے نہایت درجے چھوٹے ذرّات سے مل کر بنی ہے ہم شماریات کے طریقہ تفتیش کو کام میں لا سکتے ہیں بشرطیکہ یہ خیال کرنا ممکن ہو کہ اوسطاً ہر مفرد محض احتمال کے ضابطوں کے مطابق عمل پیرا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسی صورت میں ہی شماریات کے ضابطے جن کو احتمال کے ضابطے بھی کہا جاتا ہے جائز بھی ہیں۔ یہ ایک بیّن امر ہے کیونکہ اگر ہم احتمال کے ضابطوں کا مثال کے طور پر چت اور پٹ کے کھیل پر اطلاق کریں تو ہم جانتے ہیں کہ جب سکّے کو کافی مرتبہ اُچھال کر پھینکا جائے گا تو آخر کار چت اور پٹ کی تعداد برابر ہوگی۔ مگر یہ صورت جبھی ہوگی جب پانسہ پھینکنے کا فعل صرف بخت و اتفاق ہی کے تابع رہے اور ایسا نہ ہو کہ سکہ کسی ایک طرف بھاری ہو یا اس کی ساخت میں یکسانیت نہ ہو جس کی وجہ سے چت یا پٹ حالت کی پاس داری ہو جائے۔

آیئے مثال کے طور پر بخت و اتفاق کے ضابطے یا شماریات

کے علم الاحصار (CALCULUS) کو ایک سیدھے سادے طبعی مظہر یعنی گیس کے دباؤ کی دریافت میں آزما کر دیکھیں۔ گیس ایسے آزاد سالموں پر مشتمل ہوتی ہے جو بالاستقلال استمراری حرکت میں رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذرات مختلف رفتاروں سے الٹل پچو سب سمتوں میں حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اس ظرف کے پہلوؤں سے بھی ٹکراتے ہیں جس میں وہ مقید ہیں۔ اس ظرف میں جو دباؤ ہے وہ صرف انہیں کے باہم تصادم کا نتیجہ ہے یعنی فرداً فرداً ہر سالمے کی توانائیوں (ENERGIES) کا مجموعہ ہے جن کو ظرف کی دیواریں روکتی ہیں اور ان کے طریق حرکت کو متغیر کرتی ہیں (گیسوں کا نظریہ حرکی (KINETIC THEORY OF GASES) سطح کے ہر حصّہ پر سطح کی فی اکائی پر فی ثانیہ ٹکروں کی تعداد اوسطاً ایک ہی ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ظرف کے ہر پہلو پر دباؤ یکساں ہوگا۔ ہمارے مشاہدے کے پیمانے پر تجربہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔ یوں ہمیں اس قیاس کی عملی وضاحت حاصل ہو جاتی ہے کہ تصادم حقیقتاً بخت و اتفاق کے مطابق عمل پیرا ہیں ورنہ مختلف نقطوں پر دباؤ کم و بیش ہوتا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہر ایک مربع انچ پر فی ثانیہ برابر کی تعداد میں تصادم نہیں واقع ہوتے لیکن ہر منفرد تصادم کی توانائی اتنی خفیف ہوتی ہے کہ بلحاظ لا تعداد تصادموں کے ہمارے میاروں سے ان کے فرق کو

معلوم کرنا ممکن نہیں۔ یقیناً نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فی مکعب سنٹی میٹر[١] جبکہ گیس کی گرمی ۳۲ فٹ اور مقیاس الہوا پر دباؤ معمولی ہو (BAROMETRIC PRESSURE) سالموں کی تعداد ۲۷۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ہوتی ہے۔ عام طور پر اس تعداد کو ۲.۷×۱۰^{۱۹} لکھتے ہیں۔ ان سب سالموں کی مجموعی توانائی جو ظرف کی دیواروں پر چھوٹے توپ کے گولوں کی طرح پڑ رہے ہوتے ہیں۔ ایک کرہ ہوائی[٢] کے برابر ہوتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اگر سطح کی فی اکائی پر کم و بیش ہزاروں ٹکڑوں کا فرق بھی ہو تو اس سے جو غلطی حساب میں واقع ہوگی اس کو ہمارے نہایت حساس آلے بھی (جو اس سے لاکھوں گنا بڑے فرقوں کو بھی مشکل سے معلوم کر سکتے ہیں) معلوم نہ کر سکیں گے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر ہم شماریات کا طریق تفتیش کام میں نہ لائیں اور اس کو پوری صحت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیں تو ہم کو ۲.۷×۱۰^{۱۹} تفرقی مساوات (DIFFERENTIAL EQUATIONS) بنانا پڑیں گی اور ہر مساوات میں ۳×۱۰^{۱۹} رقمیں ان سالموں کے باہمی کشش کو ظاہر کرنے کے لئے ہوں گی۔ حساب لگایا گیا ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے

---

[١] جو $\frac{1}{16}$ مکعب انچ سے کم ہے (مولف)   [٢] فی مربع سنٹی میٹر اس کی مقدار ایک کلوگرام (۱۰۰۰ گرام) کے برابر ہوتی ہے یعنی فی مربع انچ ۷ء۱۴ پونڈ ہوتی ہے۔ (مولف)

۱۰ انسانی عمریں درکار ہوں گی یہ فرض کرتے ہوئے کہ محاسب ایک سالمے سے نمٹنے میں صرف ایک ثانیہ لگائے گا۔

یہ توصاف ناممکن ہے اس سے یہ بات ہماری سمجھ میں آجائیگی کہ کیوں شماریات کے منہاج تحقیق کا جن کی بنیاد بخت و اتفاق کے ضابطوں پر ہے کا استعمال قطعًا ناگزیر ہے۔ اس سے بعض ایسے امور کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جن کی معتد بہ اہمیت ہے اور جن کو تغیرات (FLUCTUATIONS) کہتے ہیں۔ وہ نہایت خفیف غلطی جو ظرف کی دیواروں پر ہزار تصادم کے فرق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ایک تغیر ہے۔ واضح ہو چکا ہے کہ یہ تغیر بہت ہی خفیف ہے۔ تاہم بعض صورتوں میں یہ حقیر تغیر بھی اہم ہو جاتے ہیں عملًا آیئے دو ظروف ایک مکعب سینٹی میٹر حجم کے لیں جن میں ایک ہی طرح کی گیس بھری ہوئی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے سے ایک نلکی کے ذریعہ ہم رشتہ ہیں جہاں تک ہمارے آلے معلوم کر سکتے ہیں دباؤ فوراً ہی دونوں میں قایم ہو کر یکساں ہو جائے گا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سالموں کی تعداد جو ظروف کی دیواروں پر تصادم کی تعداد کو متعین کرتی ہے۔ دونوں ظروف میں ہر وقت ایک سی کبھی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ سالمے ملحقہ نلکی کے ذریعے ایک ظرف سے دوسرے ظرف میں دباؤ کی بدولت جانے پر

مجبور ہیں اور مخالف سمتوں میں آنے جانے والے سالموں کی تعداد کلیتاً برابر تو ہو نہیں سکتی جب تک کہ کوئی حیرت انگیز اتفاق ہی نہ ہو۔ باوجود اس کے اوسطاً فی ثانیہ تصادم کا شمار اور اس لئے دونوں ظروف میں دباؤ تقریباً برابر ہوگا چونکہ اس تگ و دو میں حصہ لینے والے سالموں کی تعداد بے انتہا ہے لہٰذا اوسطاً فرق اتنا خفیف ہوگا کہ محسوب نہ ہوسکیگا لیکن اب فرض کیجئے کہ ظروف کو کم کرتے کرتے اتنا چھوٹا کر دیا گیا ہے کہ ہر ایک ظرف میں مقید سالموں کی گنتی بجائے ۳ × ۱۰^۱۹ کے جو ایک مکعب سینٹی میٹر میں تھی اب صرف دس سالمے فی ظرف رہ گئی ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی ایک سالمہ ایک ظرف سے دوسرے ظرف میں چلا جاتا ہے تو پہلے ظرف میں دباؤ یکلخت دس فی صدی گھٹ جائے گا اور دوسرے میں دس فی صدی بڑھ جائے گا اور دونوں ظروف میں بیس فی صدی کا فرق ہو جائے گا۔ یہ تغیر جو ایک سالمے کے چلے جانے سے پیدا ہوا ہے معتدبہ تغیر ہے۔

پہلی مثال میں تو ایک ہزار سالموں کی زیادتی بھی کوئی قابل اندازہ فرق پیدا نہیں کرتی یعنی اس مشاہدے کے پیمانے کے حساب سے دو باہم مربوط ظروف میں دباؤ کے مساوی ہونے کا ضابطہ صحیح ہوگا اور کوئی نہایت ہی غیر معمولی بعید از قیاس اتفاق یا کوئی نادر تغیر

ہی اس ضابطے کو باطل کر سکتا ہے۔ دوسری مثال میں بدلے ہوئے مشاہدے کے پیمانے کے حساب سے نتیجہ بالکل برعکس ہے۔ اوسطاً سالموں کی تعداد دونوں ظروف میں کبھی مساوی نہیں ہوتی۔ اور کوئی غیر مساوی صورت دباؤ میں معتدبہ اختلاف پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی بہت ہی کم قرین قیاس اتفاق وقت کے نہایت صغیر وقفے کے لئے سالموں کی مساوی تعداد ظروف میں قایم رکھ سکے گا۔ یوں مساوی دباؤ کا ضابطہ ایک استثنا ہوگا اور معمولاً دباؤ مختلف ہوں گے۔ بلحاظ مشاہد مشاہدے کے پیمانوں کی ذرا سی تبدیلی دو مختلف مظاہر کو جنم دے دیتی ہے۔ تاہم بلحاظ فطرت مظہر ایک ہی ہے۔ لہذا اتفاق بیک وقت ہمارے علمی ضابطوں کی اساس بھی ہے اور ان کے استثناؤں کا مبدا بھی۔ مندرجۂ بالا مثال اہم ہے کیونکہ اگرچہ انسان کے لئے ایسے چھوٹے ظروف بنانا ناممکن ہے جو اتنے چھوٹے ہوں کہ ان میں صرف سو یا ایک ہزار سالمے ہی آسکیں فطرت کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے۔ اور زندہ اجسام ایسے ہیں جنہیں گنتی کے سالمے ہوتے ہیں اور انکی مقدار کا درجہ بالکل ایسا ہی ہونا ہے یعنی وہ جرثومے جو فطرت میں بہت اہم فریضہ ادا کر رہے ہیں اور لہذا جنکی دنیا میں اتفاق کے ضابطے بالکل کام نہیں دیتے کیونکہ انمیں سالموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بیمہ کمپنیوں کے متعلق بھی یہی بات صحیح ہے کیونکہ وہ اپنا کاروبار اسی صورت میں قایم رکھ سکتی ہیں جبکہ بیمہ شدہ افراد کی تعداد معتدبہ

۳

احتمالات۔ بخت و اتفاق کے ضابطوں کا ایک اطلاق۔ لحمیہ[1] (پروٹین) کے سالمے۔ محض اتفاق ہی حیات کے جنم کی توجیہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔

ہم نے دو نہایت اہم وجوہ سے بخت و اتفاق اور علمی ضابطوں کی ساخت پر اتنی طویل بحث کی ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ناظر کے لئے سمجھ لینا ضروری ہے کہ موجودہ صورت میں ہمارے تمام علمی ضابطے بخت و اتفاق پر قائم ہیں یعنی اس فریضے پر کہ فطرت کی تہہ میں قطعاً بے ترتیبی ہے۔ اگر سالمے جوہر اور برقیے پوری بے ترتیبی کے ساتھ متحرک نہ مان لئے جائیں تو شماریاتی استدلال سے ہم مقررہ ضابطے نہیں حاصل کر سکتے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مشاہدے کے پیمانے پر یہ طبعی ضابطے ایک حیرت انگیز حسنِ ترتیب کو ظاہر کرتے ہیں لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نقطۂ نظر سے "بے ترتیبی حسنِ ترتیب کی تخلیق کرتی ہے"۔ اس رائے پر عمیق غور و فکر بہت ضروری ہے کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ ہر صاحبِ فکر انسان کو اس

[1] ایک مادہ جو سفیدی یعنی البیومن کا اساسی عنصر ہے (از مترجم)

چھوٹے سے جملے میں ایک ایسا عقدہ نظر آئے گا جو ہمارے عہد کے نہایت پراسرار فلسفیانہ مسائل میں سے ایک ہے۔ یہ ان مسائل میں سے ایک ہے جو انسانی فہم اور ذہانت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ فطرت، انسان اور علت کو ایک ہی نظام میں ہم آہنگ کریں اور رائے کے اظہار کو حزم و احتیاط کے قابو سے باہر نہ جانے دیں۔

اگر ہم کتاب کے نام اور مقصد کا خیال کریں تو ممکن ہے کہ گزشتہ ابواب خشک اور بے ضرورت معلوم ہوں لیکن ایک وجہ ان کے لکھنے کی یہ تھی کہ ناظر اس چھوٹے سے جملے "بے ترتیبی حسین ترتیب کی تخلیق کرتی ہے" کو سمجھ لیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس جملے کی اہمیت اب پر واضح ہو گئی ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ باب میں ریاضی کے طریق استدلال سے یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ ان علمی حاصلات کی مدد سے جو آج واقعتاً ہمارے پاس ہیں حیات کی تخلیق کو محض اتفاق و بخت کی مدد سے واضح کرنا ناممکن ہے۔ ہم احتمالیات (PROBABILTIES) کے احصار (CALCULUS) کا استعمال کریں گے۔ احصار احتمال فقط نام ہے ان قاعدوں کے مجموعے کا جن کی بدولت ہم بخت و اتفاق کو ریاضی کے طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ

ناظران خیالات۔ علمی تخیئل کی ترکیب۔ کائنات کی اضافیت۔ اور جو تصور اس کا ہم نے قایم کیا ہے اوران بہت سے دقیق مسائل سے جو اس کی بدولت پیدا ہوتے ہیں آشنا ہو جائے۔

ہمارا علم قابل ستائش اور عظیم المرتبت ہے۔ پھر اس حقیقت کے پیش نظر کہ وہ انسانی دماغ کی تخلیق ہے یہ علم اور بھی زیادہ انسانی دماغ کے لیے تحسین و آفرین کا متقاضی ہے جس نے اس کی تخلیق کی ہر لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری منطق اور فطانت نے حواس کے اس آئینے کے مہیّا کردہ مواد سے جو اشیا کی حقیقی شکل تبدیل کر کے پیش کرتا ہے، جو پر اسرار اور فرضی جہان پیدا کیا ہے، اس میں اور حقیقی، پر سکوت اور بے رنگ کائنات میں جو روابط ہیں ان کو ہم بالکل نظر انداز کرتے رہے ہیں اور شاید آئندہ بھی ہمیشہ ان کو نظر انداز کرتے رہیں گے۔ اس اصلی کائنات اور ہمارے شعور کے تقابل سے اس دنیا کی آب و تاب نمودار ہوئی ہے۔

انسانی ذہن اس معمے کے حل کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔ جب تک وہ اس کو سادہ نہ کرلے یعنی جب تک وہ اشیاء کو کسی مشترک مفرد تک تحویل نہ کرلے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مگر حالت یہ ہے کہ تحویل کی یہ سب کوششیں چونکہ من مانے قسم کی ہیں یہ بغیر محسوس طور پر

ہم کو بھٹکا کر حقیقت سے دور لے جاتی ہیں لہذا جب کبھی انسان کائنات
کے معمے کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے تو وہ جس مسئلے کے حل کی تلاش میں نکلتا ہے
عموماً دورانِ تفتیش میں اسی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جس مواد پر وہ اپنی
سعی کی بنیاد رکھتا ہے وہ احساسات کی مہیا کردہ ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے
احساسات کا تجزیہ کرتا ہے تو وہ جوہروں اور برقیوں تک جا نکلتا ہے لیکن
حال یہ ہے کہ جب احساس کا جوہر کی مدد سے تصوّر کرنا چاہیں تو وہ اپنی
اہمیت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت سب مظاہر
فطرت میں مشترک مفروضوں کی تلاش ٗ انسان کو اس کی خواہش کے
علی الرغم اس سرزمین سے جس کی چھان بین کرنے کے لیے وہ نکلتا ہے
نکال کر دوسری دُنیا میں پہونچا دیتے ہیں۔ لیکن اس ہم آہنگی اور قدر
مشترک کی تلاش اور دوڑ میں کبھی کبھی عمومی ضابطے بھی اس کے ہاتھ آجاتے
ہیں ایسے حرکیاتی ارتقائی اصول جن میں ایک عالمگیر شان اور ایک لشٹین
وسعت پائی جاتی ہے۔ اپنی تحقیقات کے دوران میں ہمیں ایسے ضابطوں
سے سابقہ پڑے گا۔

سردست ہم احتمالیات کے احصار کے ایک مخصوص طریق عمل پر
غور کرینگے مگر پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنا ہوگی کہ کسی واقعہ کے احتمال سے
ہماری کیا مراد ہوتی ہے۔ احتمال کی ریاضیاتی تعریف یہ ہے۔ واقعہ کے موافق

صورتوں کی تعداد کو واقعہ کی جملہ امکانی صورتوں سے جو نسبت ہوتی ہے اس کو احتمال کہتے ہیں۔ اس میں تمام ممکن صورتوں کو مساوی امکان کا حامل سمجھ لیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر چت اور پٹ کے کھیل میں ممکن صورتیں دو ہیں (چت یا پٹ) اگر سکہ متناسب اور موزوں ہے تو دونوں صورتیں یکساں امکانی ہیں۔ لہذا جب کوئی سکہ ہوا میں اچھالا جائے گا تو زمین پر گر گیا تو وہ چت ہوگا یا پٹ یعنی ایک صورت ہر کھلاڑی کے موافق ہوگی اور کل ممکن صورتیں دو ہیں لہذا احتمال اوپر کی تعریف کے مطابق $\frac{1}{2}$ = ۰٫۵۰ اور ہم یہ کہیں گے کہ چت اور پٹ کے کھیلنے میں جیتنے کا احتمال ۰٫۵ ہے۔ پانسے کے کھیل میں جس کے چھ پہلو ہوتے ہیں احتمال $\frac{1}{6}$ یا ۰٫۱۶۶۶... ہوگا۔ $\frac{10000}{16666}$

ایک بہت بڑے ریاضی داں جوزف برٹراں (JOSEPH BERTRAND) کے برمحل جملے کے مطابق "بخت و اتفاق کو نہ شعور ہے اور نہ حافظہ" اگر دس دفعہ سکہ اچھالنے پر "پٹ" ہی نکلے تو بھی اگلی دفعہ سکہ اچھالنے پر بھی "پٹ" نکلنے کا احتمال وہی ہوگا جو پہلی بار پھینکنے کے بعد تھا یہی صورت "چت" کے لئے بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اتفاق" کے کھیلوں میں اگرچہ جیتنا اور ہارنا ممکن ہے لیکن ریاضی کے ضابطوں

کے مطابق یہ امر یقینی ہے کہ اگر کھیل میں کسی جانب سے بددیانتی نہ ہو یعنی اور صرف اتفاق ہی کا عمل دخل رہے، تو کافی دیر تک اگر کوئی کھیلتا رہے تو نفع نقصان کے ہم پلّہ ہو گا۔

بعینہٖ اگر کسی طبعی مظہر کی تشریح کسی ایسے ضابطے سے کی جائے کہ جس کی اساس احتمال کے احصاء پر ہو تو ہم کو تسلیم کرنا ہو گا کہ فطرت راست باز ہے اور دھوکہ فریب نہیں کرتی۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ فطرت میں جب تک حیات کا وجود ظاہر نہیں ہوتا سب واقعات اوپر کے نظریئے کے مطابق وجود میں آتے ہیں لیکن جوں ہی حیات وجود میں آتی ہے یہ صورت باقی نہیں رہتی۔

عموماً مسائل اتنے سادہ نہیں ہوتے جتنے مثال میں لئے گئے ہیں اور احتمالات کو مرتب کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت وہ مندرجہ ذیل کلئے کے ذریعہ محسوب کئے جاتے ہیں۔

جب کوئی واقعہ جسکا احتمال ہمکو مطلوب ہے کسی دو واقعوں کے یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے پر منحصر ہو تو اسکا احتمال ان دو واقعوں میں سے ایک کے ظاہر ہونیکے احتمال اور دوسرے واقعے کے ظاہر ہونے کے اس احتمال کا حاصل ضرب ہوگا جو پہلے واقعے کے وقوع پذیر ہوجانے کے بعد دوسرے واقعے کیلئے ممکن ہو گا۔ آیئے ایک سیدھی سادھی مثال لے کر اس کو واضح کریں۔ فرض

کرو کہ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ پانسے کے کھیل میں ۵ کے عدد کا یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ظاہر ہونے کا کیا احتمال ہے۔ پہلے واقعے کا احتمال ہم دیکھ چکے ہیں کہ $\frac{1}{6}$ ہے اور دوسرے واقعے کا بھی $\frac{1}{6}$ ہے۔ اس لئے ۵ کے یا کسی اور عدد کے یکے بعد دیگرے دو بار ظاہر ہونے کا احتمال اوپر دیئے ہوئے کلیئے کے مطابق $\frac{1}{6} \times \frac{1}{6} = \frac{1}{36}$ ہوگا یعنی ۲٫۷۷٪۔ جو اس صورت میں بھی بہت کم ہے۔ پانچ مرتبہ ایک ہی عدد کو یکے بعد دیگرے پانے کا احتمال $\frac{1}{6} \times \frac{1}{6} \times \frac{1}{6} \times \frac{1}{6} \times \frac{1}{6} = \frac{1}{7776}$ = ۰٫۰۰۰۱۳٪ ہوگا اور دس مرتبہ متواتر ایک ہی عدد کے کھلنے کا احتمال تو $\frac{1}{۶۰,۴۶۶,۱۷۶}$ یا تقریباً ۰٫۰۰۰۰۰۱۶٪ ہوگا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ احتمال بڑی تیزی سے گھٹتا جاتا ہے۔

آیئے اب ایسے الفاظ جیسے "ممکن" اور "غیر ممکن" ہیں ان کے حقیقی مفہوم پر غور کریں۔ جب سے کہ احتمال کے تخیل کو طبیعات کے مسائل میں استعمال کیا جانے لگا ہے یہ الفاظ توقع کے مطابق علمی زبان میں سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ ایک واقعہ نہایت غیر امکانی تو ہو سکتا ہے لیکن نظری طور پر (THEORETICALLY) اس کا امکان ہوتا ہے۔ بہ استثنا ایسی صورت کے کہ صاف۔ تعمیری اور منطقی دلائل کی بنا پر وہ بعید از قیاس ہو۔ جیسے کہ ایک پانسے کی مدد سے ۷ کا عدد نمودار نہیں ہو سکتا (کیونکہ پانسہ شش پہلو ہے اور ہر پہلو پر ایک نقش ہو تو ۶ تک عدد ہو سکتے ہیں۔ مترجم) اگر کسی

واقعہ کا احتمال لاانتہا کم ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وقت کی معین حدود کے اندر اس کا وقوع پذیر ہونا عملاً ناممکن ہے۔ نظری امکان ہمیشہ موجود رہے گا۔ لیکن بے حد کم ہونے کی بدولت گویا وہ اس کے عدم وقوع کے ایقان پر دلالت کرے گا۔ لیکن زمانہ ایسی صورت میں دخل انداز ہوسکتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن فرض کیجئے کہ جس مدت میں کوئی مظہر فطرت واقع ہوسکتا ہے اس کو محدود کردیا جائے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کسی خاص واقعہ کا سو برس میں خاص حالتوں کے ماتحت ایک ہی دفعہ ظاہر ہونے کا امکان ہے لیکن وہ حالتیں ایسی ہیں کہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ وہ قایم نہیں رہ سکیں۔ مثال کے طور پر تصور کیجئے کہ پانسے کا کھلاڑی یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کو کم احتمال والی صورت حاصل ہوجائے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں یعنی کسی ایک عدد کو دس بار متواتر پھینکے تو لاکھوں کی اکائیاں حذف کرکے بھی چھ کروڑ دفعہ پانسہ پھینکنے میں ایک امکان اس کا ہوگا کہ اس کی مراد بر آئے۔ اگر وہ رات اور دن (چوبیس گھنٹے روزانہ) پانسہ پھینکتا رہے اور ایک دفعہ پانسہ پھینکنے میں ایک ثانیہ وقت لگے تو وہ دن رات میں ۸۶,۴۰۰ دفعہ پانسہ پھینکے گا تو بغیر کھائے پیئے اور سوئے اور بغیر کسی خلل واقع ہونے کے دو برس کی مدت میں

وہ ایک دفعہ ممکن ہے کہ وہ اپنی آرزو پوری کرلے کہ دس دفعہ ایک ہی عدد پانسہ سے نمودار ہو۔ لیکن فرض کیجئے کہ پانسہ کسی آسانی سے ٹوٹ پھوٹ جانے والے مادے سے بنا ہوا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ چند دنوں تک ہی سالم رہ سکتا ہے تو کھلاڑی کے امکانات معتدبہ طور پر کم ہو جائیں گے کیونکہ وہ پانسے کو چھ کروڑ چار لاکھ چھیاسٹھ ہزار دفعہ نہیں پھینک سکے گا۔ اس کا احتمال تو ہمیشہ ہے کہ اس کا بخت یا وری کرے اور عدد کا وہ تواتر فوراً ہی چند دفعہ پھینکنے کے بعد ہی اس کو حاصل ہو جائے۔ لیکن اس کا احتمال بہت ہی کم ہے۔ اگر پانسہ کا پھینکنا صرف دس دفعہ ہی ممکن ہو تو کہا جائے گا کہ ایسا ہونا عملاً نا ممکن ہے۔ تھوڑی دیر بعد ناظر کو معلوم ہو جائیگا کہ ہم نے اس مثال کا انتخاب کیوں کیا۔

تصوّر کیجئے کہ ہمارے پاس ایک سفوف ہے جو ایک ہزار سفید ذرّوں اور ایک ہزار کالے ذرّات پر مشتمل ہے۔ ان ذرات میں بجز رنگ کے کوئی فرق نہیں۔ تجربہ شروع کرنے سے پہلے فرض کیجئے یہ ذرّات ایک نلکی میں ہیں جس کا قطر ذرّوں سے تھوڑا ہی بڑا ہے۔ اس لئے ذرّات ایک ہی قطار میں ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہوں گے اور باہم آمیز نہ ہوں گے۔ ہزار سفید ذرّے اوپر اور ہزار کالے ذرّے نیچے۔ ہمارے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق آدھی نلکی سفید اور آدھی نلکی کالی نظر آئیگی

تشاکل[1] (DISSYMETRY) مکمل ہے اور پوری نلکی میں ہم رنگی غائب ہے۔ نلکی کا ایک سرا بند ہے اور دوسرا سرا اوپر ایک مجوف شیشے کے گولے میں کھلتا ہے۔ جب ہم اس پورے آلے کو اُلٹا کردیں تو ذرّات خلط ملط ہو کر گولے میں گر جائیں گے۔ اب ہم گولے کو خوب ہلا کر ذرّات کو آمیز کردیتے ہیں۔ اب اگر آلے کو پھر اُلٹا دیں تو ذرّات پھر نلکی میں یکے بعد دیگرے چلے جائیں گے۔ لیکن اپنے اضافی مقام بدلکر یہ بدرجۂ غایت غیر امکانی امر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اب بھی ویسے ہی علیحدہ ہوں جیسے تجربے سے پہلے۔ اب شیشی کو اتنے فاصلے پر رکھ کر دیکھو کہ ذرّات الگ الگ نظر نہ آئیں تو نلکی اپنی پوری لمبائی میں بھورے رنگ کی ہوگی۔

اگر پھر اس کو اُلٹا کر ذرّوں کو گولے میں لے جاکر خوب ہلائیں اور پھر نلکی میں اُلٹ دیں تو ذرّوں کی نئی ترتیب نلکی میں ہوگی لیکن ہمارے مشاہدے کے پیمانہ پر نلکی کی رنگت وہی بھوری رہے گی اور منظر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔ مشاہدے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر معتد بہ دیر تک بھی یہی اُلٹنے پلٹنے کا عمل کرتے رہیں آنکھ پر نلکی کی صورت تقریباً یکساں رہے گی۔ احتمالیات کے احصار کی مدد سے ہم ان حالات

---

[1] تشاکل سے مراد چیزوں کی وہ حالت ہے جیسے سیدھے اور اُلٹے ہاتھ متشاکل ہیں (مترجم)

کی ٹھیک ٹھیک توجیہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ احصاء یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہزار سفید اور ہزار کالے ذرّوں کو اب ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ ہو جانے کا احتمال برابر ہے ۹۸۴۶×۱۰^{-۶۰۰} کے یعنی ۹۸۴ سے پہلے اور اعشاریہ کے بعد چھ سو صفریں اور لگانی ہونگی جو معمولی کتاب کی بارہ سطروں میں جا کر ختم ہونگی۔ اور یہ صورت بھی جب ہے کہ جس ترتیب میں سفید اور کالے ذرّے ہیں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں یعنی یہ کہ سوائے رنگ کے ذرات اور ہر طرح پر یکساں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ۱۰ کی سو سے بڑے قوت نما انسان کے لئے غیر اہم ہو جاتے ہیں[ل]۔ یہی طریقہ تحریر منفی اعداد کے لئے بھی مستعمل ہے۔ مثلاً۔ $۱۰^{۲} = ۱۰۰$+۔ اگر قوت نما منفی ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اہم عدد کے ساتھ قوت نما کو ضرب نہیں دینا بلکہ تقسیم کرنا ہے۔ $۳ \times ۱۰^{-۳} = \frac{۳}{۱۰^{۳}} = ۰.۰۰۳$ ہو گا۔

اب کہ ناظر کو کچھ واقفیت ہو گئی ہے ہم اصل مسئلے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کرہ ارض پر حیات کے خود بخود نمودار ہو جانے کے احتمال کو محسوب کرنے کے لئے کسی بنیاد کا قایم کرنا مسئلے کی لاینحل پیچیدگیوں کی بدولت ناممکن ہے تاہم مسئلے کی اُلجھنوں کو بہت کچھ ہلکا کیا جا سکتا ہے اور ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ حیات کے بعض ضروری عناصر بعض بڑے

لہ دیکھو اگلے صفحہ پر

سالموں، مثلاً لحمیات (PROTIENS) کے محض اتفاق سے وجود میں آنے کے احتمال کو محسوب کریں۔ ذی حیات نامی جسیموں (ORGANISMS) کے سب اساسی سالموں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں معتد بہ تشاکل پایا جاتا ہے۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ تشاکل کا درجہ ۶۵ اور اسکے درمیان کسی عدد سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اکا عدد سب سے بڑے تشاکل کو ظاہر کرتا ہے (جیسے کالے اور سفید ذرّات کی حالت میں سب کالے ایک طرف اور سفید ایک طرف) اور ۶۵ کا عدد مکمل یکسانیت ظاہر کرتا ہے یعنی نہایت مناسب ترتیب جبکہ سفید اور کالے ذرّات نلکی کے ہر حصے میں مساویانہ طور پر آمیز ہوں۔ سب سے زیادہ احتمالی تغیرات (مساوی تعداد سے صغیر انحرافات) تشاکل کے درجہ ۵ر کے قرب وجوار میں مجتمع ہوں گے۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) جو ناظر بڑے اعداد کو ۱۰ کے قوت نماؤں کے ذریعہ ظاہر کرنے کے طریقے سے ناواقف ہے اس کو اس طریقے کی اہمیت اور فوائد سے آگاہ کرنے کے لئے ایک مختصر توضیح ضروری ہے۔

بعض اعداد ایسے ہوتے ہیں کہ انکی سب صفروں کا لکھنا تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ پھر ان کا پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے اور اعداد بہت جگہ بھی گھیرتے ہیں مثلاً جب ہم نے ایک مکعب سینٹی میٹر گیس میں سالموں کا ذکر کیا تو ہمیں ۳۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سالموں کی تعداد دینا پڑی۔ یہ پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کو سادہ طور پر معمولاً 3×10^{19} لکھتے ہیں جو یوں پڑھا جا سکتا ہے دس کی انیسویں قوت نما کا تین گنا۔ ۱۹ کو قوت نما کہتے ہیں اور وہ صرف اہم عدد کے بعد صرف صفروں کی تعداد

یہ سب تخمینے پروفیسر چارلس یوجین گوائے صاحب نے ایک ایسے سالمے پر محسوب کئے جس کا درجہ تشاکل ۶۹ تھا اور جو ۲۰۰۰ جوہروں پر مشتمل تھا۔ مسئلے کو بہت کچھ سادہ اور آسان کرنے کے لئے انہوں نے جو فرضی پروٹین کا سالمہ اپنے سامنے رکھا جس میں دو ہی مفردات فرض کئے حالانکہ ہمیشہ کم سے کم چار مفردات ایک۔ ایسے سالمے میں ہوتے ہیں۔ کاربن۔ ہائیڈروجن۔ نائٹروجن۔ آکسیجن جس میں مزید کبھی "تانبا"۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح $10^2 = 10 \times 10 = 100$ اور $10^3 = 10 \times 10 \times 10 = 1000$ اور $3 \times 10^3 = 3000$

اگر ان کے قوت نما قابل امتیاز تیزی سے بڑھیں تو یہ طریقہ تحریر بھی اکثر چکرا دیتا ہے مثلاً یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ زمین کی عمر ۲۰۰ کروڑ برس ہے یعنی 2×10^9 اگر اس عدد کی صدیاں بنائیں تو 2×10^7 صدیاں بنیں گی اور چونکہ ایک صدی میں 10^5 (یعنی ایک لاکھ سے کم) دن ہوتے ہیں اس لئے 2×10^{12} سے کم دن زمین کی عمر ہے۔ ایک دن میں 10^5 سے کم ثانیے ہوتے ہیں لہذا دنیا کی ابتدا سے آج تک 2×10^{12} ثانیے سے کم ثانیے ہوتے ہیں۔ یہ آخری عدد کرۂ ارض کی پوری تاریخ کو ظاہر کرتا ہے یعنی کل انسانی حقیقت کو۔ اس سے بڑے عددوں کا اندازہ کرنا ہو تو ہمیں سورج کی عمر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو جدید نظریوں کے مطابق غالباً 5×10^{12} سال یا 5×10^{20} ثانیے سے زیادہ نہیں۔ اصطلاحاً $\frac{1}{1000}$ ملیمیٹر یعنی $\frac{1}{25000}$ انچ کو مائکرون (MICRON) کی اکائی کہتے ہیں۔ اس اکائی کی پیمائش سے سورج کا زمین سے فاصلہ 1.5×10^{15} ہے اور سب سے قریبی ستارہ کا ہم سے 4×10^{21} مائکرون دور ہے۔ ایک مکعب سینٹی میٹر گیس (تقریباً بھرا ہوا انگشتانہ) میں 3×10^{19} سالمے ہوتے ہیں لیکن پوری کائنات میں 10^{80} سے کم سالمے ہیں اور اس میں ہیلیئم کے ثوابت بھی شامل ہیں۔
(مصنف)

کبھی لوہا یا گندھک وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ اگر ان جوہروں کا جوہری وزن ۱۰ فرض کیا جائے (جو ایک اور سہولت حساب میں پیدا کرلی گئی ہے) تو سالمے کا وزن ۲۰۰۰۰ ہوگا۔ غالباً یہ وزن اکثر سادہ پروٹین کے سالموں سے کم ہی ہے۔ (ہیمفلن میں ۳۴۵۰۰)

ان سہل کی ہوئی شرائط کے زیر اثر اس کا احتمال کہ وہ درجے کے تشاکل کی ترتیب اجزار حاصل ہوسکے (بشرطیکہ صرف اتفاق زیر غور ہو) $۲۶۰۲ \times ۱۰^{-۳۲۱} = \frac{۲۶۰۲}{۱۰^{۳۲۱}}$ ہوگا۔

اس درجے کے احتمال کو حاصل کرنے کے لئے جو مادہ درکار ہوگا اسکا حجم تصوّر کے بس کا روگ بھی نہیں۔ یہ مادہ اتنا ہوگا کہ اگر اس کا ایک کرہ بنایا جائے تو اس کا نصف قطر اتنا بڑا ہوگا کہ روشنی کی شعاع $۱۰^{۸۲}$ برس میں اس کو طے کر پائیگی۔ یہ حجم کل کائنات بشمول دور افتادہ کہکشاؤں (GALAXIES) کے حجم سے بھی زیادہ ہوگا۔ اور یہ کہکشائیں وہ ہیں جن کی روشنی ہم تک ۲×۱۰^{۶} (بیس لاکھ) سال میں پہونچتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم کو ایک ایسا حجم تصوّر میں لانا پڑے گا جو آئن سٹائن (EINSTEIN) کے تخمینہ کردہ کائنات سے بھی پدموں پدم بڑا ہوگا۔ (چارلس یوجین گوائے[۲])

کسی ایک واحد اونچے درجے کے تشاکل والے سالمے کا محض

اتفاق اور معمولی حری اضطراب (THERMIC AGITATION) کے عمل سے معرض وجود میں آجانے کا احتمال عملاً صفر کے برابر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم ۵ لاکھ لاکھ مرتبہ (5×10^{14}) مرتبہ فی ثانیہ سالمے کے اجزاء کو جھنجھوڑیں اور یہ ارتعاش روشنی کے ارتعاش (LIGHT FREQUENCIES) کی تعداد کے درجہ قدر کے برابر ہے (موجی طول جو ۰٫۴ اور ۰٫۸ مائکرون کے درمیان واقع ہیں) تو اوسطاً ایسے ایک سالمے کا جس کا درجہ تشاکل ۹۰ ہوگا کرہ ارض کے حجم کے برابر والے مادہ میں معرض وجود میں آنے کے لئے جو مدت درکار ہوگی وہ اوسطاً 10^{242} سال ہوگی (یعنی اکائی کے آگے دو سو بیالیس صفر ہیں)

لیکن یہیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ کرۂ ارض کو وجود میں آئے ہوئے ابھی بیس کروڑ برس ہوئے ہیں اور حیات کو اس پر ظاہر ہوئے تقریباً دس کروڑ سال (10^{9} سال)

اس سے تو ہمارے سامنے اس کھلاڑی کی حالت آجاتی ہے جس کے پاس ایک مرتبہ اپنے عددوں کے تسلسل کو حاصل کرنے کے لئے مطلوبہ وقت کا میسر آنا ممکن نہ تھا کہ وہ کافی تعداد میں پانسے ڈال سکتا لیکن یہاں تو بجائے اس کے کہ مدت کا وقفہ تین چار سو گنا چھوٹا ہوتا 10^{243} گنا سے بھی زیادہ چھوٹا ہے۔

اس کے خلاف ہم ہمیشہ اس امر کو پیش کر سکتے ہیں کہ اتفاق کا
احتمال خواہ کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ بدستور موجود تو ہے اور اسکا
کوئی ثبوت نہیں کہ متوقع حالات کی صورت صرف کروڑہا کروڑ صدیوں
کے بعد ہی ظہور پذیر ہو اس کا امکان ہے کہ آغاز کار ہی میں چند
ثانیوں کے بعد اس کا وجود ظاہر ہو جائے اور یہ احصار کے ساتھ صرف کامل
مطابقت ہی نہ ہوگی بلکہ یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسا مظہر دو مرتبہ
نہیں تین مرتبہ پیچھے بعد دیگرے وجود میں آیا بھی لیکن اس کے بعد مطلقاً
کبھی نہیں۔ باوجود اس کے اگر ایسا ہوا ہے اور احتمالیات کے احصار
پر ہمارا یقین بھی اگر باقی ہے تو ایسے وقوعے کو تسلیم کرنا ایک معجزہ ہوگا
اور اس کا نتیجہ جو اخذ کیا جائے گا وہ یہ ہوگا "ایک واحد سالمہ یا زیادہ
سے زیادہ دو تین سالمے"

ابھی "حیات" کا تو ذکر ہی نہیں صرف ان اجزا ہی سے جن پر حیات
مشتمل ہے ایک جز کے وجود میں آ جانے کا تذکرہ ہے اب ایک سالمہ تو
بیکار ہوگا بالکل ایسے ہی کروڑوں سالموں کی موجودگی لازمی ہے۔ ایسے
ہی سالموں کے ایک سلسلے کے وجود میں آنے کے لئے اتنی مدت درکار
ہوگی جس کے اظہار کے لئے اور بھی بڑے عددوں کی ضرورت ہوگی۔ اور
جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ہر نئے سالمے کا وجود ایک تواتر میں واقع

ہونے کی بدولت چونکہ احتمال کے مرکب ضابطے کے تحت ہیں ہوگا اس لیے
احتمال کی عدم امکانیت تیزی سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اگر ایک زندہ
خلیہ کی وجود میں آنے کا احتمال، ریاضی کے اصولوں سے ہوسکے تو جو
مدتیں اس کے لئے اب تک بتائی گئی ہیں وہ اصلی مدت کے مقابلے
میں ہیچ ہونگی۔ ہم نے مسئلہ کو دانستہ اسی لئے سادہ اور سہل کر کے
پیش کیا تھا کہ احتمال کی مقدار کو کچھ بڑھا سکیں۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ فی ثانیہ سالموں پر لا تعداد تجربے کرنا
ان کے ردِ عمل کرانا، یا ان کو باہم آمیز کرکے خوب جھنجھوڑنا ممکن ہوسکتا
ہے تو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقوعے جن کے ایک دفعہ ظہور میں
آنے کے لئے کرہ ارض کی تخمینی عمر سے لا انتہا زیادہ عرصہ درکار ہے
انسانی مفہوم کے مطابق تو ناممکن الوقوع ہی سمجھے جائیں گے۔

یوں ہم کو واقعتاً ایک گومگو کی سی صورت کا سامنا ہے۔ یا تو
صورت حال یہ ہے کہ ہم کو اپنے علم اور ریاضیاتی اور دوسرے مناہج
استدلال پر یقین ہے جو ہمیں گردوپیش کے طبعی مظاہر کی تسلی بخش توجیہ
کرنے کے قابل بناتے ہیں، مگر اس صورت میں ہم یہ ماننے پر بھی مجبور
ہیں کہ بعض بنیادی مسائل ایسے ہیں جو ہمارے ادراک کے قابو میں نہیں
آتے اور جن کی توضیح اس امر کے مساوی ہے کہ ہم کوئی معجزہ تسلیم کریں،

یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنے علم کی ہمہ گیری اور تمام فطری مظاہر کی محض بحث و اتفاق کے کلئے سے توضیح کو مشکوک قرار دیں۔ اور معجزے یا کسی ورائے علمی مداخلت کا سہارا لیں۔

ہر دو صورتوں میں ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ حیات، اس کی نشوونما اور اس کے تدریجی ارتقا کے متعلقہ طبعی مظاہر کی کوئی علمی توجیہ فی الحقیقت قطعاً ناممکن ہے اور جب تک کہ موجودہ سائنس کی بنیادیں تہ و بالا نہ کی جائیں ان مظاہر کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علم میں کوئی کڑی گم ہے۔ حیاتی اور غیر حیاتی مادے کے درمیان ایک خلیج ہے جس کو ہم پاٹ نہیں سکے۔ ناظر کو یاد ہوگا کہ ذرات کی دنیا میں بھی ایسی ہی ایک اور خلیج کی طرف ہم نے اشارہ کیا تھا۔ یعنی جوہر کے اجزائے تعمیر برقیوں اور خود جوہر کے درمیان ہمیں توقع ہے کہ علم کسی نہ کسی دن ان شگافوں کو پاٹ لے گا لیکن آج اس اُمید کی وقعت پرحسرت خوش فہمی سے زیادہ نہیں۔

راک فلر کی تجربہ گاہ (ROCKFELLER INSTITUTE) میں وائی کاف (WYCKOFF) نے خرگوش کی رسولی کے اس زہریلے مادّے (VIRUSES) کے متعلق جس کے بلوری قلم بننا ممکن تھے (CRYSTALLIZABLE) اور سٹینلی (STANLEY) نے تمباکو کی پچہ کاری

والی (MOSAIC) بیماری کے متعلق یہ حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں اور جن کا غیرنامی (INORGANIC) اور ذی حیات مادے کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہوئے استقبال کیا گیا تھا ان سے بھی ہماری رائے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اول تو اس لئے کہ ان کے سالمی اوزان اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ محض اتفاق سے ان کے معرض وجود میں آنے کے احتمالات اور بھی ضعیف ہیں (سالمی وزن ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ کے درجے کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تعمیر میں ۵،۰۰۰،۰۰۰ جوہروں سے بھی زیادہ کام میں آئے ہیں) ثانیاً یہ وجہ بھی ہے کہ حیات کے کسی مفہوم کے مطابق بھی ان کو ذی حیات مادہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے جیسے زہریلے مادے کی تخلیق کر لیتے ہیں لیکن اسی وقت جب وہ کسی ذی حیات مادے سے ملحق ہوں۔ ان کی حالت بعینہ ان زہروں کی سی ہے جو کسی جرثومے کے ذریعہ حیوانی جسم میں داخل ہو کر کسی مرض کا موجب ہوں (TOXINS) جن کو مادہ عفونت (PTOMAINES) بھی کہتے ہیں اور جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی جاندار مادّے میں سڑاند پیدا ہوتی ہے۔

اتفاق کے ضابطوں نے علمی ترقی میں بے انتہا مدد کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے بلکہ اس کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے سہارے

کے بغیر علمی تحقیقات چل سکے۔ لیکن وہ صرف بعض غیر نامی مظاہر فطرت اور ان کے ارتقا ہی کی ایک حسب دلخواہ موضوعی توجیہ پیش کرتے ہیں خارجی حقیقت کی وہ کوئی اصلی توضیح پیش نہیں کرتے۔ اس امر کے متعلق کہ خلیہ کے خواص پیچیدگی کی ترتیب سے تو وجود پذیر ہوتے ہیں اور گیسوں کی آمیزش کی گڈ مڈ پیچیدگی سے نہیں پیدا ہوتے یہ ضابطے نہ کوئی توضیح کرتے ہیں اور نہ ہی اس کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایک سے دوسرے میں منتقل ہونے والی ارتقی علی الاتصال ترتیب اتفاق کے ضابطوں کے قابو میں نہیں آتی۔

یہ ایقان کہ ہم حیاتیاتی مظاہر کی عمومی توضیح اور ذی حیات ہستیوں کے ارتقا کو ویسے ہی اعداد و شمار سے قابو میں لا سکیں گے جیسے ہم جلنے والے مکانوں کا تخمینہ لگانے میں یا کسی ظرف میں ہوا کا دباؤ معلوم کرنے میں استعمال کرتے ہیں تو یہ اعتقادی چیز تو ہو سکتی ہے لیکن علمی کلیہ نہ ہوگا۔ نادر تغیرات کیفی امور کی وضاحت نہیں کرتے وہ تو ہم کو محض یہ قیاس کرنے میں مدد دیتے ہیں کہ کمیتی طور پر وہ ناممکن الوقوع نہیں۔

وہ ذہنی کرتب جس کی بدولت انسانی دماغ نے خارجی دنیا کا ایسا نمونہ تیار کر لیا ہے جو فطرت پر عائد کیا جا سکتا ہے بہت حیرت افزا

اور شاندار ہے لیکن وہ ایک تحیر انگیز چارہ کار ہی رہے گا اور اس کا اطلاق غیر ذی حیات مادے تک ہی کام دے گا۔ جب برقی مقناطیسی تابانی (بوس۔ آئن سٹائن شماریات (BOSE-EINSTEIN STATISTICS) اور برقی توانائی (پالی۔ فرمی شماریات (PAULI-FERMI STATISTICS) پر اس کا اطلاق کیا گیا تو اہم تبدیلی اس میں کرنا پڑی۔

لہذا جب ہم نہایت ہی دلچسپ مظہر یعنی حیات اور بالآخر انسان کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں تو بقول ایڈنگٹن (EDDINGTON) کے ہم اتفاق کی ضد (ANTI-CHANCE) سے کام لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم کو ایک فریبی سے واسطہ پڑتا ہے جو بڑے درجوں کے اعداد یعنی شماریات کے ان ضابطوں کی جو زیرِ غور ذرات کی کوئی انفرادیت تسلیم نہیں کرتے باقاعدہ خلاف ورزی کرتا ہے۔

گزشتہ ابواب کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ اول تو ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ مادی دنیا کے متعلق جس قدر آگاہی کا ہم کو دعویٰ ہے اس سے فی الحقیقت ہم کم آگاہ ہیں نیز یہ کہ ہمارا علم داخلی ہے اور ہمارے دماغ کی ساخت سے متاثر ہے۔

اس کا احتمال ہے کہ جو ضابطے ہم نے وضع کئے ہیں وہ ایک تسلسل کی ترتیب اور اس تغیر کی کمیت کا اظہار کرتے ہیں جو نظامِ فطرت میں

ویسی ہی ترتیب اور ویسے ہی تغیر کے مطابق ہیں لیکن یہ بھی اُس وقت تک
صادق آتا ہے جب تک حیات کے وجود سے واسطہ نہ پڑے۔ کائنات
کی جو ذہنی تصویر ہم قایم کرتے ہیں اس میں ایسے خلا ہیں جو ہم کو یہ تسلیم
کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں کہ فطرت میں جس حسین یک رنگی کو دلیل
سے ثابت کرنے کی ہم سعی میں لگے ہوئے ہیں موجودہ علمی معلومات
کی بنا پر وہ ایک فلسفیانہ یا صاف یہی کیوں نہ کہا جائے کہ وہ ایک
جذباتی اعتقاد سے زیادہ کسی چیز کا نتیجہ نہیں۔ اگر ہم فطرت کی اس
وحدت اور یک رنگی کی حقیقت کو کبھی واضح کرسکے تو اس سے یہ ثابت
ہوگا کہ پیشتر اس کے کہ ہم عقلی مناہج تحقیق سے اس منزل پر پہنچنے
کے قابل ہوتے ہمارے وجدانی اور انسانی تصوّرات پہلے ہی اس
حقیقت کو پاچکے تھے اور اس لیئے ہم کو خلاف عقل وجدانی تصوّرات
کو بہ نظر حقارت نہ دیکھنا چاہیئے۔ اگر ہم یہ وحدت ثابت نہ کرسکے
تو اس سے یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ہمیں اپنے علم کو نئے سرے
سے مختلف بنیادوں پر استوار کرنا چاہیئے یا یہ بھی امکان ہے کہ
ثنویتی تصور کے نقطۂ نظر کو اختیار کیا جائے۔ اور چونکہ مدتوں پہلے
انسانی دماغ نے اس امکان کا تصوّر کر لیا اس لئے یہ دوبارہ ہم کو اور
ادراکی تخئیل کی قدر کرنا سکھائے گا۔

ثانیاً یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہمارے موجودہ معلومات کے سہارے اگر وہی منہاج تحقیق' جو غیر ذی حیات دنیا کی توضیح کرنے کے لئے مفید ثابت ہوئے ہیں' ذی حیات اجسام پر بھی استعمال کئے گئے تو فقط یہی نہیں کہ حیات کی تخلیق کی توجیہ یا توضیح کرنا ناممکن ہوگی بلکہ ان اجزا یعنی اعلےٰ درجے کے تشاکلی سالموں کے معرض وجود میں آنے کی بھی توضیح نہ ہو سکی جو حیات کی تعمیر کے لئے لابدی معلوم ہوتے ہیں۔

لہٰذا گو ہمارے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم اپنے علم پر پورا اعتماد کریں یہ احتیاط لازمی ہے کہ ہم اندھا دھند اس کی واقعی ہمہ گیری پر ایمان نہ لے آئیں۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہئے کہ دماغ کی عالی قوتوں سے ابھی تک ہم کما حقہ آگاہ نہیں ہوئے اور ممکن ہے کہ ہمارا معقولی طریق استدلال دماغ کی قوتوں میں سے ایک قوت ہو لیکن ممکن ہے اور قیاس میں آسکتا ہے کہ وہ باقی قوتوں سے زیادہ قابلِ اعتماد اور بہ عجلت صحیح نتائج اخذ کرنے والی قوت نہ ہو۔

۴

غیر نامی ارتقار کے ضابطے حیاتیاتی ارتقار کے ضابطوں کی تردید کرتے ہیں۔ کارنو کلاسیس (CARNOT - CLAUSIUS) کلیہ۔ جبر توے کا نقطۂ نظر آزاد قوتِ ارادی (FREEWILL) اور مادی طرزِ تفکر

جن موضوعات کے متعلق ہم نے اب تک لکھا ہے ان کو دیکھکر ممکن ہے کہ ناظر کو یہ تعجب ہو رہا ہو کہ کیوں ان کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے جبکہ بظاہر کتاب کے عنوان سے ان کا کوئی منطقی تعلق واضح نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمہید اس کو مطمئن بھی نہ کر سکی ہو۔

لیکن موجودہ باب جس میں ارتقار کی مجموعی حیثیت اور انسانی قوتِ ارادی کی آزادی سے بحث کی جائے گی اس کی سمجھ میں قطعاً نہ آتا اگر ہم نے اس سے پہلے کے تین باب نہ لکھے ہوتے۔ ان کی بدولت اس باب میں ہمیں اس فلسفیانہ اندازِ فکر پر بحث کرنے کا مناسب موقع مل جائے گا جس کو عرفِ عام میں مادہ پرستوں ،

کائنات کو ایک مشین ماننے والوں، عقلیت پسندوں، یا جس کو گاہے ماہے ملحدوں کا طرز استدلال بھی کہا جاتا ہے اور ہمارے لئے یہ واضح کرنا ممکن ہوگا کہ یہ اندازِ فکر اتنا علمی (SCIENTIFIC) نہیں جتنا اس کو بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ موجودہ علم ہماری رہنمائی اس امر کی طرف کرتا ہے کہ ہم مادّے کو ایسے لاانتہا جوہروں اور سالموں سے مل کر بنا ہوا تصوّر کریں جو عموماً بہت تیز رفتاروں اور قطعاً غیر مرتب حرکات کے ساتھ، جن کا انحصار محض بخت واتفاق پر ہے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ ان کی عملی سرگرمی کو واضح کرنے کے لئے ہم نے اس کے لئے "مکمل بے ترتیبی" کی متناقض اصطلاح وضع کی تھی۔

ہم ناظر کی توجہ اس پر بھی مبذول کر چکے ہیں کہ ہمارے علمی ضابطوں کا جواز فطرت کی اساس میں مکمل عدم نظام کو تسلیم کرنے کا متقاضی ہے۔ "اتفاق" کے نام نہاد ضابطوں کی صحت (جو ہمارے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق معتبر ہے) اس اعتماد کی رہین منت ہے کہ فطرت میں کوئی ایسے "جوہر" نہیں ہیں جن کو کوئی رعائتی امتیاز حاصل ہو (یعنی کسی مسئلہ زیر بحث کے نقطہ نظر سے) نیز یہ کہ ان تمام جوہروں کا رویہ یکساں طور پر غیر منظم اور پیش بینی کے قابو سے باہر ہے۔

موجودہ علم کی فتوحات عالیہ میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے کارنو کلاسیس (CARNOT-CLAUSIUS) کے اساسی کلیے کو احتمالیات کے احصار کے ساتھ مربوط کردیا ہے۔ یہ کلیہ حری۔ حرکیات کا دوسرا کلیہ بھی کہلاتا ہے (SECOND LAW OF THERMODYNAMICS)[1] اور غیر نامی دنیا کی توضیح میں بنیادی اصول کا کام دیتا ہے۔ انتالیسای کہ طبیعات کے ایک بڑے ماہر بولٹزمان (BOLTZMANN) نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ضابطے کی بدولت جو غیر نامی اور غیر تقلیبی ارتقا عائد ہوتا ہے وہ ایک ایسا ارتقا ہے جو روز افزوں ترقی کے ساتھ ایسی احتمالی حالتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے جن کی خصوصیت یہ ہو گی کہ کائنات میں موزونیت اور تناسب اشیا بڑھے گا اور توانائی ایک ہی سطح پر آجائے گی۔ لہذا کائنات کا رجحان ایک ایسے توازن کی حالت کی طرف ہے جس پر پہونچکر کائنات کے وہ سب تشاکل جو آج موجود ہیں ہموار ہو جائینگے سب حرکت ختم ہو جائے گی اور جس میں مکمل ظلمت اور

---

[1] اس کلیے کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں "ہر مادی نظام جو کسی دوسرے نظام سے متاثر نہ ہو کبھی دوبارہ ویسی ہی حالت پر واپس نہیں آتا جو اس پر پہلے گزر چکی ہو۔ بعد میں آنے والی حالت میں اس کی ممکن الحصول توانائی کا ایک ناطق حصہ کم ہوتا جاتا ہے" (از مصنف)

مطلق برودت کا دور دورہ ہو گا۔ نظری طور پر تو یہی انجام کائنات نظر آتا ہے۔

مگر اب صورت حال یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر بسنے والے انسان ایک مختلف قسم کے ارتقا کے شاہد ہیں اور وہ ذی حیات ہستیوں کا ارتقا ہے۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ احتمالیات کے ضابطے اپنی موجودہ صورت میں حیات کی تخلیق کی توجیہ کرنے سے عاجز ہیں بلکہ اب تو ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سوائے اس ارتقا کے جو مسلسل زوال پذیر تشاکلی احوال کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ کسی دوسری نوعیت کے ارتقا کے امکان ہی کے منکر ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ حیات کے ارتقا کی تاریخ باقاعدہ تشاکلی احوال کی ترقی کی شاہد ہے اور اس ترقی میں ذی حیات اجسام کے تعمیری اور تفاعلی دونوں قسم کے احوال شامل ہیں۔ مزید براں اس رجحان کو کسی ایسے نادر الوجود تغیر کا نتیجہ بھی نہیں قرار دے سکتے جس کو شماریات کے اصول ختم کرنے کے متقاضی ہوں کیونکہ یہ دس کروڑ (جو کرہ ارض کی احتمالی عمر ہے) برس سے زائد مدت سے بالاستقلال رونما ہو رہے ہیں اور عظمت و شان کے ساتھ انسان کے وضع کردہ ضابطے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فطرت کی حسن ترتیب قرنوں کے امتداد میں بالآخر انسانی دماغ کی تخلیق کے معراج پر پہنچی ہے۔

آج مادیت کے راہ میں یہ مہیب تخالف ایک ناقابلِ عبور سدِ راہ ہے۔ اس تخالف سے بچ نکلنے کے لئے صرف ایک ہی دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حیات بحیثیت مجموعی اور اس کا ارتقاء جس میں انسانی قوتِ فکر کا نمودار ہو جانا بھی شامل ہے ایک ناقابلِ لحاظ تغیر سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن یہ دلیل کتنی رقت انگیز ہے! بالخصوص اس لئے کہ غیر نامی ارتقاء کا تخیل تو دراصل انسانی دماغ کی حال ہی کی اختراع ہے درانحالیکہ حیات کی ارتقاء ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تائید مشاہدوں کے ایک وسیع سلسلے سے ہوتی ہے جیسے پتھر میں بدلی ہوئی حیات کے آثار (FOSSILS) ہمارا اس سے یہ مقصود نہیں کہ وہ عظیم الشان دماغی سرگرمی جس نے غیر نامی ارتقاء کے تصور اور تدوین کی طرف رہنمائی کی اسکو خارج یا نظرانداز کر دیا جائے بلکہ محض یہ بتانا منظور ہے کہ اسے "ناقابل لحاظ تغیر" کے آخری شاہکار یعنی انسانی دماغ کا ایک شاندار کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔

لہذا حیاتیاتی ارتقا کو غیر نامی ارتقاکے تابع کرنے کی کسی کوشش کو استخراجاً (APRIORI) علمی یا فلسفیانہ دلیل نہیں خیال کیا جا سکتا۔ پھر یہ ایسی دلیل بھی نہیں جسے انسانی عقل قبول کرلے۔ قدیم خیالات کا مادہ پرست جو خلوص کے ساتھ باور کرتا ہے کہ انسانی زندگی کا نہ کوئی سبب

ہے اور نہ کوئی منزلِ مقصود اور انسان لا حاصل قوتوں کے گرداب میں گرفتار مادّہ کا ایک بری الذمہ ذرّہ ہے ہمیں ممتاز فلسفی وائٹ ہیڈ (WHITEHEAD) کے اس مسرت بخش قول کی یاد دلاتا ہے "جو حکما (SCIENTISTS) اپنی زندگیاں اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے صرف کر دیتے ہیں کہ زندگی کو بے مقصد ثابت کریں ان کی ذات تحقیقاتِ علمی کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہے۔"

آج ممکن نہیں کہ حیات کے ارتقا کی توضیح محض بخت و اتفاق کے بل بوتے پر کی جا سکے۔ اتفاق کا نظریہ انسان اور اس کی نفسیاتی سرگرمیوں کو دیگر اشیاء کے عمومی سانچے میں شامل کر لینے کے لئے جواز نہیں پیدا کرتا اور نہ ہی وہ حیات کی مختلف شکلوں کی تدریجی اور صعودی ترقی کو واضح کرتا ہے بلکہ وہ اس ترقی کا منکر بھی ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ اتفاق کے نظریے کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے مفروضے کو آزمانا چاہیئے۔ صرف ایک ہی مفروضہ اور ممکن ہے اور وہ ارتقاالی الغایت کا مفروضہ ہے۔

بدنصیبی سے ارتقاالی الغایت (FINALISM) کے مفروضے کو بہت سے پر خلوص سائنس دان بھی سمجھنے سے قطعی قاصر رہے ہیں اور اس کی ایسی غلط تصویر پیش کی ہے کہ بہ حیثیت ایک نظریئے کے وہ مبراہر

ایک پارینہ خیال معلوم ہوتا ہے اور یوں پیش کرنے کا نتیجہ انصافاً ہونا بھی بھی چاہیئے تھا عموماً ان مصنفوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ ارتقا الی الغایت کو انواع موالید (SPECIES) تک محدود تصوّر کرلیا۔ ان کے ہاں ماحول سے متاثر ہوکر کسی نوع کے کبھی عجیب الخلقت نوع میں تبدیل (PRODIGIES OF ADAPTATION) ہوجانے پر توسیر حاصل بحثیں ملتی ہیں لیکن اس سے بڑے مظاہر یعنی بڑی بڑی صنفوں کے استحالے (TRANSFORMATION) کا کھوج تلاش کرنے کا کہیں پتہ نہیں چلتا جیسے فائلے[1] (PHYLA) جماعتیں اور طبقات۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ارتقا کے حقیقی مسئلے کی جب کوئی توضیح نہ بن پڑی تو ان مظاہر کو غیر اعتباری قرار دے دیا گیا اور یوں ارتقا الی الغایت کا مفروضہ تقریباً ساقط الاعتبار ہوکر دفن ہوگیا۔

یہ تو ہماری بھی رائے ہے کہ ایسی صورت میں مفروضے کا یہی حشر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمارا اس پر بھی ایمان ہے کہ اسی مفروضے کو دوسری شکل دے کر توانائی پہونچائی جاسکتی ہے اور پہونچانی چاہیئے۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ارتقاء کا ابتدا سے موجودہ حالت تک پورا

---

[1] فائلا (PHYLA) حیوانات یا نباتات کی قلمرو کے اہم ذیلی طبقے کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

جائزہ لیں یعنی ارضیاتی قرنوں (GEOLOGICAL PERIODS) کے لا انتہا طویل مدت پر یہ جائزہ مکمل طور پر حاوی ہو۔ ہمیں سردست ارتقا کے تفصیلات ۔ ترتیب اور ترکیب کو، جن کے متعلق ہمیں بہت ہی کم آگاہی ہے، نظرانداز کر دینا چاہیئے اور تخلیق کے عظیم المرتبت عمل پر بحیثیت مجموعی غور کرنا چاہیئے اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ اس کی غیر متحرک اور ساکن حالتوں کو سامنے رکھ کر، بلکہ اسے متحرک عمل سمجھ کر یہ امر پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ارتقا بالاستقلال استحالوں کے تواتر کا نام ہے۔ ہمیں پوری احتیاط کے ساتھ خاص خاص انفرادی صورتوں میں الجھے بغیر اپنی نگاہ کو نہایت ہی ابتدائی جسم نامی (ORGANISM) سے لے کر انسان تک اور اس سے ایک قدم آگے انسان کے دماغ کے حیرت انگیز ظہور تک ارتقا کے اساسی طریق عمل پر ہر وقت جمائے رہنا چاہیئے۔

کسی عالی شان کلیسا کی عمارت کے متعلق صحیح رائے جبھی قائم کی جا سکتی ہے جب ہم اس کا ذرا فاصلے سے معائنہ کریں۔ قریب سے دیکھنے پر یہ تو ممکن ہے کہ ہم اس میں نصب شدہ مجسموں، وتیع بھاٹکوں اور تزئینی سامان کا نظارہ تو بہتر کر لیں لیکن وہ عمومی تاثر جو کلیسا کا ماہر فن معمار آپ کے قلب میں پیدا کرنے کا خواہشمند تھا اس سے آپ محروم رہ جائینگے وہ کیفیت تو دور ہی سے دیکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ارتقا کے عمل کو سمجھنے

کے لیے ہمیں زمانی بعد کی ضرورت ہے۔ قرنہا قرن کے امتداد زمانی کو سامنے رکھنا ہوگا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کا مطالعہ ایک متحرک چیز سمجھ کر کرنا ہوگا۔

کسی متحرک تصویری فلم کا معائنہ دو مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کبر شیشے کی مدد سے فلم کی ہر ایک تصویر کو علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے یہ سکونی طریقہ ہوگا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پوری فلم کا سینما کے طریق پر ایک پردے پر عکس ڈال کر متحرک تصویریں دیکھی جائیں بہت ممکن ہے کہ پہلے طریقے کو اختیار کرنے سے ہمیں بعض ایسی دلچسپ جزیات معلوم ہو جائیں جو دوسرے طریقے پر دیکھنے سے نظر انداز ہو جائیں لیکن چونکہ حرکت کا تاثر اس میں نہیں اس لئے تسلسل نگاہ سے اوجھل ہو جائے گا اور ارتقا کے پورے ناٹک کے اہم ایکٹروں کے انداز ہم نہ سمجھ پائیں گے۔ ان کا سکون ان کے انداز کے مفہوم کی ہلاکت کا موجب ہو جائے گا۔ ارتقا کا عمل ہمارے سامنے ایک نامکمل فلم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بہت سے ٹکڑے بیچ میں سے غائب ہیں۔ تاہم اس کی موجودہ حالت سے ہم واقف ہیں اور اس کی ماضی کے بھی چند صورتیں اچھی خاصی محفوظ حالتوں میں ہمارے پاس ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہماری قوت متخیلہ حتی الامکان احسن طریق پر ان میں ربط پیدا کرے۔

کووئے (CUVIER) اور لامارک (LAMARCK) نے
انیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں صبر آزما اور محتاط کوشش سے جو مولد
یعنی اگلے زمانے کے پتھروں میں تبدیل شدہ زندگی کے آثار جمع کرنا شروع کیا اور جس قابل
ستائش طریق پر اس کو مدون کیا اس سے عمل ارتقا پر غور کرنے کے لئے کافی
سرمایہ آثارِ قدیمہ کا جمع ہوگیا ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔
ضرورت اب اس کی ہے کہ ارتقا کے عملی طور طریقوں اور اس کے میکانیکی انداز
کی توجیہ کرنے میں انسانی شخصیت سے متصف کرنے والے خیالات
(ANTHROPOMORPHIC IDEAS) سے ہم بچیں یعنی ان خیالات سے
جو انسانی تجربے یا انسانی طرزِ خیال سے مستعار لئے گئے ہوں۔
انسان ہمیشہ سے اس بات کا حریص ہے کہ وہ ہر علمی مسئلے کو اپنے انداز
فکر اور اپنے ردِ عمل سے ملوث کرے۔ مثلاً حشرات الارض کی نفسیات پر بحث
کرتا ہے تو اس کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ یکساں حالات میں خارجی مہیجات کا
جو ردِ عمل ان پر ہوتا ہے اس کو اپنے تاثرات سے موازنہ کرتا ہے اور وہ یہ
حقیقت اکثر فراموش کرجاتا ہے کہ نہ تو حالات ہی کبھی یکساں ہوتے ہیں
اور نہ ہی اس کو اس سے کافی آگاہی ہے کہ حیوانوں کی عضویاتی ساخت
کی بدولت جو تاثر خارجی مہیجات کا ان پر ہوتا ہے اس کی ماہیت کیا ہے
اور یہ آگاہی کبھی حاصل ہوگی بھی نہیں۔

اگر ہاتھی کی جلد کی کسی دراز میں بسنے والے جرثومے کو وہی فہم و فراست نصیب ہوتی جو ہمیں ہے اور اس کو اپنے آباد اجداد کا مرتب کردہ کوئی نظام علم بھی ورثے میں پہونچا ہوتا جیسا کہ دس نسلوں سے کم مدت میں ہمیں پہونچا ہے تو یہ امر قرین قیاس ہے کہ اسے ان ضوابط کا جو اس کی کائنات یعنی ہاتھی میں عمل پیرا ہیں کوئی واضح تصوّر نہ ہوسکتا۔ اس جرثومے کی بود و باش تو ایک ایسی وادی میں ہے جس کا عمق ایک انچ کا پانچواں حصہ ہے اور یہ وہ وسعت ہے جو ہماری دنیا اور جرثومے کی دنیا کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی سات ہزار فٹ گہرے غار کے برابر ہے۔ جرثومے نے اپنی وادی میں رہ کر اپنی دنیا کا ممکن ہے کوئی ایسا تصوّر قایم کیا ہو، جو ہمارے تصور سے بالکل جداگانہ ہو، اور جب کبھی ہاتھی اپنے آپ کو کھجلائے یا نہلائے تو وادی کا باشی خرد بینی جرثومہ اگر ان عظیم طوفانوں کے متعلق، جن کی پیش بینی اس کے لئے ناممکن ہے، کوئی کلیتاً مختلف علت تجویز کرے تو وہ قابل معافی ہے۔ جرثومے کے نقطۂ نظر کو نظر انداز ہی کرنا پڑے گا جس کے چوبیس گھنٹے کا ایک دن ہماری ایک صدی یا چار نسلوں کی مدت کے برابر ہے۔

جس عمل ارتقا سے ہم وابستہ ہیں اس کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ تو اس افسانے کا صرف ایک باب ہے جس کا آغاز ایک مدت مدید پہلے ہوا تھا۔ اس ارتقا سے پہلے غیر نامی ارتقا کا دور دورہ

رہا، جس میں متذکرہ بالا کار نو کلاسیس (CARNOT-CLAUSIUS)
ضوابط عمل پیرا رہے، اور جو اب بھی ہمارے گردوپیش جاری ہے۔
اس سے بھی پہلے ایک زمانہ ایسا گزر چکا تھا جب ابھی جوہر اور سالمے
بھی کتم عدم میں تھے اور جس دور کے متعلق ہم بہت کم بلکہ کچھ نہیں
جانتے۔ کیونکہ یہ واقعہ ۱۰ سال پہلے کا ہے یا شاید اس سے کچھ کم مدت کا
لیکن موجودہ علمی تحقیقات کے حساب سے ۱۰ سے زیادہ نہیں۔ یہ پہلا ارتقاء
(معلوم نہیں ہم اسے ارتقا کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں) جوہرات۔ برقیوں
(ELECTRONS) مرکزیوں (PROTONS) وغیرہ کا ارتقا تھا
اور اس میں بظاہر ان ضوابط کا عمل دخل نہ تھا جو دوسرے ارتقا کے
دور میں عمل پیرا تھے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جوہروں اور سالموں
کی دنیا ایک غیر منقلبی دنیا ہے جس میں آگے بڑھ کر انہیں قدموں پر
جست ناممکن ہے۔

اگر ہم اپنی کائنات کو اور جہانوں سے الگ تھلگ مانیں یعنی کسی
اور جہان سے وہ متاثر نہیں تو ہر واقعہ اور ہر مظہر فطرت اس کائنات
کی ازلی توانائی (یعنی ممکن الحصول قوت کے سرمائے کو گھٹاتا چلا جاتا ہے
اگر یہ کائنات الگ تھلگ نہ ہو تو صریحاً یہ توانائی کی کمی کسی اور نظام
کائنات سے مستعار لے کر پورا کرتا رہے۔ توانائی کے اس تدریجی زوال

پذیری کے دوران میں ازلی ترتیب یعنی وہ تمام تشاکلات جنکی بدولت توانائی "کام" کی صورت میں ممکن الحصول ہوتی رہی ہے ایک مکمل اور مطلق بے ترتیبی یعنی تشاکلوں کے فقدان میں مبدل ہوتی چلی جارہی ہے۔ ممکن الحصول توانائی کے اس تکمیلی جزکو جو دوران عمل میں ضائع ہوتا چلا جارہا ہے ناکارگی (ENTROPY) کہتے ہیں۔ اور اس کو بے ترتیبی کا معیار یا پیمانہ تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

لہذا ہم، ارتقاؤں کے ایک ایسے ارتقاء کے وجود کو تسلیم کرسکتے ہیں جو زمان کی اتنی لا تعداد قرنوں سے جاری ہے، جس کا تصوّر میں لانا بھی انسان کے لئے محال ہے۔ لیکن ہمیں تو صرف اپنے ہی ارتقاء اور اپنے ہی مسائل سے غرض ہے۔ جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں یہ واقعہ کہ حیاتیاتی ارتقا غیر نامی ارتقا کے بنیادی ضابطے کے تحت جاری نہیں ہے، صرف اسی حد تک ہماری دلچسپی کو انگیز کرتا ہے، کہ اس کی بدولت ہماری اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ سائنس اب تک ان دو ارتقاؤں کا باہمی ربط تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کی بدولت آگے چل کر خود حیاتیاتی ارتقا میں ایک نئے انحراف کو تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا یعنی انسانی دماغ میں ضمیر کے ظہور کو۔

اس کے علاوہ ایک نمایاں آویزش اور ہے جو مادہ پرستوں اور روحانیت کے ماننے والوں کے درمیان بہت کچھ مناظرے کا باعث ہے اور یہ ہے مسئلۂ جبر و اختیار۔ یہ تو بالکل عیاں ہے کہ مذہبی گروہ اور تمام وہ لوگ جو انسان کو محض ایک حیوان یا ایک ضخیم مگر بے مقصد مشین کا غیر ذمہ دار پرزہ نہیں سمجھتے، آزاد قوتِ ارادی کے لزوم علی الاطلاق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس کے برعکس یہ بھی ظاہر ہے کہ خالص مادہ پرست جس کا ایما بخت و اتفاق پر ہے اور جس کی کوششوں کا رجحان علم کو متحدہ صورت میں پیش کرنا ہے یعنی کل مظاہرِ فطرت (بشمول حیات و قوتِ فکر) کے لئے کوئی ایک اساس ڈھونڈ نکالنا ہے کبھی کسی ایسے عنصر کے وجود کو تسلیم نہ کرے گا جو اس کے اس آراستہ پیراستہ سیدھے سادھے تصور کو کہ کائنات ایک مشین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی درہم برہم کرکے رکھدے۔

اب ہمارے سامنے دو مسلک ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لیکن مادہ پرست کے دلائل کا ضعف اس میں مضمر ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے دلائل کے معقول اور علمی ہونے پر ناز کرتا ہے وہ بسا اوقات اپنی تردید خود کر دیتا ہے اور یوں اس کا اعتقاد

روحانیت کے قائل سے کچھ کم جذباتی نہیں ہوتا جو کم از کم اپنے جذباتی ہونے کو تسلیم تو کر لیتا ہے۔

جبری کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے اکثر مندرجہ ذیل تمثیل کام میں لایا جاتا ہے ممکن ہے کہ وہ پتھر جسے اوپر ہوا میں پھینکا گیا ہے اپنے آپ کو با اختیار سمجھے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ضابطہ کشش ثقل کا وہ پابند ہے اس لئے وہ آزاد شمار نہیں ہو سکتا۔ بعینہ انسان خیال کرے کہ وہ آزاد ہے لیکن ایک مبصر کے نزدیک جس کو اشیا کا عمیق علم حاصل ہے یہ آزادی کا احساس کوئی حقیقت نہیں رکھتا وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ انسان خارجی حقیقت کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں اسلئے یہ احساس محض ایک داخلی فریب وہ تاثر کا نتیجہ ہے۔

ہم اول تو یہ بتا دیں کہ اس فرسودہ دلیل کا تعلق اس زمانے سے ہے جب لاپلاس (LAPLACE)[1] کا پرانا عقیدہ جبر مسلمات میں سے تھا۔ ہمکو یہ بھی معلوم ہو کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب ایک شماریاتی عقیدۂ جبر نے اس پرانے عقیدے کی جگہ لے لی تھی۔ شماریاتی عقیدہ جبر کی روح رواں محض بخت و اتفاق ہے لیکن اس میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ایسے تغیرات کا نظری امکان ضرور ہے جو بالآخر شماریاتی ضابطے کی تردید کرتے ہیں

---

[1] لاپلاس مشہور عالم فرانسیسی ہیئت داں اور ماہر ریاضیات (۱۷۴۹-۱۸۲۷) (مترجم)

اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ پتھر ممکن ہے نیچے نہ گرے اگرچہ عملاً کبھی ایسا نہیں ہوا۔ مزید براں یہ واضح ہے کہ فلسفیانہ دلائل سے یہ تمثیل مغالطہ دہ اور ناقص ہے۔ جن دو واقعوں سے "تمثیل" قائم کی گئی ہے وہ متوازن نہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ تو صریحاً یک جہتی (UNNOCAL) ہے (پتھر کی حرکت) اور دوسرا ذو جہتین (EQUIVOCAL) ہے (انسان کے افعال)۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پتھر کا "خیال" جو کچھ بھی ہو ہم باہر سے مشاہدہ کرنے والے یہ تجربتاً جانتے ہیں کہ پتھر مجبور ہے کیونکہ ہمارے مشاہدے میں کبھی کوئی ایسا پتھر نہیں آیا جسنے کشش ثقل کے کلیئے کی حکم عدولی کی ہو۔ بالفرض اگر پتھر "فکر" کی طاقت رکھتا بھی ہو تو وہ اس نتیجے پر پہونچ چکا ہوگا کہ وہ ہمیشہ بالآخر زمین پر گر پڑنے کی حالت کو ہی اختیار کرتا ہے۔ اس کو وہ اپنا "اختیار" سمجھ لے یا "پابندی" کچھ فرق نہیں پڑتا۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ وہ کبھی کلیے کے خلاف جانا اختیار نہیں کرتا۔ آج تک کا مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ ایک ہی امکانی صورت ہے۔ اس لئے یہ مظہر یک جہتی ہے۔

اس کے برعکس آیئے انسان کی حالت پر غور کریں۔

انسان کے نقطۂ نظر سے اور اس کے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق اس کا ہر فعل اس طرح پر واقع ہوتا ہے گویا اسے اختیار ہے کہ

چاہے تو وہ اپنی حیوانی جبلتوں کی پیروی کرے جس سے اس کو بہت کچھ جسمانی لذت حاصل ہو اور چاہے وہ ان لذائذ جسمانی کو حقیر سمجھ کر ان سے منہ موڑ لے اور کسی اور مطمح نظر کی تلاش میں لگ جائے مثلاً ان اقدار کے اکتساب میں سعی کرے جن کو ہم اعلےٰ انسانی اور روحانی اقدار کہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس منزل مقصود کے حصول میں اسے اپنے حیوانی نفس سے جنگ کرنا پڑتی ہے اور باوجود اس کے کہ بالآخر یہی جنگ بہت سی بہترین مسرتوں کا باعث بن جاتی ہے اکثر اس میں اسے بہت دکھ اور اذیت اٹھانا پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف انسان ہی کے لئے یہ دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ عقلی دلائل سے اور انسان کے داخلی تاثرات کے بلالحاظ ان دو ممکن راستوں کے فرق کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اگر دونوں راستوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تو جیسا کہ "چت اور پٹ" کے کھیل میں ہوتا ہے دونوں راستوں کے اختیار کرنے کا احتمال برابر ہوتا۔ اور اس صورت میں دونوں راستوں پر چلنے والے انسانوں کی تعداد تقریباً برابر ہوتی اور یہ تجربتاً غلط ہے۔ لہٰذا دونوں راستوں کا احتمال برابر نہیں اور اس لئے دونوں میں فرق ہے۔ ثابت ہوا کہ انسانی افعال قطعی طور پر دو جہتیں ہیں۔

نتیجتاً مشاہد کو مصمم ارادہ کر لینا چاہیئے اور فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا

انسانی ارتقا کو حیوانوں کی قایم کردہ روایات کی پیروی کرنا ہے یا انسانی
روایات کی۔ احتمال تو یہی ہے کہ انسان اس راستے کو اختیار نہ کرے گا
جو اسے اخلاقی اور بالصراحت انسانیت کی ترقی کی منزل مقصود کی طرف
رہنمائی کرے کیونکہ انسانی اکثریت مخالف سمت پر جاتی ہوئی دکھائی
دے رہی ہے۔ وہ اغلباً یہی فیصلہ کرے گا کہ ارتقاء کا واحد اور صرف
حقیقی راستہ وہی ہے جس پر وہ اب تک گامزن رہا ہے یعنی عضویاتی
اور اعضائی ارتقاء کا راستہ۔ دوسری امکانی صورت (اخلاقی ارتقا)
محض ایک "تغیر" سمجھی جائے گی جس کا پہلی قسم کی ارتقا پر کوئی اثر نہ ہوگا۔
لیکن تغیر تو کوئی جبری صورت نہیں۔ وہ تو اپنی تعریف کی بنیاد پر
ہی کلیتاً بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ
انسان کو اس کا علم ہے کہ اس کو ہمیشہ اس گوگو کی حالت سے سابقہ
پڑتا آرہا ہے کہ یا تو حرص و ہوا کی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دے
یعنی اپنی جبلت کی ترغیبات کے حکم کی تعمیل کرے یا ان خواہشات کا مقابلہ
کرے اور دوسری ترغیبات کے ارشاد کی تعمیل کرے جو عضویاتی نہیں
اخلاقی ہیں اور جو اول الذکر تحریصات کی تردید کرتی ہیں۔ کوئی صاحبِ
ہوش و حواس اس "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" حالت کا منکر نہ ملے گا۔
اصل سوال یہ ہے کہ آیا انسان اپنی قوتِ اختیار کو اصول کی شکل میں

منضبط کرکے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں آزاد ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں کہ اس کا رجحان جبری نہیں ہے تو دوسری صورت تو صرف یہی رہ جاتی ہے کہ وہ آزاد ہے۔

یہ کہنا کہ جب اس کے سامنے دو امکانی صورتیں آتی ہیں تو انہیں سے اس کا ایک کو اختیار کرنا محض اتفاقی امر ہے اس وقت تک عقلاً نامقبول اور بودا دعویٰ ہے جب تک ہم اس کے اخلاقی اور روحانی رجحان کو محض ایک تغیر قرار دیتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ جو "تغیر" بیس یا تیس ہزار برس کی مدت سے قایم ہے اور باقاعدگی کے ساتھ اپنا اعادہ کرتا آرہا ہے اسے "تغیر" نہیں خیال کیا جا سکتا بلکہ ایک نمایاں خصوصیت کا حامل مظہر فطرت سمجھا جانا چاہیئے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل بعید میں ان دونوں گروہوں میں سے یعنی حیوانی رجحانات والا یا روحانی رجحانات والا کون سا گروہ قایم رہے گا اور کون سا صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے گا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا ہمارا مفروضہ مشاہدہ کا بھی نہیں۔ یہ امر کہ آج دوسرے گروہ کے افراد کی فی صدی تعداد کم ہے ہم کو یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ثابت نہیں کرتا کہ بنی نوعِ انسانی کا یہی گروہ حقیقی ارتقائی مقصود ہے کیونکہ ارتقا کی کہانی یہی ظاہر کرتی ہے کہ ارتقائی قراول عموماً ایک قلیل تعداد

افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جیسے کہ نام نہاد انقلاب نوعی سے وجود میں آنے والی صورتیں۔ ناظر کو بعد میں آنے والے ابواب میں اس واقعہ کی مثالیں ملیں گی۔ اس لئے وہ مفروضہ جس میں ہم "تغیر" کو ہی ارتقا کا مرکزی رجحان قرار دیں خارج از بحث نہیں ہے۔

لہذا علمی استدلال کے مطابق آزاد قوت ارادی کا وجود نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ یہی ایک قابل قبول مفروضہ باقی رہ جاتا ہے۔ بنا بریں انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس "تغیر" کو جو پچاس ہزار یا ایک لاکھ برس پہلے کبھی بخت و اتفاق ہی کی بدولت وجود میں آیا ہو، ایک ایسے ضابطے میں بدلے کہ وہی بالآخر ارتقاء کا عمومی ضابطہ بن جانے کے "قابل ہو جائے۔ اور یہ صرف آزاد قوت ارادی کی بدولت ہی حاصل ہو سکتا ہے اور یہی اس نئے ارتقا کا بڑا آلۂ کار بھی ہوگی۔

انسانیت کے نقطۂ نظر سے' لاکلام' معاملات کچھ پیچیدہ نہیں تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ فرض کی انجام دہی کے راستے پر گامزن ہونا کتنا مشکل ہے اور دوسرے راستے پر چلنا کتنا سہل اور خوش گوار ہے۔ بعض انسان ہر قیمت پر اپنے نصب العینوں' اور اپنے "تغیر" کو کامیاب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی جدو جہد کی واقعیت سے بخوبی آگاہ ہیں کیونکہ انکے

پیش رو ہم خیال لوگوں کی المناک داستانوں سے زیادہ واقعی چیز اور کیا ہوگی جنہوں نے اپنے نصب العینوں کی خاطر دکھ سہے اور جانیں تک قربان کر دیں۔ لیکن باوجود اذیتوں اور صعوبتوں کے جو ان کو برداشت کرنا پڑیں وہ کثیر التعداد گروہ انسانی کے مقابلے میں خوش و خرم ہیں اور ان کو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔ ہمارے حیوانی آبا و اجداد نے تو اپنی جانیں بچانے کے لئے جد و جہد کی، انسان کے بلند تر مقد پر ایمان لانے والے اپنے اس یقین کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ اگر صدیوں کی مدت میں ایسے جاں فروش اپنے جیسے نصب العینوں سے فیضان یافتہ لوگوں کی زبردست اکثریت سے دنیا کو آباد کرنے میں کامیاب ہوگئے تو کوئی اور "مشاہد" یہ فیصلہ دے گا کہ نام نہاد عیسائیت کی تلقین کردہ اخلاقی خوبیاں ہی حقیقت میں ارتقائی ضابطوں کی منزلِ مقصود تھیں۔ اور یہی ہمارا عقیدہ ہے۔

مصنف اتنا بھولا نہیں کہ اس کو یہ وہم ہو کہ یہ بحث کسی مادہ پرست کو قائل کر دے گی۔ جن لوگوں کا اعتقاد پختہ ہو ان کو محض الفاظ اور منطق قائل نہیں کر سکتے۔ لیکن جن لوگوں کا اعتقاد نامعقول ہو اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم یہ بات مادہ پرستوں کے بارے میں واضح کر چکے ہیں، وہ عقلی دلائل کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے کیونکہ الفاظ جو دلائل

ہیں استعمال کیے جاتے ہیں ان کے مطالب ہمارے نزدیک اور ہوتے ہیں اور ان کے نزدیک اور۔ ہم تو اخلاقی اور روحانی اقدام کا ذکر کرتے ہیں اور ان اقدار کو بہ لحاظ انسان برقیہ سے زیادہ حقیقت کا حامل سمجھتے ہیں درآنحالیکہ وہ ان اقدار کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور مادی دُنیا جسے ہم محض ایک ذریعہ یا حیلہ خیال کرتے ہیں ان کا اسی پر پختہ ایمان ہے۔ فی زمانہ جوہری قوتوں کے انکشاف کی وجہ سے جب نسل انسانی کی مکمل اتلاف کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے، تو لوگوں نے محسوس کرنا شروع کیا ہے کہ اس خطرے سے اثر آفریں تحفظ فقط زیادہ سے زیادہ اخلاقی ترقی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ انسان اپنی عقل و فراست کی کارکردگی سے ہراساں ہے۔ اور متحیرانہ یہ سوچنے لگا ہے کہ آیا وہ راستہ جو اس نے اختیار کیا تھا وہ صحیح راستہ ہے۔

ارتقا اور آزادی یا آزاد قوتِ ارادی کے متعلق میکانکی اندازِ فکر پر بحث کرنے سے ہمارا مقصود یہ دکھلانا تھا کہ مادہ پرست جس کو اپنے نہایت باضابطہ اور علمی استدلال پر ناز ہے اپنی پیشہ ورانہ دلائل میں خطا سے مبرا نہیں۔ بے شک یہ تو قرینِ قیاس نہیں کہ وہ اپنی غلطیوں یا آویزشوں کو علی الاعلان تسلیم کرلے لیکن یہ سب کو پتہ چل جانا چاہیے

کہ وہ اپنے معتقدات کی اساس زیربحث کو باضابطہ معقولی فکر اور علمی واقعات پر قایم کرنے کا دعوے کرنے کے اب قابل نہیں رہا۔

اب ہم اس کرۂ ارض پر حیات کے ارتقا کا فسانہ شروع کرینگے اور ہمیں توقع ہے کہ ہم ناظر کو یہ باور کرا سکیں گے کہ جب تک ہم ارتقا الی الغایت کا نقطۂ نظر نہ اپنائیں گے اُس وقت تک حیات کا ارتقا مکمل طور پر ہمارے فہم کی دسترس سے باہر رہے گا۔ لیکن اس کے لئے ہم فلسفۂ غایات کے مفروضے کو اپنے لئے شمع راہ بنائیں گے یعنی ایک ایسا عقیدہ غائیت جس کی انتہا کسی مقصود بالذات غایت پر ہو۔ اور اگر ہم کو اجازت دی جائے تو ہم ایک جدید اصطلاح "دور رس غائیت" اس کے لیئے وضع کریں۔

کتاب (۲)
حیات کا ارتقاء

(۵)

زمین کی عمر۔ ارتقا کا جنم۔ بے جنسی یا بے ازدواجی (ASEXUAL) تناسل اور "موت کا اختراع"۔ حیوانات کا ارتقا نباتات کے ارتقا سے زیادہ سریع ہوتا ہے۔ درختوں یا جانوروں کی پتھروں میں تبدیل شدہ صورتوں (FOSSILS) کا حالت تحفظ میں ملنا۔ عبوری یا عارضی صورتیں۔

کرۂ ارض پر حیات کی تاریخ کا آغاز کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں ان مناہج تحقیق کے متعلق بیان کردی جائیں جو ہمارے کرۂ ارض کی عمر اور ارضیاتی ادوار (GEOLOGICAL PERIODS) کی قدامت کو متعین کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ حیوانوں کی بعض انواع جو اربوں سال پہلے زمین پر نمودار ہوئیں زیر بحث آئینگی اور ناظر کا یہ حق ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کس سند اور کن مناہج تحقیق کی بنا پر یہ اعداد و شمار تسلیم کیئے گئے ہیں۔

حال کی تازہ ترین اور قابلِ وثوق ماخذوں کے مطابق زمین کا جنم تقریباً اُسی وقت ہوا جب سورج اور نظام شمسی کے اور سیاروں کا ہوا۔ ہماری زمین کی عمر قریب قریب دو ارب ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ برس ہوگی اور کسی طرح پر بھی اس سے کچھ زیادہ عمر اس کی نہیں۔ جہاں تک کہ سورج کی پیدائش کا تعلق ہے تو یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کو معرض وجود میں آئے ہوئے ۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰ سال (ملنی (MILNE)[1] سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس کی عمر اس سے بہت کم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم نظامِ ثوابت۔ گچھے دار نظام ثوابت (CLUSTERS) اور کہکشاؤں پر غور کرتے ہیں تو شہادت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے نظام کی ماضی اس سے بہت کم ہے۔ بقول ایڈنگٹن (EDDINGTON) یہ بالکل قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ نظام شمسی کا جنم ایک ارب (۱۰۹) سال سے زائد پہلے کا ہو۔

زمین کی عمر تاب کاری یا شعاع پاشی (RADIO ACTIVITY) کے مطالعے سے کافی صحت کے ساتھ محسوب کی جاسکتی ہے اس طریقہ کار کا ضروری خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے:-

---

[1] ایک سائنس داں کا نام ہے جس نے حساب لگاکر سورج کی عمر کا اندازہ لگایا۔ (از مترجم)

یہ معلوم ہے کہ سادہ مفردات (ELEMENTS) میں سے کچھ ایسے ہیں جن پر خود بخود عمل انتشار واقع ہوتا رہتا ہے۔ جوہری مغز یا نواۃ (NUCLEUS) اپنا کچھ حصہ خارج کرتا رہتا ہے اور یوں ایک نئی فردیت حاصل کر لیتا ہے جو بلحاظ کمیّت یا بلحاظ اپنے برقی بار یا بلحاظ ہر دو اس کی پہلی فردیت سے مختلف ہوتی ہے۔ تقریباً ۴۰ ایسے جوہر دریافت ہو چکے ہیں جن میں یہ عمل انتشار طبعی طور پر ہوتا رہتا ہے اور ایسے صدہا جوہروں کا مصنوعی طور پر تیار کرنا بالکل ممکن ہے۔ خود بخود تابکار جوہروں کا یہ عالم ہے کہ ریڈیم (RADIUM) ایکٹی نیم (ACTINIUM) اور تھوریم (THORIUM)[1] کے تین سلسلوں کے انتشاروں کا نقطۂ آغاز تقریباً ایک مستقل جوہر ہی بنا رہتا ہے یعنی انتشار کے عمل کی رفتار بہت ہی سست ہے اور مادہ کی کسی معلوم کمیت میں جو جوہر ہوتے ہیں ان کی ایک بہت ہی معمولی کسر سال بھر میں منتشر ہوتی ہے۔ یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ تاب کار مظاہر کو محسوب کرنے کے طریقے (پائیر کیوری طریقے METHODS OF PIERRE CURIE) غیر معمولی طور پر حساس ہیں۔ اس لئے مادے کی

---

[1] ریڈیم ایکٹی نیم اور تھوریم تین شعاع پاش یا تابکار عناصر ہیں۔ (از مترجم)

جو مقدار قلب ماہیت کر لیتی ہے اس کو معتد بہ صحت کے ساتھ محسوب کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ وزنی یورینیم (HEAVY URANIUM)[1] ایک سال میں 657 کروڑ جوہروں میں سے ایک جوہر خود بخود کھو بیٹھتا ہے۔ ہلکا یورینیم جسے ایکٹینو یورینیم (ACTINO URANIUM) بھی کہتے ہیں ۱۰۳ کروڑ جوہروں میں سے ایک جوہر اور تھوریم ۲۰۰۰ کروڑ جوہروں میں سے ایک جوہر ضائع کرتا ہے۔ جو جوہر باقی رہ جاتے ہیں وہ اپنے پیش روؤں کی نسبت کم مستقل ہوتے ہیں اور قلب ماہیتوں کے ایک لمبے سلسلے میں سے گزر کر آخرکار ایک مستقل جوہری مغز اختیار کرتے ہیں اور وہ سیسے کی وضعوں (ISOTOPES) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان سیسے کے وضعوں کے جوہری اوزان ۲۰۶، ۲۰۷ اور ۲۰۸ ہوتے ہیں۔

قلب ماہیتوں کے اس سلسلے میں بعض عناصری صورتیں تو ایسی پیدا ہوتی ہیں جن کی زندگی کی مدت دس لاکھ سالوں کے مرتبے کی ہوتی ہے اور بعض ایک ثانیے کے کچھ حصے میں اپنی ہستی کھو بیٹھتی

---

[1] یورینیم کہ یہ وضعیں ... تصور کرنا بھی محال ... پایا جاتا ہے۔ جوہروں میں برقیوں کی تعداد تو ایک ہی ہوتی ہے مگر جوہر کا مغز یا نواۃ ... اور کوئی کم لیکن کیمیائی خواص ایک سے ہوتے ہیں۔

ہیں۔ یہ مظاہر یکے بعد دیگرے ایک ایسی ترتیب میں ظہور پذیر ہوتے ہیں
جس سے ہم کو مکمل آگاہی ہے اور جن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ
کسی حالت میں بھی کوئی خارجی محرک جیسے درجہ حرارت یا دباؤ ان کی
رفتار کو متغیر نہیں کرسکتا۔ یوں ہم کو ایک ایسی مطلقاً قابل اعتماد گھڑی
میسر ہے جو کبھی بگڑ نہیں سکتی۔

اس لئے اگر کوئی جمادات کی قسم کی معدنی چیز جس میں یورینیم
ہو، دس کروڑ برس سے (۱۰؟) کسی چٹان میں مقید ہو تو ابتدائے آفرینش
پر جتنے جوہر اس میں تھے ان میں سے تقریباً ۱۴ فی صدی منتشر ہوئے
ہوں گے۔ اور ان جوہروں کی تعداد کے مطابق اتنے ہی سیسے کے جوہر
ان کی جگہ لے لینگے۔ ان کا وزن قدیم یورینیم کے وزن کے ۱۲ فی صدی
کے برابر ہوگا اور باقی ۲ فی صدی اس ہیلیم گیس (HELIUM[1]) کا
وزن ہوگا جو اس عمل کے دوران میں خارج ہوئی۔ زیر تفتیش معدنی
شئے کا نمونہ جتنا زیادہ پرانا ہوگا اتنا ہی زیادہ سیسہ اس میں ہوگا۔
اس نمونے میں موجود سیسے کی مقدار اور یورینیم کی مقدار میں جو نسبت

---

[1] ایک شفاف گیس ہے جو ۱۸۶۸ء میں [illegible] اور ۱۸۹۵ء میں
کرۂ ارض پر اس کا انکشاف ہوا۔

ہوگی اس کی مدد سے ہم چٹان کے وجود میں آنے کی مدت کو محسوب کر سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی بتا دیں کہ اگر اسی چٹان میں کچھ ایسا سیسہ موجود ہو جس کی ابتدا تاب کارانہ طریق پر نہیں ہوئی تو اس کی موجودگی سے حساب میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ طبعی سیسے میں ہمیشہ ایک تھوڑی سی مقدار اس وضع کی ہوتی ہے جس کا جوہری وزن ۲۰۴ ہے اور جو تاب کارانہ انتشار کے دوران میں کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

اس طریقے سے جو بڑے سے بڑے اعداد ہم کو میسر آتے ہیں وہی ہماری دلچسپی کا باعث ہیں۔ انہیں کے ذریعے ہم اس زمانے کا تعین کرتے ہیں جب زمین منجمد ہونا شروع ہوئی۔ یہ اعداد ۱۵۰ کروڑ برس سے ۱۸۰ کروڑ برس کے درمیان کسی مدت کا پتہ دیتے ہیں۔ پتھر میں تبدیل شدہ حیات (FOSSILS) کی عمر کا اندازہ ہم ان چٹانوں اور مٹی کی عمر سے لگاتے ہیں جن میں یہ فاسلز پائے جاتے ہیں۔

آیئے حیات کی ابتدا کے مسئلہ کو (جس کا انحصار غالباً لحمیوں (PROTEINS) کی ابتدا پر ہے اور جو اور بھی زیادہ پراسرار ہیں) نظر انداز کریں اور ارتقائی نکتۂ نظر پر صرف ابھی غور کریں۔

آج یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ ارتقا کا عمل کب شروع ہوا۔

کیا ابتدا میں کوئی خلیہ موجود تھی ؟ یا جیسا کہ تسلیم کرنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اولین خلیوں (CELLS) سے بھی پہلے کوئی بے شکلا ذی حیات مادہ تھا؟ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔

شوان (SCHWANN) اور اس کے بعد کے بہت سے حیاتیات کے عالموں کا یہ خیال ہے کہ ذی حیات مادے کے جملہ اقسام خلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن بہت ہی ابتدائی نامی اجسام (ORGANISMS) کی کچھ تعداد ایسی ہے جیسے عام کھمبی (COCNOCYTES) جو خلیوں میں تحلیل نہیں ہوتیں۔ کلاہ باراں یا سانپ کی چھتری پر (MYCOTOCYTES) مثال کے طور پر غور کریں تو اس کی تعمیر درختوں کی تعمیر سے ملتی ہے اور ایک پونڈ تک ان کا وزن ہوتا ہے۔ یہ نامی اجسام جو آج بھی پائے جاتے ہیں زندگی کے تمام وظائف ادا کرتے ہیں جیسے تغذیہ۔ تنفس۔ اخراج رطوبت۔ نقل مکان۔ تولید۔ انہیں پر حصر نہیں ہو جاتا کیونکہ فایکومائسز PHYCOMYCES بھی ہیں جو پھپوندی ہیں اور سفونیلز (SIPHONALES) جو آشنہ یا کائی ہیں۔

زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ارتقا کا نقطۂ آغاز کسی نہایت ہی ابتدائی دور میں ایسی صورت میں ہوا جو سب ہی حیات

وجودوں (حیوانات اور نباتات) میں مشترک تھی۔ لیکن ابتدا ہی سے بیک وقت ان دونوں میں ایک تعلق بھی ہم پاتے ہیں اور ایک غائر فرق بھی۔ جس مائع پر حیوانات کی پوری نشوونما کا بنیادی طور پر دارومدار ہے وہ خون ہے اور اعلیٰ درجے کے حیوانات کے خون میں ایک ضروری عنصر وہ سرخ رنگ ہے جس کو ہیموگلوبین (HEMOGLOBIN) کہتے ہیں جو خلیوں کو آکسیجن مہیا کرتی ہے جس کی مدد سے خلیوں کا فضلہ جل جاتا ہے۔ ہیموگلوبین کا سالمہ بہت بڑا ہوتا ہے اور نہایت پیچیدہ۔ اس سالمے کی ساخت جیسے صنف بدلتی ہے بدلتی رہتی ہے (سالمے کا اوسط وزن ۶۹,۰۰۰ ہوتا ہے)

کیمیائی اعتبار سے یہ ہیموگلوبین اس رنگین رس سے بہت ملتا جلتا ہے جو پودوں اور کائی کی رگوں میں جاری ہے یعنی خضریہ (CHLOROPHYLL) (سالمے کا اوسط وزن : ۱۰۴) اس لئے ان دونوں میں رشتہ تو ہے لیکن جہاں ہیموگلوبین کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے سالمے میں ایک جوہر لوہے کا ہوتا ہے خضریہ اس کے مقابلہ میں سادہ ہوتا ہے اس کی تعمیر کی بنیاد میگنیشیم (MAGNESIUM) کے ایک جوہر پر ہوتی ہے۔ پھر جب ہم گھونگھوں (ARTHROPODS) اور سیپ (MOLLUSCS) وغیرہ جو ادنیٰ قسم کے جانور جو اعلیٰ قسم

کے حیوانات کے وجود میں آنے سے پہلے وجود میں آئے) کے خون پر غور کرتے ہیں تو یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس خون میں ایک ایسا رنگین عنصر پاتے ہیں جس کے سالمے کا وزن حیوان کی صنف کے مطابق ۰۰۰,۰۰,۴ سے ۰۰۰,۰۰,۶,۷ کے درمیان ہوتا ہے اور اس میں بجائے لوہے یا میگنیشیم تانبے کا جوہر ہوتا ہے (مثال کے طور پر بعض صدفوں میں)

ایک صنف سے دوسری صنف میں یہ کیمیائی تغیر کس طرح صورت پذیر ہوا؟ راست بازی کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس تغیر کا تصور بھی محال ہے۔ اور یہ مفروضہ کہ یکایک یہ تغیر رونما ہو گیا تسلی بخش نہیں کسی طرح کا تبدل ضرور ہوا ہو گا لیکن یہ کیونکر ہوا شاید اس کا صحیح علم ہم کو کبھی نہ ہو سکے گا۔

اس بات کا امکان کہ ابتدائی اجسام نامی کے گروہوں میں سے جو لاکھوں صدیوں سے اپنی ہستیوں کو قایم رکھے ہوئے ہیں قدیم ترین سلف یا اس سے قلیل متغیر شدہ خلف کا ہم کبھی پتہ لگا سکیں بہت ہی کم ہے۔ باوجود اس کے ہمیں ہر طرف عجیب و غریب صنفیں اجسام نامی کی ملتی ہیں جن کے متعلق یہ طے کرنا کہ ان کا شمار نباتات کے خاندان میں کیا جائے یا جانداروں کے گروہ میں بہت مشکل ہے ہاں اگر خضریہ (CHLOROPHIL) میں سے میگنیشیم کے وجود کو

کسوٹی بنائیں تو اس صورت میں یہ سب نباتات ہیں۔ ان ابتدائی اجسام نامی میں ہم کوڈنو فلے جلیٹز (DINOFLAGELLATES) (کائی کی وہ صنفیں جو آلات کی مدد کے بغیر خالی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں) بھی ملتی ہیں۔ یہ ساکن پانی میں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور خرد بین سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پھرتیلے قلابازہوں۔ یہ بڑی سرعت سے تیرتے پھرتے ہیں اُچھلتے کودتے ہیں اور اپنی لمبی لچکدار دموں کی مدد سے اپنا رُخ اِدھر سے اُدھر موڑتے ہیں۔ ان کے خلیہ دار جسم اس طرح پھولتے اور سکڑتے ہیں جیسے کہ وہ سانس لے رہے ہوں اور ایک مقام پر تو ان کے جسم میں ایک روشنی کو محسوس کرنیوالی ایک آنکھ کی سی سُرخ چتی ہماری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی حالتوں میں ایک حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔

یہ ڈنو فلے جلیٹز نباتات ہیں یا حیوانات؟ اس منزل پر تو یہ سوال بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ واحد خلیہ والے اجسام نامی ہیں جن میں خضریہ بھرا ہوتا ہے اور جن کی حفاظت کے لئے ان پر سیلولوز[1] (CELLULOSE) کی ایک جھلی چڑھی ہوتی ہے جس کی اکثر حسین

---

[1] [illegible] ... بنتا ... (از مترجم)

پیچیدہ بناوٹ ہوتی ہے۔ زیادہ ترقی یافتہ پودوں کی طرح وہ اپنی خوراک پانی میں حل شدہ معدنی اشیا اور کرۂ ہوا کی گیسوں سے حاصل کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو کسی حیوان کے بس کی بات نہیں۔ کیا خضریہ کی موجودگی ابھی سے کسی پہلے ارتقاء کی نمائندگی کرتی ہے؟ یہ ممکن تو ہے کیونکہ بعض کائی کے ایسے اصناف بھی ہیں جن میں خضریہ نہیں پایا جاتا بلکہ اس کی بجائے ایک اور رنگین رس ہوتا ہے۔ لیکن صحیح تقدم کو ثابت کرنا ناممکن ہے۔

بعض علما کا یہ قول ہے کائی یا آشنہ سے بھی زیادہ قدیم مورث ایک جرثومہ تھا جو سیخ کی شکل کا تھا اور ادوار حیات کے ازمنہ قدیم جن کو پری کیمبرین (PRE-CAMBRIAN) ایلگونکین (ALGONKIAN) یا آرکیوزوایک (ARCHEOZOIC) کے نام سے پکارا جاتا ہے کے بڑے بڑے سمندروں کے میٹھے پانی میں رہتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرثومہ ناپید نہیں ہوا اور اس کی بعض صنفوں میں کوئی ارتقائی عمل نہیں ہوا اور اس کا حقیقی خلف آج بھی ایسی دلدلوں میں ملتا ہے جن میں سے لوہے کا فلز (ORE) حاصل کیا جاتا ہے نیز ان لوہے کے آکسائڈ سے بھرپور ندیوں میں بھی پایا جاتا ہے جو ان دلدلوں میں سے نکلتی ہیں۔ اس جرثومہ کا نام ...... (LE

ہے اور ڈونلڈ کلراس پیٹی (DONALD CULROSS PEATTIE) نے اس کی داستان بڑی طباعی سے لکھی ہے۔

آج جو صحیح معلومات ہم کو حاصل ہیں ان کی بنا پر کسی ایک جسم نامی کو کسی دوسرے جسم نامی پر تقدم کا درجہ دینا ناممکن ہے۔ اور ایک کا دوسرے سے استخراج تو اور بھی زیادہ دائرۂ امکان سے باہر ہے۔ ہم تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نامعلوم قدرتی مظاہر کا سلسلہ بالآخر کائی پا اشنہ پر مختتم ہوا جو آج بھی موجود ہیں یعنی سنو فائی سی CYANOPHYCEAE یا نیلی کائی۔ ان کی بعض قسموں میں محیر العقول خضریہ کا اب بھی فقدان ہے۔ ان کی رگوں میں جو رنگین مائع پایا جاتا ہے۔ وہ فائی کوسیانین (PHYCOCYANIN) کہلاتا ہے۔ نلی دار یا کروی شکل اور بے جنسی سلسلہ تولید کی بدولت ان کی مشابہت جرثوموں سے ہے یہ اپنی تکمیل میں لگے رہتے ہیں اور ایک دن یکایک ترقی کے زینے پر براجمان دکھائی دیتے ہیں۔ آخرکار سبز کائی ایک قرین قیاس ارتقا کے امکان کی توقع کے ساتھ پانی پر جا کودتی ہے اس کا ایک مرکزہ یا نواتہ ہوتا ہے جو خود ایک اعجاز سمجھنا چاہیئے اور پانی میں پہونچکر یہ ایک جنسی سلسلہ تولید شروع کر دیتی ہے جو دوسرا اعجاز ہے۔ کیا سبز کائی جس کی بناوٹ خلیہ دار ہوتی ہے اور جس کا

ایک مرکزہ ہوتا ہے واقعی نیلی کائی کی نسل میں سے ہو سکتی ہے۔ ہم اس سلسلۂ نسب کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ بہر کیف ان دونوں میں بے انتہا فرق ہے اور ایک کا دوسرے میں تبدیل ہونے کا طریقہ کار ناقابل تصوّر ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو دونوں کا مبدا کیا ہے؟

کچھ بھی ہو ترقی معتدبہ ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ بے جنسی سلسلہ تولید کے بہت سے طریقے جو بعض پودوں اور حیوانوں[1] میں

---

[1] بے جنسی سلسلہ تولید کچھ ابتدائی واحد خلیوں والے اجسام نامی تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ میٹا زوا (METAZOA) میں بھی پایا جاتا ہے جو واحد خلیوں والے اجسام نامی کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ جاندار ہیں جیسے کہ کوئنے لیٹریٹا (COELENTERATA) پلیٹی ہیل من تھیز (PLATYHELMINTHES) اور اینے لیڈا (ANNELIDA) جو ایک طرح کے کیڑے ہیں۔ یہ جاندار آج بھی ملتے ہیں۔ چونکہ یہ مان لینا محالات میں سے ہے کہ وہ عود کر کے پھر بے جنسی سلسلہ تولید کی طرف آگئے ہیں۔ لا محالا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بے انتہا طویل قرنوں میں بھی وہ ارتقا کی کوئی سیڑھی نہ چڑھ سکے۔ مگر آٹو لائی ٹس ANTOLYTUS جو ایک سمندری کیڑا ہے اور جس کی صنف میں تولید خلیوں کے دو حصوں میں بٹ جانے سے ہوتی ہے اور جس کی شکل بہت کچھ کنکھجورے سے ملتی ہے اس کی مادہ کے انڈے ایک تھیلی میں ہوتے ہیں۔ اگر بے جنسی سلسلہ تولید والی سمندر کی کائی اور ان کیڑوں کا مورث اعلیٰ ایک ہی ہو

پائے جاتے ہیں ہمارے علم میں ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ طریقے قرنوں سے
ایک ہی طرح کے اجسام نامی پیدا کر رہے ہیں۔ خلیہ یا جسم نامی دو حصوں
میں بٹ کر دو الگ فرد بن جاتے ہیں۔ جو زندہ رہتے ہیں نشو ونما پاتے
ہیں اور ان میں سے اپنے وقت پر ہر فرد پھر دو حصوں میں بٹ جاتا
ہے۔ اور اگر کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو موت ان کو نہیں آتی۔ وہ بغیر کوئی
تھکان محسوس کئے ہوئے اپنی مخصوص روانی کے ساتھ اپنی تعداد کو
دُگنا کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا عام یا غالب مظہر فطرت اس
روانی کو روک نہ دے تو جلد ہی وہ پورے کرۂ ارض کی لپنے انباروں
سے جان چھین میں کر دیں۔

معقول بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترقی اور بسرعت ارتقا بھی
یقینی طور پر حاصل ہو سکتا ہے کہ مختلف انواع کا مرکب بدلتے ہوئے

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) تو جاندار خاندان کا ارتقا یکایک کسی مختلف طریقے پر ہوا ہوگا۔
اور اگر ان کے ارتقا کا طریقہ ایک نہ تھا۔ تو دونوں نے ایک ہی حل تلاش کر لیا اور چونکہ یہ دونوں
خاندان اب بھی پائے جاتے ہیں ان کا یہ ارتقائی حل اطمینان بخش تھا کیونکہ قرنہا قرن کے بعد
آج بھی وہ موجود ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بے جنسی تولید کا سلسلہ تسلی بخش تھا تو
جنسی تولید کیوں معرض وجود میں آئی؟ (از مصنف)

ماحولوں میں پروان چڑھے اور ارثی تغیر و تبدل باہم گڈ مڈ ہوکر اس کے ممد ہوں۔ بے جنسی خلیئے انفرادی طور پر موت کے حادثے سے نابلد ہیں۔ وہ لافانی ہیں۔ یکایک جنسی تولید کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ایک بالکل انوکھا اور غیر متوقع متوالی مظہر رونما ہوتا ہے یعنی فرد کا جنم اور موت۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی نوع کو ترقی دے کر اسکو زیادہ پیچیدہ بنانا مقصود ہو تو اس کے جنسی تولید کا سلسلہ طریقہ عمل کے ساتھ وابستہ کرنا ناگزیر ہے۔ توارث کو بدلنے اور زرخیز بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ غیر کمت انواع کو باہم ملایا جانا اور اکتسابی سیرتوں کو یکجا کیا جاتا۔

یہ ارتقا کی ایک عظیم المرتبت انقلابی صورت ہے۔ اتنی ہی عظیم اور ناقابل فہم ارتقا جتنی کہ دودھ پلانے والے جانوروں کی لیکن اسکو کافی اہمیت نہیں دی جاتی رہی۔ ایک خاص منزل کے بعد حیاتیاتی ارتقا جبھی جاری رہ سکتا تھا کہ ایسے ممبر افراد وجود پذیر ہوتے جو زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہوتے۔ فرد کے کار منصبی کا تخیل بہت ہی بنیادی ہے اور وجود میں آتے ہی یہ غیر نامی مادے اور حیات میں ایک امتیازی فرق کا حامل بن گیا اور جو امتیازی فرق پہلے بھی موجود تھے ان پر اس سے اضافہ ہوگیا۔

اس طرح پر پہلے سے ایک مرتقی فرد کا جنم لینا ایک مدت کے اختتام پر اس کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ اور اس کی یہ طبعی عمر مختلف انواع میں مختلف وقفوں پر ممتد ہوتی ہے۔ فرد خود ایک یا متعدد فردوں کو جنم دے کر شمعِ حیات ان کے حوالے کر کے خود موت کی نیند سو جاتا ہے اور اس غیر نامی کائنات میں جا ملتا ہے جس سے کہ کسی معجزانہ طرز پر وہ وجود میں آیا تھا۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ارتقائی نقطۂ نظر سے فطرت کی سب سے بڑی ایجاد موت ہے۔

اس منزل کے بعد ارتقا کا عروج ناپائدار اور فانی افراد ہی کے ذریعہ اور بدولت ہوتا ہے۔ بجنبہٖ ایسے ہی جیسے کسی شیریں نغمے کا جنم علٰحدہ علٰحدہ سُروں سے ہوتا ہے۔ جو نرم اور رواں بجتے ہوتے مٹ جاتے ہیں لیکن اپنی یاد حافظوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ جس طرح کہ مستقبل میں چل کر نفسیاتی فرد ہی روح کی ارتقا کا لازمی عنصر ہوگا اسی طرح آج یہ سریع الزوال فرد ہی حیاتیاتی ارتقا کا اساسی عنصر ہے۔ اور جب تک کوئی اس کے خلاف ثبوت مہیا نہ ہو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ طبیعی ارتقا کو موت کے ظہور ہی نے اس نمایاں گرفت کے پنجے سے نجات دی جو غیر نامی عالم پر حکمران ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ خود انسانی حریت کے وجود میں لانے کا راستہ بھی موت ہی

نے صاف کیا۔

گزشتہ اور آئندہ اوراق میں جب کبھی اور جہاں کہیں زمانے کے ادوار یا قرنوں کا ذکر آئے تو ایک اہم امر ملحوظ خاطر رہے کہ ارتقا کا کوئی واضح تاریخ وار خاکہ بنا کر پیش کرنے کا امکان نہایت درجے محل نظر ہو جب ہم کسی نوع کا "معرض وجود" میں آنے کا ذکر کرتے ہیں یا نامی اجسام کے "درجہ بدرجہ مکمل" ہونے کا ذکر کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ "فطرت کوئی زبر دست قدم اٹھا رہی ہے" تو ہم صرف ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو مسلمہ مصنفوں اور عالموں کے نزدیک قابلِ قبول ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مصنف اور عالم خود یا ہم کسی فوری "ظہور" یا کسی تدریجی ترقی کی توثیق کرتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کہ جو حقیقتیں ہمارے پیشِ نظر ہیں اور جنکو ہم اپنے استقرا کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ وہ آثار ہیں جو اجسام نامی قدیم چٹانوں یا دریائی سیلابوں کے جمع کردہ ریت کے ڈھیروں میں چھوڑ گئے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بہت قدیم آثاری نقوش آج کی بعض زندہ انواع کے چھوڑے ہوئے نقوش سے بہت ملتے جلتے ہیں اس لئے ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ موخرالذکر نقوش بہ گمانِ غالب قبل کیمبرین زمانے (PRE-CAMBRIAN) کے ابتدائی انواع کے

تقریباً مماثل ہیں۔ اگر یہ نقوش بکثرت میں تو جن محفوظ صورتوں میں وہ پائے جاتے ہیں ان کی قدامت کے پیشِ نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ اس قدیم قرن میں ان اجسام نامی نے بہت کچھ ترقی کر لی تھی لیکن اس سے ان انواع کے ابتدائی نمونوں کے ظہور میں آنے کے زمانے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ وہ کم تعداد میں اس قرن سے لاکھوں برس پہلے نامعلوم خطوں میں موجود رہے ہوں یا کسی عظیم حادثے کا شکار ہو چکے ہوں۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی اور اوسطاً ان اطلاعات کو جو ہم کو حاصل ہیں ارتقا کی تواریخ مرتب کرنے میں کام میں لانا جائز ہے جو گو ہمیشہ جزئیات تک کلیتاً درست نہ ہونے پر بھی ایک خاصہ صحیح اندازہ دے سکتے ہیں۔

جب ہم پری کیمبرین (PRE-CAMBRIAN) دورِ ارضی کا ذکر کریں تو ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس کی مدّت اس مدت کی تقریباً ۲/۳ ثلث ہے جو اب تک پورے ارتقا میں صرف ہوئی ہے یعنی نباتاتی جراثیم سے ترقی کر کے انسان کے وجود میں آنے تک کی کل مدّت کی اور تقریباً ۶۰ کروڑ سال ہے۔ ایسی صورت میں تو اس عہد میں قدرتی مظاہر کے لا انتہا سلسلے بنے بگڑے ہوں گے۔ پتھروں میں بدلے

ہوئے اجسام نامی کا مطالعہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے ۔ مثلاً ہم کو پتہ چلتا ہے کہ نباتات نے سست رفتار سے ترقی کی اور اسی خطے میں جانداروں نے خشک زمین پر پہنچنے سے پہلے تکمیل کا معتدبہ درجہ حاصل کرلیا ہم کو پتہ چلتا ہے کہ پری کیمبرین عہد، جس میں بڑی جدو جہد سے نہایت ادنیٰ درجے کی آبی نباتات پیدا ہوگی۔ ہر صنف کے جانداروں سے معمور تھا اور یہ صرف کیڑے مکوڑے ہی نہیں تھے جیسے ایمی لیڈا (AMELIDA) بلکہ صدف نما جانور (MOLLUSKS) جن کے مخروطی خول ہوتے ہیں اور جو ان گھونگھوں سے ملتے جلتے تھے۔ جواب بھی ہمارے سمندری ساحلوں پر پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پردار ٹرائی بولا ئیٹ (TRILOBITE) اور بڑے بڑے قشری یا خول دار جانور بھی اس عہد میں پائے جاتے تھے۔ یہ انکشافات درحقیقت نہایت حیرت انگیز ہیں کیونکہ یہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ پری کیمبرین عہد کی دنیا کافی طویل زمانے پر ممتد رہی ہوگی۔

اگر کیڑے مکوڑوں کا وجود جراثیم اور نیلی اور سبز کائی کے مقابلے میں بہت بڑی ترقی کا اظہار کرتا ہے تو ٹرائی بولائیٹ کیڑے مکوڑوں کے مقابلے میں اور بھی بڑے ارتقا کو نمایاں کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک اعلےٰ درجے کی نشوونما پایا ہوا جانور ہے اور اس کے جنین کی ساخت

اسلاف و اجداد کے ایک طویل سلسلے کی متقاضی ہے۔ لیکن اس عہد میں ارضی نباتات کا کہیں کوئی وجود نہیں ملتا۔ ہم کو صرف نہایت ابتدائی سمندری نباتات کے آثار ہی میسر آتے ہیں۔ لہذا اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ نباتاتی اور ذی حیات صنفوں کا ماخذ ایک ہی ہے تو ہم کو لابدی یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ بعض ابتدائی جراثیم، کائی اور دیگر اجسام نامی کے خاندان وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی ایک دوسرے سے ممیز ہو چکے تھے اور میگنیشیم دار خضریہ کی بجائے ہیموسائی نین (HEMOCYNIN) (جو بہت زیادہ پیچیدہ اور تانبہ دار ہے) کے حامل بن چکے تھے۔ ارتقا کی کارروائی جب ایک مرتبہ شروع ہو گئی تو جس میں شروع ہوئی وہ صنف تو تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگ گئی لیکن اسی صنف کے دوسرے خاندان اسی حالت میں پڑے رہ گئے۔ طبعاً یہ ممکن ہے کہ یہی منظر کئی ایک خاندانوں میں جو یک وقت وجود میں آیا ہو لیکن دوسرے خاندان متاثر نہ ہوئے اور آج بھی تقریباً ایک ارب سال بعد اسی رنگ میں ہیں جس میں وہ ابتدائی لمحے میں تھے۔ اس سے ابتدائی آبی پودوں اور بلند درجے کے ترقی یافتہ جانوروں کی ہم موجودیت واضح ہو جاتی ہے اور جانوروں کے ارتقا کا آغاز کرۂ ارض کے اولین دوروں تک ممتد ہو جاتا ہے یعنی ادنیٰ پری کیمبرین قرن تک۔

یہ امر یقینی ہے کہ حیوانی عالم ابتدائے کار ہی سے بہ نسبت نباتاتی عالم کے زیادہ تیزی کے ساتھ ارتقا کے مدارج طے کرنے لگا۔ اگر نباتات جانداروں سے پہلے وجود میں آئی اور اگر دونوں کا ماخذ ایک ہی تھا تو ایک کا دوسری شکل میں استحالہ تیزی سے ہوا ہوگا تقریباً فوراً ہی۔ یہ دوسرا علمی مسئلہ ہے جس پر احتمال کے علم الاحصا کا اطلاق کرنا غالباً عقلمندی نہ ہوگی۔

ابتدائی سلورین (SILURIAN) دور میں سمندروں میں شاندار گینائڈ مچھلی پائی جاتی تھی جس کے پاس دشمن سے بچاؤ کے لئے مضبوط ہڈیوں کا ذرہ بکتر تھا۔ نیز سیفالوپاڈز (CEPHALOPODS) جو ہشت نیش صدفے کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ناٹی لیشیا (NAUTILACEA) بریکیوپاڈز (BRACHIOPODS) اور سکارپیونیڈا (SCORPIONIDA) بھی پائے جاتے تھے جن کے پاس ہوا میں سانس لینے کے اعضا بھی تھے ان متعدد صورتوں کے جانوروں کو قدرت نے اس وقت بھی وہی اعضا عطا کئے تھے جو ان کے اخلاف کے پاس بشمول انسان موجود ہیں یعنی جگر، گردہ، دل وغیرہ جو لازمی خاصہ کے اعتبار سے اپنی ساخت اور وظائف کی بنا پر موجودہ حیوانات کے اعضا کے مماثل تھے اور بظاہر ویسے ہی پیچیدہ۔ یہ تین ارب سال پہلے کی بات ہے۔ اس دور میں

خشک سطحِ زمین پر نہ کوئی ایک بھی فرن (ایک طرح کا پودا) اور شاید نہ کسی قسم کا کوئی پودا موجود تھا۔

سب سے پہلا خشکی کا پودا جزیرہ نمائے گاسپی واقع کنیڈا میں ملا اور یہ ڈیوونین (DEVONIAN) دور کا ہے جو سلورین (SILURIAN) دور کے بعد کا دور ہے۔ یہ ایک کمزور چھوٹا سا پودا ہے جس کا قد ایک فٹ ہے۔ سر جان ولیم ڈاسن نے (SIR JOHN WILLIAM DAWSON) جس نے آج سے تقریباً اسی سال پہلے اس کا انکشاف کیا اس پودے کو سلوفائی ٹن PSILOPHYTON کا نام دیا جس کے لفظی معنے ہیں ننگا پودا۔ بہ افراط پیدا ہونے والے اور نفیس کاربن زا نباتات تو صرف ساڑھے سات یا دس کروڑ برس بعد پھوٹ نکلے۔ بڑے عظیم الشان فرن تیس فٹ سے بھی زیادہ لمبے جن کی چوٹیوں پر دلربا امتیازی طرے ہوتے تھے۔ کارڈیٹ (CORDAITES) جن کا طول پچاس فٹ تک پہنچتا تھا اور جن کی شاخیں اور پتے ہوتے تھے اور علیٰ ہذا القیاس بہت سے اور اقسام۔ زمانہ حال کی تقریباً ساری صنعت و حرفت کا انہیں عظیم الشان جنگلوں سے نفع اندوزی پر دارومدار ہے یعنی اس دولت پر جو ان جنگلوں نے سورج سے توانائی حاصل کرکے مدتوں پہلے کوئلے کی شکل میں جمع کردی تھی۔

لاکھوں برس بعد پہلے ایسے پودے وجود میں آئے جن کے بیج ظرفوں میں محفوظ نہیں ہوتے جیسے کہ سائی کے ڈیلیشی (CYCADACEAE) اور جنک گویشی (GINKGOACEAE) اوّل الذکر تو آج بھی ممالک منطقہ حارہ میں موجود ہیں۔ اور موخرالذکر کے نمائندہ چینی گنک گو (GINKGO) میں تو پرمور جوریسک (PERMO-JURASSIC) دور کے بعد سے شاید ہی کچھ تبدیلی آئی ہو۔ بالآخر مخروطی شکل کے ثمروں والے (CONIFERAE) پودے تکمیل کو پہونچے ہمارے جنگلوں میں ان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ گنک گو اور مخروطی ثمر والے پیڑ بشمول فرنوں کے عظیم الجسم رینگنے والے اژدہاؤں کے دور سے متصل پہلے دور کے آخری پسماندگان میں سے ہیں۔ سرو اور اس کے خاندان کے دیوہیکل سیکوائے (SEQUOIAS) بعد میں وجود میں آئے اور یہ عجیب الخلقت ڈنوساروں (DINOSAURS) کے ہمعصر ہیں۔

فی زمانہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی نظریہ ارتقا کا انکار کرسکے۔ لہذا انسان کے وجود میں آنے کے علمی مسئلے کا صاف گوئی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ طبعی انسان کی تخلیق صرف انہیں اجسام نامی کے سلسلوں کا نتیجہ ہے کہ جو حیات کی ابتدائی صورتوں تک ممتد ہیں

البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آرکیو زوائک (ARCHEOZOIC) یعنی پہلے دور ارضی، دوسرے دور ارضی (MESOZOIC) یا کسی اور دور کا کوئی خاص حیوان انسان کا جد امجد ہے۔ اس کا ہمارے پاس کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ اور اس دعوے کی تو اب کوئی تائید نہیں کرتا کہ انسان لنگور کی نسل میں سے ہے۔ یہ امر تاہم مسلم ہے کہ سب ذی حیات ہستیوں کا کوئی ایک مشترکہ ماخذ ہے۔ اور نظریہ ارتقا کی موجودہ بنیادوں کے پیش نظر یہ قرین قیاس ہے کہ قدیم خاندان جس سے ارتقائی سلسلہ چلا کوئی پوری طرح ترقی یافتہ جسم نامی نہ تھا بلکہ اس ذی حیات جسم اور بے جان مادہ میں بہت کم فرق تھا۔ بلا ریب یہ نظریہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ایسا ابتدائی ذی حیات جسم وجود میں کیونکر آیا۔ ہم کو مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ وجود کسی سابق ارتقا کا نتیجہ ہوگا اور یوں یہ علمی مسئلہ بار بار سامنے آئے گا۔

اب ہم علم معدومیات (PALEONTOLOGY)[1] کی طرف یہی مسئلہ لے کر رجوع کرتے ہیں اور اس علم سے اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں

---

[1] معدوم شدہ جانوروں اور پودوں کا علم (از مترجم)

کہ وہ ہم کو وہ عناصر مہیا کرے جن کی مدد سے انسان اور حیوانات کے نسبی تعلق کو از سر نو تشکیل دینے کی سعی کریں۔ اسی علم کی بدولت ہم ارتقا کے تخیل کے ادراک کے قابل ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس علم سے اتنا ہی مواد طلب کرنا چاہیئے جس کا مہیا کرنا اس کے حیطۂ امکان میں ہے۔ حجری ہڈیوں کو (FOSSILBONES) لاکھوں برس تک جوں کا توں محفوظ رکھنے کے لئے جن شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے وہ اکثر و بیشتر پوری نہیں ہوتیں۔ اور نسیج یا بافتہ (TISSUE) اور اجسام کا پورے کا پورا محفوظ ملنا تو اور بھی شاذ ہے۔ پھر جب ہوا۔ روشنی اور نمی کا ان کو سامنا ہوتا ہے تو ہڈیاں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں یا چورا چورا ہو جاتی ہیں اور تحلیل ہو جاتی ہیں۔ ہاں ایک ہی صورت ایسی ہے کہ جس میں کسی حیوان کی تشریحی ہیئت یا داخلی اعضاء کو مکمل طور پر تشکیل دینا ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ حیوان کسی ناگہانی طغیانی عظیم میں گھر کر ہوا اور پانی کے اثرات سے محفوظ ہو گیا ہو یا کسی معدنی شے نے اس کے جسمانی بافتوں کی قایم مقامی کر لی ہو۔

کسی ایسے ہی اتفاقی حادثے کی بدولت ہم رینگنے والے جانوروں اور پرندوں کے درمیانی واسطے کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں یعنی آرکیو اوپ ٹرکس (ARCHAEOPTERYX)[1]

[1] اگلے صفحہ پر۔

جس کا نقش نفیس رگوں والے پرت دار پتھروں میں (اعلےٰ جیوراسک قرن کے) اتنی حیرت انگیز جزیات کے ساتھ محفوظ ہے کہ اس کے نئے نکلے ہوئے پروں تک کی ساخت صاف دکھائی دیتی ہے۔

ایسے ہی اور نایاب مثالیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جیسے بہت آہک آمیز پانی کے عمل سے کسی حیوانی یا نباتاتی مادہ کا پتھر ہو جانا۔ ای اوسین (EOCENE) قرن میں تقریباً چار کروڑ سال پہلے فرانس میں سیزان (CEZANNE) کے قریب ایسے ہی ایک آہک آمیز چشمے کے عمل کی بدولت پھول اور کیڑے پتھر بن گئے۔ جو مظہر فطرت کہ تقریباً مکمل طور پر محفوظ حالت میں قدیم زندگی کی صورت کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کیڑے کہربا میں شامل ہو گئے ہوں۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ کہربا خود مخروطی شکل کے پھلوں والے درختوں کی متحجر گوند یعنی رال ہے۔ آلی گوسین (OLIGOCENE) قرن کم از کم دو کروڑ برس پہلے) کے جنگلوں کے پیدا کردہ ایسے اہم

لہ یہ جانور جورا قرن میں موجود تھا اب معدوم ہے۔ اس کی بہت لمبی مخروطی فقروں کی بنی ہوئی دم ہوتی تھی اور اس دم کے دونوں طرف پر بھی ہوتے تھے۔ اور جبڑوں میں دانت ہوتے تھے یعنی کچھ خصوصیات پرندوں کی اور کچھ رینگنے والے جانوروں کی ہوتی تھیں۔

پرت کہربا کے پائے گئے ہیں۔ جو حشرات الارض اس گوند میں پھنس گئے وہ یہی نہیں کہ محفوظ ہو گئے بلکہ حقیقتاً ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے کسی نے مسالہ لگا کر ان کی لاشیں رکھدی ہوں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا۔ یہ امر متوقع ہے کہ یہ حادثے بہت ہی چھوٹے جانداروں کو پیش آئے۔

علاوہ بریں ان قدیم متحجر گادی تختوں کا بہت بڑا حصہ فی الحقیقت سمندروں میں مدفون ہے اور بالکل ہماری دست رس سے باہر ہے۔ کبھی کبھی عمارتوں کے لئے پہاڑوں سے پتھر نکالتے وقت ان کے گڑھوں میں سے یا کانوں میں سے ہنگامہ خیز انکشافات ہو جاتے ہیں جیسے کہ بلجیم سطح زمین کے کئی سیکڑوں گز نیچے ایک کوئلے کی کان کی گلیوں میں تیئیس اگوانوڈنزا (IGUANODONS) کی مکمل لاشیں مل گئیں۔ یہ ایک قسم کے ڈنوسار تھے جو رینگنے والے جانوروں کے خام کھرپے والے دور سے متعلق تھے۔ اگر ہم پوری دنیا میں براعظموں کی سطح کا مقابلہ اس چھوٹے سے رقبے سے کریں جس میں کانیں یا پتھر ہیں تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایسے قدیم تختوں کے انکشافات کے امکانات کتنے کم ہیں۔ یہی قول حیوانوں کے ان قدموں کے نقوش کے متعلق بھی صحیح ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ وایومنگ۔ کولوریڈو۔ ایری زونا اور اوٹا میں ایسے قدموں کے

بعض شاندار نقوش ملے ہیں۔ بعض ڈنو ساروں (DINOSAURS) کے قدموں کے نقش نو باون انچ لمبے ہیں۔ جس حیوان کا اتنا بڑا قدم ہوگا اس کی قد و قامت کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں۔ بعض ایسے نقوش پا تو ایسا گہرا اثر دل میں پیدا کرتے ہیں کہ عقل حیران ہوتی ہے۔ جب روز روشن میں ایری زونا کے آفتابِ سوزاں کے نیچے رنگین صحرا کے قریب ان کو دیکھا جائے تو زندگی کا ایک ایسا دل نشین اثر اور حقیقت کا اتنا صحیح اندازہ انسان کو ہوتا ہے کہ جیسا پورے ڈھانچوں کو تاروں سے جوڑ کر کھڑا کر دینے سے بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو گویا خود اس دیو ہیکل حیوان کا گوشت اور پوست ہیں جن سے گیلی مٹی اندر کو گھس گئی۔ ان کو دیکھ کر ناظر متوقع بن جاتا ہے کہ دور کے بلند پہاڑی سطح پر اس دیو ہیکل حیوان کی چلتی پھرتی صورت نیلگوں آسمان کے تقابل میں نظر آنے والی ہے۔ وقت سمٹتا معلوم ہوتا ہے کیا یہ درندہ دس کروڑ سال پہلے یہاں سے گزرا یا یہ واقعہ گزرے ہوئے کل کا ہے؟

علم معدومیات کی مہیا کردہ شہادتوں کی توضیح اور تعبیر کرنے میں ہمیں لا اُبالی پن اور بے توجہی سے کام نہ لینا چاہیئے بالخصوص جب کہ ارتقا کی بنیادوں اور عمارت کو قائم کرنے کی سعی کی جا رہی ہے

اس کے مبادی حد درجہ نامکمل اور بے ربط ہیں۔ حجری حالت میں ہمیں صرف وہی انواع دستیاب ہوسکتی ہیں جن کی بڑے بڑے ارضی خطوں میں کثرت تھی اور وہ ان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ جدید اور عبوری اقسام جولازماً کمیاب اور خاص مقامات میں ہی پائی جاسکتی ہیں تقریباً ہمیشہ ہماری دسترس سے باہر رہیں گی۔ اس کے برعکس یہ ہوسکتا ہے کہ اتفاقاً کسی معدوم نسل کے آخری نمونے کا کوئی نمائندہ یا استثنائی فرد ہمارے ہاتھ آجائے۔ اس کی ایک جاذب توجہ مثال آج زندہ موجود ہے یعنی ہے ٹیریا (HATTERIA) یا سفے نوڈن پنک ٹیٹا (SPHENODON PUNCTATA) یہ تقریباً دو فٹ طویل چھپکلی رینگنے والے حیوانوں کے پانچویں طبقے کی آخری نمائندہ ہے۔ ورنہ یہ طبقہ جوریسک دور (تقریباً دس کروڑ سال پہلے) سے قطعاً معدوم ہے۔ یہ چھپکلی نیوزی لینڈ کے شمالی ساحل کے کئی ایک جزیروں میں آج بھی ملتی ہے۔ کسی حیرت خیز اتفاق کی بدولت اس کا وجود آج تک قائم ہے اور قدیم اصناف کی بعض دلفریب خصوصیتوں کو پیش کرتی ہے جیسے فرق سر پر تیسری آنکھ۔ اگر ان چٹانی جزیروں میں چھان بین نہ کی جاتی یا اگر وہ حال ہی میں سمندر کی تہ میں غرق ہوگئے ہوتے تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ رن کوسے خیلیا (RHYNCHOCEPHALIA)

جوریک دورہی میں معدوم ہو گئے تھے۔ اس لئے برعکس اگر اتفاق اسکو
پسند کرے کہ لاکھوں برس بعد انسانوں کو اس کے خوب محفوظ شدہ
آثار انسانی ہڈیوں کے قرب و جوار ہی میں دستیاب ہوجائیں تو
انسان اس سے اغلباً یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ یہ چھپکلی ہمارے پالتو جانوروں
کی ہمعصر ہے لیکن غالباً ان کے مقابلے میں کمیاب تھی۔

(۶)

پتھر میں تبدیل شدہ حیات و نباتات (FOSSILS) کے پیدا کردہ بعض اہم مسائل۔

صریحاً ایک غیر ماہر شخص کے لئے اعلیٰ درجہ کے حیوانوں کے اعضاء کی تشریحی پیچیدگی ارتقا کا ایک نہایت حیرت انگیز اور جاذب توجہ منظر ہے لیکن وہ واحد خلیوں والے خوردبینی جانداروں کی عضویاتی پیچیدگی سے زیادہ تعجب خیز نہیں۔ اور جہاں تک کہ ارتقا کا تعلق ہے عضویاتی تغیرات تشریحی تبدیلیوں کی بہ نسبت زیادہ اچنبھے میں ڈالنے والی اور اظہار حق کرنے والی ہیں۔

حیاتیات کے عالم کے لئے جسے یہ معلوم ہے کہ فطرت کا مطالعہ کیسے کرنا چاہیئے فطرت ایک مستقل منبع عجائبات ہے۔ فطرت نے متنوع حلوں کے ذریعے عجیب و غریب مشکل مسائل کو حل کیا اور لاکھوں برس کی جدوجہد کے بعد اس نے آخرکار بہترین صورت کو تجویز کیا یعنی ایسی صورت جو پیش نظر مقصد کے لئے سب سے

زیادہ موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن مسائل وہی مسائل رہے جو حلول سے بے تعلق معرض وجود میں تھے۔ ارتقا کے از اول تا آخر پختگی تک سائنس کے ماہر کو اسی ناقابل توجیہ معمہ کا سامنا رہا ہے یعنی سرسری حلول کو بہتر بنانے کے لئے ایسے اعضا کی تخلیق جن کی بدولت فرد کی آزادی کی افزائش ہو اور بہ لحاظ ماحول اس کی خود مختاری بڑھے۔
واحد خلیہ (جیسے ڈپلوڈینیم DIPLODINIUM) میں بھی قدرت نے کامیابی کے ساتھ' ایک ابتدائی نظام ہضم مع خوراک لے جانیوالی نلکی (ESOPHAGUS) اور گول بڑی انتڑی' اور عصبی نظام جو کثیر خلیوں والے اجسام نامی کے عصبی نظام کا پہلے سے نقشہ پیش کرتا ہے شامل کر دئے۔ واحد خلیوں کا عصبی نظام یوں آنے والے عصبی نظام کا پتہ دیتا ہے کہ اس میں ایک نامکمل سا دماغ اور خوراک والی نلکی کو محیط ایک حلقہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو ایک پیچیدہ بول و براز کو خارج کرنے والا نظام (انقباض پذیر جوف) بھی اس میں ملتا ہے۔ فطرت نے بنیادی عضویاتی مسائل کو سامنے رکھ کر واحد خلیہ میں انہیں جزوی طور پر حل بھی کر لیا۔ بعد ازاں اس نے انہیں دشوار مسائل کو میٹازوا (METAZOA) یعنی ان جانداروں میں جنکے پاس جدا جدا خلیہ دار اعضا تھے زیادہ مکمل طور پر حل کیا

اگر کوئی تجربہ کامیاب نہ ہوا یعنی جب کسی پہلے سے بہتر صورت گرد و پیش کے حالات کا سامنا کرنے میں اپنی برتری ثابت نہ کرسکی تو وہ نوع ہی سرے سے معدوم ہو گئی یا صرف کچھ مدت جوں توں جئے گی یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو گئی۔ یہ دعویٰ تو قریب قریب کیا جاسکتا ہے کہ ارتقا کے صاف صاف خطوط تو ایلگان کین (ALGONKIAN) دور میں ہی طے پاچکے تھے۔ یعنی اس دور میں جو آرکین (ARCHEAN) جو ابتدائی پری کیمبرین دور ہے) اور پیلیوزوائک (PALEOZOIC) کے درمیان کا دور ہے۔

قریب قریب پچاس کروڑ برس پہلے کیمبرین دور کے اختتام پر یا شاید اس سے بھی پہلے ارتقا کے بنیادی کارکردگی کے طریقے بہ گمان غالب ایسے خلاف معمول پیچیدہ اور متنوع جاندار معرض وجود میں لانے پر منتج ہو چکے تھے جو اپنے ماحول کے لئے حسب دلخواہ طور پر مناسب تھے اور جن کے عضویاتی وظائف بالالتزام وہی تھے جو آج ہمارے موجودہ زمانے کے حیوانوں کے ہیں۔

بایں ہمہ عمل ارتقا اور بھی بڑی تفریق بہم کرنے میں لگا رہا گویا وہ ایسی ہستیوں کی تخلیق سے مطمئن نہ تھا جو محض زندہ ہی ہوں اور اپنے نقطۂ نگاہ سے ماحول کے مکمل طور پر مناسب ہوں۔ ان گنت

تجربات کئے گئے۔ اصناف کے گروہ در گروہ معدوم ہوتے رہے۔ گویا تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ناقص تھے اور ان کی تخلیق میں فطرت نے فاش غلطی کی۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ علم معدومیات کے زاویۂ نگاہ سے حیوانات کی مملکت کے بنیادی نمونوں کا جزوِ اعظم باہم بے ربط ہے۔ باوجود اس امر کے کہ آرکیوپٹرکس ARCHACOPTERYX کا رینگنے والے جانوروں اور پرندوں کی ہر دو جماعتوں سے نسبتاً ہر (ایسا رشتہ جیسے جیتے جاگتے ان جماعتوں کے نمائندوں کے تشریحی اور عضویاتی اعمال ثابت کرتے ہیں) ہم اس کے غیر معمولی تعلق کو ان دونوں جماعتوں کی حقیقی درمیانی کڑی قرار دینے کے مجاز نہیں۔ کڑی سے ہماری مراد دو جماعتوں کے درمیانی لازمی حالت تبدیل یا منزل تغیر ہے جیسے مثلاً رینگنے والے حیوانوں اور پرندوں کے درمیانی کوئی شکل یا اس سے بھی کسی قدر چھوٹے ملتے جلتے گروہوں کی درمیانی شکل۔ جب تک کہ درمیانی منزلوں کا پتہ نہ چل جائے اور جب تک کہ تغیر و تبدیل کے طریقۂ کار پر وقوف حاصل نہ ہو کسی حیوان کو محض اس وجہ سے کہ اس میں دو مختلف جماعتوں کے بعض امتیازی نشانات پائے جاتے ہیں ان کی اصلی درمیانی کڑی نہیں کہہ سکتے۔

پرندوں میں درجۂ حرارت کی یکسانی کے ظہور کے متعلق بھی

یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ امر پرندوں کو ماحول کی غلامی سے ایک
بے پایاں اور مسلسل آزادی کا باعث ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ
تخلیق مطلق کی تمام ناقابلِ اطمینان خصوصیتیں اس میں پائی جاتی
ہیں حالانکہ ہم کو ایسا لگتا ہے کہ یہ صورت نہیں ہو سکتی۔ آج یہ امر
دنیا کے عظیم ترین معموں میں سے ایک معمہ ہے جو اپنی جگہ پہ قائم ہے۔

دودھ پلانے والے جانوروں کے نمودار ہونے سے بہت زمانہ
قبل بھی ٹھیک ایسے ہی ایک پر اسرار علمی مسئلے کا ہم کو سامنا کرنا
پڑا ہے جو اس وجہ سے اور بھی دلچسپ ہے کہ فطرت نے جو پہلا
حل پیش کیا وہ نام نہاد گرہ دار جوڑوں والے جاندار تھے
(ARTHROPODS) مثلاً کیڑے، عنکبوت اور کیکڑے وغیرہ اور
ان سے مسئلے کا قابلِ اطمینان حل حاصل ہو گیا تھا۔ ان کے عضلے
اعضا کے اندر تھے اور ان کی حفاظت کے لئے ایسا زرہ بکتر تھا
جس کے جوڑ حد درجے پیچیدہ اور اپنی ساخت کے اعتبار سے قابلِ
اطمینان تھے۔ اس حل کی ساختی خوش تدبیری کا صحیح اندازہ کرنے کے
لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک کیکڑے یا جھینگا مچھلی
کا معائنہ کرلیں یا کسی کیڑے کو بھاگتے ہوئے غور سے مطالعہ کریں۔
دوسرے حل یعنی داخلی ڈھانچے کو قائم کرنے میں معلوم ہوتا ہے کافی

وقت لگا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ ڈھانچہ شروع ہی سے ہڈیوں کا بنایا گیا تھا۔ مچھلیوں میں تو کم از کم ہم کو یہ علم ہے کہ یہ ذوی الفقراتی (CARTILAGIN US) طریق پر شروع ہوا یعنی لچکدار بناوٹ کی کرکری ہڈی کی قسم کی چیز تھی۔ سلا خائی (SELLACHII) مچھلیاں جیسے شارک مچھلی یا شعاعیہ مچھلی جو اب بھی ہمارے سمندروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور سب سے پہلے سلورین (SILURIAN) قرن میں یہ موجود تھیں دراصل ہڈی کی بنی ہوئی مچھلیاں نہیں۔ حقیقی مچھلی یعنی (TELEOSTEI) کے پیدا ہونے میں تقریباً بیس کروڑ برس لگے۔

ریڑھ کی ہڈی والے حیوان ہمارے زاویۂ نگاہ سے عالم حیوانات کا سب سے اہم گروہ ہیں لیکن ابھی تک ان کے مبدا کی مکمل وضاحت نہیں ہوسکی مدتوں یہ خیال کیا جاتا رہا کہ ان کا مورث اعلےٰ ایک بہت ہی ابتدائی قسم کی مچھلی تھی یعنی ایم فی آکسس (AMPHIOXUS) جو آج بھی ملتی ہے اور اس میں ذوی الفقراتی قسم کے ڈھانچے کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ حال ہی میں ایک اور نظریہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق (OSTRACODERMI) (یہ مچھلیوں کی وہ قسم ہے جن کے سروں کے ارد گرد بہت بڑا ہڈیوں کی بنی ہوئی چادروں کا ذرہ بکتر ہوتا ہے) کو سمندری

ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کا نقطۂ آغاز بتایا گیا ہے۔ اس مفروضہ کی جس کی امریکہ میں ڈاکٹر ڈبلیو کے۔ گریگوری (DR.W.K.GREGORY) نے بڑی طباعی کے ساتھ اشاعت اور حمایت کی۔ یہ مفروضہ ایم فی آکسی مچھلی کو اس نسل کی ایک انحطاطی صورت تصور کرتا ہے۔

متحجر حیات کے مطالعے سے ایک اور عجیب امر کا پتہ چلتا ہے بشرطیکہ ہم ان قیود کو بھول نہ جائیں جو نتائج اخذ کرنے میں محتاط رہنے کے لئے اوپر مذکور ہیں۔ وہ امر یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارضی ریڑھ کی ہڈی والے جانور سمندری ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں سے پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ کاربن زا (CARBONIFEROUS) قرن کے آغاز میں سٹیگوسیفیلیا (STEGOCEPHALIA) پائے جاتے ہیں جو جل تھلی (AMPHIBIANS) جانوروں کے متنوع اور دیو ہیکل شکلوں والے ایک اہم گروہ کے نمائندے ہیں۔ ان میں سے بعض تو چوپائے تھے۔ بعض اژدہاؤں کی مانند تھے جن میں ہاتھ پیروں کا وجود ہی نہ تھا اور پھر بعض ایسے بھی تھے جن کے کاسۂ سر تین فٹ طویل تھے۔ یہ وسیع گوناگونی ایک طویل سلسلۂ اجداد کا اظہار کرتی ہے۔ اپر ڈیوینین (UPPER DEVONIAN) قرن میں ایسے نقش پائے ملتے ہیں جن کو ان جانوروں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لہذا کل بھوری حیوان کا بریں زا

قرن سے پہلے معرضِ وجود میں آچکے تھے اور ان کے ڈھانچے مچھلیوں کے ڈھانچوں سے بہت پہلے مکمل ہوچکے تھے۔ اس سے ہم صرف یہی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مچھلیوں اور مینڈکوں کے ہر دو جماعتوں کا کوئی مشترکہ مورثِ اعلیٰ تھا۔ یہ کون تھا؟ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔

جل بھومی جانور جب پوری تکمیل پالیتے ہیں تو زمین پر آتے ہیں لیکن جب تک یہ نہ ہو وہ سمندر ہی میں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس رینگنے والے جانور کلیتاً ارضی ہیں۔ عنصر ہوا میں ترقی کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ کوئی ایسا آلہ ان میں ہو جس کی بدولت جنین براہِ راست ہوا میں سانس لے سکے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس آلے کے ارتقا کی تواریخ کلیتاً پردۂ خفا میں ہے۔ یہ ایک ایسے تغیر کی مثال ہے کہ جو تغیر ان جانوروں کو جنہیں یہ آلہ مل گیا ہے کوئی فوری منفعت نہیں بخشتا لیکن جو ایک بعید اور اعلیٰ مرحلے کے حصول کے لئے لازمی قدم ہے، یعنی دودھ پلانے والے جانوروں کی منزل تک پہنچنے کا۔ یہ خیال کرنا ممکن تھا کہ مچھلیوں کے بعض اقسام جو ڈیوونین قرن میں موجود تھیں اور پانی اور ہوا دونوں میں سانس لینے کے قابل تھیں زیادہ مکمل اور زیادہ فطرت کی پسندیدہ تھیں بصریاً یہ صورت نہ تھی کیونکہ آج جنوبی امریکہ میں ان کے چند اصناف ہی

فی الواقع پائے جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمیں یہ خیال ہرگز قائم نہ کرنا چاہئے کہ بعض اعضا کی پیچیدگی ارتقا کے نقطہ نظر سے ہمیشہ ترقی کا اظہار کرتی ہے۔ فطرت نے اکثر ایسے حیرت انگیز حل پیش کئے لیکن ان کا تجربہ کرنے کے بعد ان کو نظر انداز کر دیا۔ مثال کے طور پر ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں ابتدائی قسم کی آنکھیں تعداد۔ محل وقوع اور ترقی کے مدارج کے اعتبار سے ادلتی بدلتی رہیں۔ گانٹھ دار جوڑوں والے جانوروں میں چھوٹی سادہ آنکھوں کے علاوہ مرکب آنکھیں بھی اکثر پائی جاتی ہیں۔ بعض مچھلیوں کی چار آنکھیں ہوتی تھیں دو پانی کے اندر دیکھنے کے لئے (شعاع نور کے لئے ضروری اصلاح کے ساتھ) اور دو سطح آب پر دیکھنے کے لئے۔ یہ بے کار پیچیدگی بعد میں ترک کر دی گئی۔ بعض رینگنے والے جانوروں کے پاس تیسری آنکھ بھی تھی (صنوبر کے ثمر کی مانند) جس کا محل کاسۂ سر کے اوپر تھا۔ چھپکلی کی قسم سفینوڈون میں جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ایسی آنکھ کا بہت ہی واضح نشان ملتا ہے اور اسلاف میں یہی شئی اچھی حالت میں تھی، لیکن یہ بھی ترک کر دی گئی۔ بہار ارتقا کے منصوبے کے اصول کو تو باقی رکھا گیا لیکن حل بدلتے رہے۔ ہر واقعہ ہمیشہ اس طرح وقوع میں آیا جیسے کوئی مقصود پیش نظر

تھا جس کو حاصل کرنا تھا اور تغیرات کی روح رواں بھی مطمح نظر تھا جسے ارتقا کی وحی سمجھنا چاہیئے۔ ہر وہ سعی جو مقصدِ حقیقی کو قریب تر لانے میں ناکام رہی وہ فراموش کردی گئی یا خارج کردی گئی۔

جل بھومی جانوروں کے متعلق بھی ایک مسئلہ حل طلب ہے اور وہ یہ کہ اس گروہ کے نمائندوں کا ماخذ کیا ہے۔ یعنی۔ اس گروہ کے نمائندے انورا (ANURA) یعنی بے دُم کے غوک اور بھدی قسم کے مینڈک اور کوڈیٹا (CAUDATA) یعنی سمندر (آگ کا کیڑا) ہیں۔ یہ جانداروں کے دونوں طبقے جیوریسک (JURASSIC) اور کری ٹیشیس (CRETACEOUS) قرنوں میں پہلی بار نمودار ہوئے۔ اور ان کے متعلق یہ تسلیم نہیں کیا گیا کہ یہ کاربن زا دور کے مینڈکوں کے اخلاف ہیں۔ اگر مچھلیوں سے بھی قبل کے کسی مشترکہ خاندان کے یہ خلف ہیں تو وہ خاندان کیا تھا اور دونوں کے درمیانی کڑیاں کیا ہوئیں جواب تک دریافت نہیں ہوسکیں؟

اولین رینگنے والے جاندار اعلےٰ کاربن زا دور میں ملتے ہیں لہذا یہ سٹیگو سے فیلیا (STEGOCEPHALIA) کے انحطاطی زمانے کے ہم عصر ہیں۔ ٹرائی ایسک (TRIASSIC) دَور سے لیکر پورے دوسرے دَور بھر یہ زمین پر۔ میٹھے پانی میں اور سمندروں میں وہ

اور جانداروں سے زیادہ اکثریت میں رہے ہیں۔ رینگنے والے جانوروں کی سب قسمیں جن کا تعلق ICHTHYOSAURIA SAURICHIA اور (LACERTAC) کے تین طبقوں سے ہے "یکایک" نمودار ہوئے اور ان کا کسی ارضی سلف سے رشتہ قائم کرنا ناممکن ہے۔ کچھوؤں پر بھی بالکل یہی بات صادق آتی ہے۔

ہم نے "یکایک" کے الفاظ کو علامات اقتباس کے ساتھ یوں مقید کیا ہے کہ مسئلہ کی حیثیت نمایاں ہو جائے۔ کسی کا بھی یہ خیال نہیں کہ کچھوؤں کے کھپڑے یا بعض ڈینوسارز DINOSAURS کی ہڈی کی بنی ہوئی کلغیاں خود بخود اور تیز رفتاری کے ساتھ تشکیل پا گئی ہونگی۔ یقیناً ایک طویل سلسلہ تغیرات کا ضرور ہوگا جس کے بغیر ان زرہ بکتروں کے وجود میں آجانے کا تصور میں لانا بھی ممکن نہیں۔ لیکن کوئی ایسے ٹھیک ٹھیک واقعات ہمارے پاس نہیں جن سے استدلال کیا جا سکے اور درمیانی کڑیوں کا کوئی پتہ نہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ دور ثانی TRIASSIC, MESOZOIC کے آغاز ہی میں یعنی بیس کروڑ برس پہلے اولین ذوات الثدی "یکایک" نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئے؟ بظاہر اس دور کے رینگنے والے جانداروں میں سے یہ پیدا نہیں ہوئے کیونکہ وہ

خود اپنے ارتقا کے آغاز میں تھے۔ چل بھومیوں میں سے بھی ان کا پیدا
ہوجانا امکانی صورت نہیں کیونکہ ایسی جست نہایت وسیع اور بعید
از قیاس ہے اور اسی وجہ سے مچھلیوں کے گروہ سے بھی وہ معرضِ
وجود میں نہیں آسکتے۔ یہ نہیں تو پھر ہمیں پری کیمبرین دور میں ان
کے مشترک مورث کی تلاش کرنا ہوگی اور یہاں بھی ویسے ہی سوالات
کا سامنا ہوگا۔ بعض ماہرانِ معدومیات کو اس بات پر اعتماد ہے
کہ ایک اور صرف ایک ٹرائیٹی لوڈن (TRITYLODON) کھوپڑی
جس سے درمیانی کڑی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ یہ کھوپڑی ہر دو رینگنے والے
جانداروں اور تھنوں والے جانداروں کی خصوصیات کی حامل ہے
اس بارے میں کسی قطعی فیصلے کے اعلان سے پہلے نئے انکشافات
کرنے کی ضرورت ہوگی۔

کہا تو یہ جا سکتا ہے کہ دس کروڑ برس میں بہت ساری چیزوں
کا وقوع پذیر ہونا ممکن لیکن ایسا کہنے کی تحریص سے بچنا چاہیئے۔ اگر ایک
سال میں کوئی واقعہ نہیں ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ جو واقعہ نہیں ہوا
اس کے وقفے کو دس لاکھ یا دس کروڑ گنا کرنے سے اس وقفہ کے
اختتام پر وہ واقعہ ہو جائے گا۔ نقطۂ آغاز کا ہونا خواہ وہ کتنا ہی
حقیر کیوں نہ ہو لازمی ہے۔ محض اتفاق کی بدولت ایک یا بہت سارے

نقاط آغاز قابل فہم ہیں لیکن جو چیز کہ اس سے کم ادراک پذیر ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی نقطۂ آغاز مثلاً ترقی کرکے پنکھ بننے کے قابل موجود ہوا تو بلا لحاظ انواع خواہ کیڑے ہوں رینگنے والے جاندار ہوں پرندے ہوں یا ذوات الثدی تو وہ بالآخر پنکھ بن کر رہا۔ فطرت نے اس مسئلے کے تین حل پیش کئے۔ مگر سب سے زیادہ بدحواس کرنے والا اتنا یہ امر نہیں کہ مرکزی ارتقا سے غیر متعلق انواع میں کوئی خاص سیرت پیدا ہو جائے جتنا کہ اس اصل سلسلے کی پیہم ترقی جو بالآخر اپنی عروجی نقطے پر انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

رینگنے والے جانداروں کے پورے دور میں جو دس کروڑ برس چلا، ذوات الثدی صرف جیے گئے اور کوئی ترقی وہ نہ کرسکے۔ آج کل کے تھیلی دار جانداروں سے ملتے جلتے وہ چند انچ لمبے بے آنول نال کے جاندار تھے۔ ان میں سے بعض کیڑے کھاتے تھے کچھ گوشت خور تھے اور کچھ کترنے والے جانداروں کی قسم کے تھے۔ اسی ٹن وزنی ہیکل ڈائنوساروں کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور درجنوں ایسے ذوات الثدی ان کے پاؤں کے نیچے آکر رُند جاتے تھے۔ ان دنوں کون پیش بینی کرسکتا تھا کہ یہی حقیر جاندار اپنے مستقل بدنی درجہ حرارت، مقابلتہ زیادہ ترقی یافتہ دماغ، اور اولاد پیدا کرنے کے بہتر طریقے کی بدولت

مستقبل کے مالک ہیں کیونکہ یہ ان عظیم الجثہ رینگنے والے جانوروں کے مقابلہ میں جن کے پاس ادنیٰ ذہانت تھی اور جو درجۂ حرارت اور ہوا کی رطوبت کے مخصوص حالات کے غلام تھے ایک معتد بہ ارتقائی برتری کے حامل تھے۔ پانچ کروڑ برس تقریباً گذرے ہیں کہ یہ ساریاتی (رینگنے والے جانوروں کی ایک قسم) معدوم ہوگئے۔ اور ذوات الثدی کا دور دورہ شروع ہوگیا جو ہمارے زمانے تک پھیلتا اور مستحکم ہوتا ہوا چلا آیا۔

اعلیٰ کاربن زا دور جس میں رینگنے والے جانداروں کا آغاز ہوا تھا اسی میں جل بھومی جانداروں کے انحطاط کا افتتاح بھی ہوگیا تھا اور اسی دور میں حشرہ (کیڑے مکوڑے) کی بہت کثرت بھی معرض وجود میں آگئی تھی۔ ایک ہزار کے قریب ان کے اصناف شناخت کیے جاچکے ہیں لیکن ان کی ماضی کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اگر یہ کسی مشترکہ نسل کے اخلاف ہیں تو ہم کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب وہ اس مشترکہ نسل سے کٹ کر اپنے طور پر ارتقا کی ایک ڈنڈی پر چل نکلے۔ ان حشرہ میں سے بعض بہت بڑے بھی تھے جن کے پروں کا پھیلاؤ ۲۸ انچ تک کا تھا۔ لیکن ان کی اُڑان تتلیوں سے ملتی جلتی ضرور بھدی ہوتی ہوگی۔ جانداروں کی یہ کیفیت تین یا چار کروڑ برس کے طویل عرصے

تک بدستور رہی یعنی پرمئین (PERMA N) قرن بھر اور دورِ ثالثی
کے آغاز تک۔

اُس زمانے میں زمین پر ایک عجیب قسم کی ہری روئیدگی
چھائی ہوئی تھی ہوا رطوبت سے بھرپور تھی اور کرۂ ہوا دم گھونٹنے
والا۔ بڑے بڑے سیاہ بادل موٹے دل والے آسمان پر تیزی سے
دوڑتے پھرا کرتے تھے جن کی وجہ سے سورج کبھی مشکل ہی سے دکھائی
دیتا ہوگا۔ طوفانی بارشیں بغیر وقفے کے برستی رہتی تھیں۔ سڑی گلی سبزیوں
کی سڑاند سے بھرپور غیر شفاف کہرا ہری مناظر کو ڈھکے رکھتا تھا شدید
باد و باراں کے طوفان ہر وقت آتے رہتے تھے۔ خود زمین اپنے
لاتعداد آتش فشاں پہاڑوں میں سے آگ برساتی رہتی تھی اور
ایک سوہانِ روح میں مبتلا عفریت کی طرح رعشہ بر اندام سسکیاں
لیتی رہتی تھی۔ مشتعل چٹانیں پگھلے ہوئے مادہ کی شکل میں دلدلوں میں
گرگرا کر انبوہ در انبوہ بھاپ بناتے تھے۔ عظیم الشان تیرہ و تار جنگل
زندہ اور مردہ حشرات الارض سے معمور تھے اور بجلی کی چمک اور
پگھلے ہوئے لاوے کی سرخ روشنی میں بڑے بڑے پروں والے کیڑوں
کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہوگی مگر میدانوں اور وادیوں میں پھول
کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ممکن ہے یہی امر حشرہ [illegible] وجود کا باعث

بھی رہا ہو۔

اس وحشت ناک اور المناک زمانے کے بعد تقریباً مکمل سکون کا دور آیا جو پورے ارضی دور ثانی (MESOZOIC) کے تیرہ کروڑ برس کے عرصے پر ممتد رہا۔ زلزلے اور جوالامکھی پہاڑوں کی آتش فشانیاں تقریباً بند رہیں۔ مگر سطح زمین ساکن نہ رہی اور مختلف خطوط میں ابھرتی اور گرتی رہی۔ کہیں سمندر نے براعظموں کو آدبایا اور کہیں وہ پیچھے ہٹے اور ہٹتے ہوئے ساحلی جھیلیں پیچھے چھوڑ گئے جو بعد میں خشک ہو گئیں اور نمک کے ذخیرے اس عمل پر شاہد ہوئے۔ مگر یہ بری و بحری جنبشیں بہت آہستہ لیکن لگاتار ہوتی تھیں اور عالمگیر سکون میں خلل انداز نہیں ہوتی تھیں۔ آب و ہوا معتدل تھی۔ موسموں کا وجود سوائے قطبین کے قریب کے خطوں کے اور کہیں نہ تھا۔ اور ہر جگہ کرۂ ارض پر درجہ حرارت ایک سا تھا جیسے کہ آج بھی بحر جنوبی کے جزائر میں پایا جاتا ہے۔

اغلباً یہی وہ زمانہ تھا جب حشرات نے حیرت انگیز جبلی ترقی کی۔ ہمارے موجودہ زمانے کے درختوں نے قدیم صنوبری درختوں کو دھکیل کر بعض میدانوں سے باہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ شمشاد۔ بید مجنوں۔ برچ۔ سفیدے۔ شاہ بلوط وغیرہ اشجار معرض وجود

میں آ گئے اور ان کے ساتھ ساتھ پھول بھی نمودار ہونے لگے۔ روئیدگی کی مسلسل ترقی نے حشرہ کی تعداد پر بھی اثر ڈالا۔ باوجود اس کے عملاً موسموں کا فقدان تھا اور شدت سرما، پھر بھی ان کی زندگی کے دن کم نہیں ہوئے اتنی عمریں ان کی ضرور رہیں کہ وہ تجربہ حاصل کر لیں اور اپنی اولاد کی حفاظت کر کے پروان چڑھا لیں۔ چونکہ ان کی سرگرمی چند حرکات وسکنات تک ہی محدود تھی اور وہ یکساں رہتی تھیں اور یکساں ماحول سے وہ فیض یاب ہوتی تھیں اس لئے ان کی وہ جبلی حرکات وسکنات غیر شعوری ہو کر رہ گئیں بالکل عادات کی طرح بن گئیں جن کے نتیجہ میں ان کا دماغ ترتیب پانے لگا اور ارثاً ان کی اولاد کو منتقل ہونے لگا۔ انہیں عادتوں نے آگے چل کر مستقل افعال اضطراری کی شکل اختیار کر لی جو معین اوقات پر بلا ارادہ ان سے سرزد ہوتے تھے۔ بہرحال جیسا بعض اکابر ماہرین علم حیات کا بھی خیال ہے یہ بظاہر معقول بات معلوم ہوتی ہے کہ واقعات زندگی کچھ اسی طرح پر رونما ہوئے۔

تیسرے ارضی دور کے وسط (یعنی OLIGOCENE اور MIOCENE قرنوں میں، جب چٹانی پہاڑ، ہمالیہ، اٹلس اور ایلپس وجود پذیر ہوئے) جب سردیاں بڑھیں تو ان سے بعد میں آنے والی حشراتی نسلیں منتشر

ہوگئیں لیکن لاکھوں برسوں کی مرتب کردہ عادات وغیرہ ختم نہیں ہوئیں۔ حشرات الارض اب بھی ویسے ہی اعمال بجالاتے ہیں جیسے ماضی میں اور پیدائش کے ساتھ ہی ان کو ان اعمال کا بھی علم ہوتا ہے جن کا ان کی قصیر عمروں میں نئے سرے سے سیکھنا ممکن نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر گروہ۔ طبقہ یا خاندان ناگہانی طور پر بھی پیدا ہوتا معلوم ہوتا ہے اور کبھی مشکل ہی سے وہ صورتیں میسر آتی ہیں جو ان کو کسی مقدم مختلف گروہ سے بطور کڑی جوڑ سکیں۔ جب ہم کسی نوع کا انکشاف کرتے ہیں تو اسے پہلے ہی سے مکمل طور پر ایک ممیز نوع پاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ہم کو عملاً کوئی عبوری صورتیں نہیں ملتیں بلکہ کسی نئی صنعت کو کسی قدیم صنف کے ساتھ وثوق کے ساتھ مربوط کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیلی کم و بیش یکایک ہوئی یا کم و بیش بتدریج۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ قیاس غالب کا تقاضا یہی ہے کہ صرف وہی انواع منتجر صورت میں ہمیں دستیاب ہوتی ہیں جو اتنے لمبے عرصے تک قائم رہیں کہ ان کے افراد کی تعداد کثیر ہو اور زمین کے وسیع خطوں میں وہ پھیل گئے ہوں۔ اس لئے یہ امر موجب حیرت نہیں کہ ان کی ابتدائی

ہم کو نہیں ملتیں۔ یہ باتیں ان اہم نتائج کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک شہادت میں پیش نہیں کئے گئے یعنی یہ کہ عبوری صورتیں مستقل صورتیں نہیں ہیں۔ ان کی نسل کی افزائش کثیر بھی نہیں ہوتی اور پھیلتی بھی نہیں۔ ایک اور امر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز یوں وقوع پذیر ہوتی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی مطمح نظر کا حصول پیش نظر ہو تکمیل کی کوئی اعلےٰ منزل جس کے لئے اور ترقی کرنا مقدر ہو۔ گویا کہ درمیانی صورت کی اہمیت اسی وقت زائل ہو جاتی ہے جب کہ اگلی منزل کا آغاز ہو جاتا ہے۔

دو منزلوں میں بعینہ ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسا ابتدائی نمونے کو کلوں سے تیار کردہ مصنوعات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جس میں لازمی ہے کہ آخری نمونے کو کلوں سے تیار کردہ مصنوعات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جس میں یہ لازمی ہے کہ آخری نمونہ مزید اصلاح کا حامل ہو ایسی برتری جو پہلے نمونوں میں نہ ہو اور جو آخری نمونے کو ایسی فوقیت بخشے کہ اس کی پیدا کردہ مصنوعات وسیع پیمانے پر آزمانے کے قابل سمجھی جائیں۔ قدرتی ارتقا میں ضروری ہے کہ آزمائش میں نہ آئی ہوئی خصوصیات ارثی ہوں۔

ارتقا کے صدری مسائل پر غور و فکر کرنا لازمی تھا کیونکہ نفسیاتی

سطح پر بنی نوع انسان کے مزید مطالعہ میں جسے ہم ارتقا کی عمومی عملوں کے ساتھ مربوط کرنے کی سعی کریں گے ہم کو ایسی میکانکیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جیسی کہ ہم معائنہ کر چکے ہیں۔ اپنے مفروضہ کو ثابت کرنے کے لئے ہمارا فرض تھا کہ ہم ناظر کے غور کے لئے وہ سب واقعات مہیا کر دیں جن کی بدولت وہ اس مماثلت کو سمجھ لے۔

سمجھنے کی سعی کریں گے تو جب تک ہم کسی نہ کسی قسم کے اتمامی مقصد کو کام میں نہ لائیں گے ہم یقیناً گمراہ ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں بخت و اتفاق اکیلا، ارتقائی منظر کو جس میں رجعت قہقری ممکن نہیں، واضح کرنے کیلئے قطعاً ناقابل ہے۔

اگر ہم تصور ارتقا کو قبول کریں تو ہم کو یہ امر بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ابتدائے آفرینش سے اوسطاً ان نے ایک صعودی راہ اختیار کی ہے جس کی سمت ہمیشہ واضح رہی ہے۔ اس خیال پر یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے کہ حیوانات کے اکثر تغیرات بہتری پر مشتمل نہ تھے۔ مثال کے طور پر جیسے کہ بعض اقسام بارہ سنگھا کے سینگوں کی مبالغہ آمیز ترقی یہ اعتراض صحیح ہے۔ اور اسی وجہ سے ہماری یہ رائے ہے کہ مذکورہ بالا تمثیل کی مطابقت میں عملِ ارتقا میں ہم ایک اتمامی یا آخری مقصود کا مفروضہ شامل کریں جیسے تمثیل میں کششِ ثقل ہے یعنی ایک دور رس غائیت جو بحیثیت مجموعی عملِ ارتقا کی رہنمائی کر رہی ہے بلا ریب ہر طرح کے تجربے کیے جاتے رہے ہیں بعض اوقات کامیاب اور بعض اوقات ناکام اگر ہم یہ تصور کریں کہ کوئی خاص مطمحِ نظر حاصل کرنا مقصود ہے تو کششِ ثقل کی طرح عمل کرتے ہوئے جب ایک بار آغاز ہو جائے تو سب امکانی اجتماعات کو آزمانا تھا اور

ان کے منفاد یا قدر کو ماحول پر ان کے ردِعمل سے ثابت کرنا ضروری تھا۔ اگر نئی شکلیں ماحول سے لگا نہیں کھاتیں تھیں اور اس قابل نہ تھیں کہ ارتقا کی کسی نئی منزل کے لئے نقطۂ آغاز بن سکیں یا اگر دوسرے خاندان ان پر سبقت لے جاتے تھے تو وہ شدہ شدہ پردۂ عدم میں چلی جاتی تھیں یا اہم جد و جہد سے محروم ہو کر صرف جیئے جاتی تھیں اس طرح خود کسی نوع کا مفہوم ایک ثانوی ماحصل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ نوع کے جس مفہوم کو اہمیت حاصل ہے وہ وہ ہے جو بحیثیت مجموعی ارتقا کی ایک کڑی متصور ہو سکے۔ ماحول سے مطابقت کر کے جو عجیب الخلقت جانور وجود میں آ گئے ان کی اہمیت سرکس میں حیرت انگیز کرتب دکھانے والے حیوانات سے زیادہ نہ تھی۔ ماحول سے مطابقت اور بقائے اصلح کے اصول اب ارتقا کے لازم و ملزوم جز نہیں سمجھے جاتے۔ موخر الذکر اپنے دریاب مطمح نظر کی وجہ سے اول الذکر سے ممیز ہے اور یہ دریاب مقصد ہر نوع پر چھایا رہتا ہے۔

اس مفروضے میں ڈارون کے خیال کے برعکس کسی قدرتی طور پر نشو و نما پانے والے خاندان کے لئے بقائے اصلح کے اصول کو اب نقطۂ آغاز تصور نہیں کیا جاتا اور خارجی احوال (جیسے آب و ہوا وغیرہ)

کے تبدیل ہونے کی وجہ سے یہ ہوسکتا ہے کہ بعض نسل کا اصلح بالآخر ایسی
نوع کو جنم دے جس کے مقدر میں معدوم ہو جانا یا محض بچے جانا ہو
یا اور افراد اصول غائیت کے زاویۂ نگاہ سے ان اصلح کی جگہ لے
لینے کے زیادہ اہل ہوں۔

آیئے اس امر کو ذرا اور واضح کریں۔ زندہ اجسام نامی کے
اوصاف یا خواص کو اب مخصوص اصولوں سے منسوب نہیں کیا جاتا
جیسا کہ پرانے حیاتاتی نظریوں میں کیا جاتا تھا۔ بلکہ محض یہ فرض
کیا جاتا ہے کہ ایک غایتی مقصد کا حصول طبعی کیمیائی ضابطوں اور
معمولی حیاتیاتی قوانین کے مطابق اور حد درجے متنوع طریقوں سے
پیش نظر ہے۔ فطرت اکثر زندہ اجسام کے بارے میں بخت و اتفاق
اور احتمال کے قاعدوں سے بھی کام لیتی ہے۔ مچھلیاں لاکھوں انڈے
دیتی ہیں گویا انہیں اس بات کا علم ہے کہ جن حالات کے ماتحت
انڈے سیئے جائیں گے ایسے ہیں کہ نوے فی صدی انڈے غارت
ہو جائیں گے۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہم زندہ ہستیوں کے ارتقا یا نوعِ انسانی
کی نفسیات کو سمجھیں تو جیسے ہم عضویاتی وظائف پر علیحدہ علیحدہ غور
نہیں کر سکتے ویسے ہی ارتقائی تغیرات پر بھی علیحدہ علیحدہ غور

جیسے کہ بعض اس بات کا علم ہے

نہیں کر سکتے۔

مختصر یہ کہ ارتقا کو پورے کرۂ ارض کا ایک ایسا مظہر سمجھنا چاہیے جو بغیر رجعت قہقری کے ترقی کرتا رہتا ہے اور جو نتیجہ ہے ابتدائی ارتقائی وصیغوں کی متحدہ سرگرمیوں کا، جیسے مطابقت احول (لیمارک LAMARCK) بقائے اصلح (ڈارون DARWIN) اور ناگہانی تبدل نوعی کا (NAUDIN-DE VRIES)عمل ارتقا کا آغاز بے شکلے ذی حیات مادے سے یا ایسے وجودوں سے جیسے کوایتو سائیٹس (COENOCYTES)[1] جن میں ابھی خلیوں کی تعمیر ہونا باقی ہوتی ہے اور اس کا اختتام ایک حامل فکر انسان پر ہوتا ہے جس کو ضمیر بخشی گئی ہے۔ اس کا سروکار محض اس سلسلے سے ہے جو یوں محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف انہیں زندہ وجودوں کی نمائندہ ہے جو اس بے مثل سلسلے پر مشتمل ہیں جو ہوشمندانہ طریق پر پیچ و خم کھاتے ہوئے زندہ اجسام کی شکلوں کی ایک کثیر تعداد میں سے ہو کر نکلتا ہے۔

ہم پھر اس حقیقت کی تکرار کرتے ہیں کہ عمل ارتقا جبھی قابلِ فہم

---

[1] ذی حیات مادہ مرکز ہوں کے گچھوں کی شکل میں ہوتا ہے اور ایسی مرکز ہوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لئے دیواریں نہیں بنی ہوتیں کہ خلیات بن جائیں۔

ہو سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کریں کہ ایک غایت، ایک متعین اور دوررس مقصد اس کے پیش نظر ہے۔ اگر ہم اس سمت نما شمع ہدایت کی حقیقت کا اعتراف نہ کریں تو پھر نہ صرف ہم کو اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ اصولِ ارتقا، جیسا کہ ہم پہلے واضح کر آئے ہیں، شدت کے ساتھ مادی کلیوں کے منافی ہے اور اس سے بھی اہم یہ امر ہے کہ انسان میں اخلاقی اور روحانی تصورات کا ظہور تو ایک قطعی معمہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر معمے ہی سامنے آئیں تو یہی زیادہ مناسب ہے زیادہ منطقیانہ اور ہوشمندانہ طریق ہے کہ ہم ان میں سے اسے اختیار کریں جو کسی قدر وضاحت کرتا ہو اور ہماری ادراکی ضرورت کی تسکین کرے۔ جو امید ورجا کے لئے دروازے کھولے نہ وہ کہ جو ان دروازوں کو بند کر دے اور کچھ وضاحت بھی نہ کر سکے۔

اس کے برعکس ماحول سے مطابقت۔ بقائے اصلح اور تبدل ذہنی (MUTATION) کے اصول ایسی وضعیتیں ہیں جن سے ارتقا کی سست رفتار تعمیر میں تو مدد ملی ہے لیکن یہ خود ہمیشگی کے ساتھ مائل بہ ترقی نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو جیسے ایک راج کو جو کسی گرجے کی تعمیر میں لگا ہوا ہے اس عمارت کا تعینی عنصر قرار نہیں دیا جا سکتا ویسے ہی وضعتوں کے ان اصولوں کو عام عمل ارتقا کا تعینی عنصر

نہیں کہنا چاہیئے۔ راج بذات خود ایک پیچیدہ عنصر ہے جو طبعی، کیمیاوی، حیاتیاتی، انسانی، سماجی قوانین کے تابع ہے۔ کلیسا کے ساتھ اس کا اتصال صرف کڑی کی وساطت سے ہے اور ایک ماہرِ فن تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے وہ محض کڑی ہے۔ اس کی خانگی زندگی۔ اس کے ذاتی المیے اس کی علالت غیر اہم ہیں۔ خود بڑے پادری کے نزدیک جس نے کلیسا کے تعمیر کرانے کا عزم کیا ہے یہ راج صرف ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے یہی بات ان قدرتی اعمال پر بھی صادق آتی ہے جن کو مجموعۂ عمل ارتقا کی وضعیتوں (MECHANISMS) کا ایک کلّی نام دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک عمل ارتقا کی مادی اور شماریاتی امداد کرتا ہے لیکن جن ضابطوں کے یہ پابند ہیں وہ بعینہٖ وہ ضابطے نہیں جو ارتقا کے ہیں اور ارتقائی قانون ان پر حکمرانی کرتا ہے اور ان کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اسی طرح جن ضابطوں کے تحت جوہر (ATOM) حرکت کرتے ہیں وہ خاص ضابطے ہیں اور وہ ان ضابطوں سے مختلف ہیں جو خود جوہروں کی کیمیاوی خواص پر عمل پیرا ہیں۔ اور جہاں تک کہ ہماری حقیقی سائنس کا سروکار ہے موخرالذکر خواص کا کوئی کیفی یا کمّی ربط ہماری نفسیاتی سرگرمی کے ساتھ نہیں معلوم (؟) احوال میں قیاسی چیزیں شامل کر کے یہ پیشگوئی کرنا کہ ایک دن یہ

رشتہ منکشف ہو جائے گا واقعات اس کی تصدیق نہیں کرتے اور یہ مطلقاً مفروضہ ہی مفروضہ ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ معلوم چیزوں سے نامعلوم چیزوں پر حکم لگانے کا (EXTRAPOLATION) ایسا اصول ہے جس سے اخلاقیات سے زیادہ سائنس میں چوکس رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ انسان کا علمی تجربہ اس کے نفسیاتی تجربے سے بہت ہی کم ہے۔ سائنس میں نئے انکشافات آئے دن ہوتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے اسے اپنے پہلے تصوّرات پر تمام تر نظرثانی کرنا پڑتی ہے۔ سائنس کی تواریخ ایسے ہی انقلابات سے معمور ہے۔ جوہری نظریے حرکی نظریئے۔ برقیا کے ذراتی نظریئے۔ توانائی۔ اور روشنی :تاب کاری۔ نظریہ اضافت ان سب نے مل کر کامیابی کے ساتھ ہمارے نقطۂ نگاہ کی اوپر سے نیچے تک کا یا پلٹ کر دی ہے۔ سائنس کا مستقبل ہمیشہ سے نئے انکشافات اور نئے نظریوں کے رحم وکرم سے ہی وابستہ ہے۔ حیات کے علم کی عمر ابھی دوسو سال بھی نہیں ہے حالانکہ جو علم انسان سے متعلق ہے اس کی عمر پانچ ہزار برس سے بھی زیادہ ہے۔ عملی نفسیات مصر کے تیسرے خاندان کے عہد حکومت میں بہت کچھ ترقی کر چکا تھا اور پچیس سو سال قبل بڑے بڑے حکما کو انسان کے متعلق اتنا علم

تھا جس پر اب بھی معتد بہ اضافہ نہیں ہوا بلکہ آج صرف اس پر مہر تصدیق لگائی جا رہی ہے۔ لہذا یہ فرض کرنا معقول پسندی ہے کہ معلوم چیزوں سے نامعلوم چیزوں پر حکم لگانے کا اصول اخلاقیات میں بہ نسبت سائنٹیفک امور کے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ باوجود اس امر کے کہ اخلاقی دریافتیں ریاضیاتی طریق پر ظاہر نہیں کی جاسکتیں۔ قوانین ارتقا میں غائیت کا پہلو مضمر ہے لیکن انواع کے تغیر و تبدل کے ضابطے ماحولی احوال کے ساتھ ایک توازنی منزل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر چیز اسی طرح پر وقوع پذیر ہو رہی ہے گویا کہ ماحول سے مطابقت کرنے کے نتیجے میں جو تغیرات ہوتے ہیں) ۔ ان کا انحصار کچھ تو بخت و اتفاق پر ہے اور کچھ ان حیاتیاتی ضوابط پر جو اب تک نامعلوم ہیں جیسے گویا اغلباً کسی حد تک وہ کارنو کلاسیس (CARNOT-CLAUSIUS) کے اساسی طبعی قانون سے آزاد ہیں۔

ماحول سے مطابقت۔ بقائے اصلح۔ تبدلات کے اصولوں کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ کم متعارف اور پیچیدہ تغیرات و ترکیبات کے نتائج کا اظہار ہیں مثال کے طور پر جیسے توالد و تناسل

کے متعلق مینڈل (MENDEL) اور وائزمین (WEISMANN)
کے ضابطے یا اور امور کے متعلق۔ یہ ترتیبات و ترکیبات خودشاہدے
کے ایک دوسرے پیمانے کے مطابق اظہار ہیں ان اساسی مظاہر
کا جو بحیثیت مجموعی عملِ ارتقاء کے مبادی ہیں جیسے کہ طبیعاتی۔
کیمیاوی مظاہر جوہری اور سالمی پیمانے کے مطابق۔ اگرچہ بالخصوص
ذی مفاصل حیوانات۔ حشرات الارض۔ گھنگھوؤں اور بہت سے
طفیلی کیڑوں میں ماحول سے مطابقت کے نتائج حیرت انگیز ہیں لیکن
جیسا کہ اب تک خیال کیا جاتا رہا ہے یہ کسی غائیت کی طرف رہنمائی
نہیں کرتے۔ بہرکیف اگر وہ رہنمائی کرتے بھی ہیں تو زیادہ اغلب
یہ ہے کہ وہ اس غائیت سے جو عمل ارتقا میں عمل پیرا ہے لازماً
مختلف ہے۔ غائیت کے قائلوں نے بڑی سنگین غلطی اب تک یہ
کی ہے کہ ان مختلف غائیتوں کو گڈمڈ کر دیا ہے اور مطابقت ماحول
کے محیر العقول دریافتوں کو جو صرف انواع تک محدود تھیں اس
لاانتہا ارتقائی قوت محرکہ کے ساتھ جو سب گروہوں میں کارفرما ہے
مشابہ کر دیا ہے۔

عمل ارتقاء کی میکانکیتوں اور خود ارتقا میں جو فرق ہے
اس کا موازنہ اس فرق سے کیا جا سکتا ہے جو خلیوں کی اس سرگرمی

ہیں جس کے ساتھ وہ کسی فوجی سپاہی کے زخموں کے اندمال میں لگجاتی ہیں "اور موخرالذکر کی اس نیت میں ہے جس کے ساتھ وہ جنگ کا آغاز کرتا ہے اور اس میں سعی کرتا رہتا ہے۔

مطابقت ماحول کا معیار افادیت ہے۔ اس کا عمل شدت کے ساتھ انواع کی منفعت تک محدود ہے۔ لیکن ایسا ممکن ہے کہ ایک مرتبہ جب میکانکیت کا آغاز ہو جاتا ہے تو اندھا دھند کام جاری رہتا ہے اور مطابقت ماحول حماقت کے ساتھ اپنے وظائف ادا کرتا ہے جسکے نتیجے میں وہ بالآخر نہ صرف کسی تکلیف دہ نوع کو جنم دے بیٹھتا ہے بلکہ نہایت درجے مضرت رساں عجیب الخلقت نوع کو بھی۔

ارتقا کا معیار آزادی ہے۔ جب سے حیات کی داغ بیل پڑی' معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کسوٹی کام میں لائی گئی اور وہ یہ کہ ایسے افراد کو انتخاب کیا جائے جن کے مقدر میں یہ بات ہو کہ وہ حیات کی صرف ایک شاخ کو آگے بڑھانے کے ضامن ہوں جو لاتعداد زندہ صورتوں میں سے گزرتی ہوئی بالآخر تخلیق نوع انسانی کی خلعت سے سرفراز ہو سکے۔ ہم آگے چل کر اس تصوّر کو اور پختہ کریں گے۔

ہمارے مفروضے کے اتباع میں' دوررس غائیت' ارتقا کے من حیث الکل طویل مسافت میں اس کی سمت متعین کرتی ہے

اور جب سے کرۂ ارض پر زندگی کا ظہور ہوا ہے اس طرح عمل پیرا رہی ہے کہ ایک دُور رَس رہنما قوت کے بطور ایک ایسی ہستی کی نشوونما کرنے میں لگی رہے جس میں ضمیر ودیعت کی گئی ہو اور جو روحانی اور اخلاقی قوتوں کے لحاظ سے مکمل ہستی ہو۔ اس غایت کے حصول کے لئے وہ غیر منظم دُنیا کے ضابطوں پر اس طرح عمل پیرا ہوتی ہے کہ حر۔حرکیات (THERMODYNAMICS) کے دوسرے ضابطے کا طبعی عمل ہمیشہ ایک ہی سمت کو جھکا رہے ایسی سمت جو غیر متحرک مادے کے لئے ممنوع ہو اور زیادہ سے زیادہ تشاکل DISSYMONETRICS اور روز افزوں مستبعد احوال پیدا کرتا رہے۔

نوعِ انسانی پر منتج ہونے والی ارتقائی شاخ نے، کامیابی کے ساتھ، اور شاخوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ حساس انسان کے ظہور تک تو عضویاتی اور صوریاتی اعتبار سے، اور پھر اخلاقی تصورات کے ذریعے اس خلیج کو اور عریض کیا جو انسان کو حیوان سے علیحدہ کرتی ہے

انسان کو چھوڑ کر باقی ساری مخلوقات جو اب کرۂ ارض پر معرض وجود میں ہے وہ ارتقائی صورتیں ہیں جو دَوڑ میں پیچھے رہ گئی ہیں بعض ان میں ایسی ہیں جو اب قریب قریب مستحکم ہو گئی ہیں جیسے کہ گرہ دار حشرے (ANNELIDA) جو ارضی دور ثانی سے چلے آتے ہیں

اور نیوزی لینڈ کے سفینوڈن (SPHENODON)[1] کچھ ایسے ہیں جنہیں اب بھی سست رفتار تبدل ہو رہا ہے یا رفتہ رفتہ معدوم ہو رہے ہیں سب یا تقریباً سب زندہ موجودات ماحول سے مطابقت کرنے کی سعی میں باحسن طریق لگی رہیں یعنی جب بھی ماحول سے مطابقت مکمل نہ ہو سکی یا جب کبھی خارجی احوال بدل گئے وہ ہمت نہ ہارے۔ لیکن صحیح ارتقائی سلسلے میں پھر سے شامل ہونے کی طرف سے انہیں مایوسی ہو گئی۔

ہر زندہ ہستی ہمیشہ اس دھن میں لگی رہتی ہے کہ وہ طبعی کیمیائی اور حیاتیاتی طور پر ماحول سے مطابقت کرے۔ یہ ویسا ہی تلاشِ توازن کا اعلان ہے جیسے ہم غیر نامی دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں موخر الذکر عالم میں ہر نظام ہمیشہ اپنی پوری توانائی سے موزوں قلیل ترین آزاد توانائی لے کر ایک توازنی حالت کی طرف مائل رہتا ہے۔ اس میلان کو ریاضی کی علامات میں ظاہر کرنا ممکن ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آخری توازنی حالت اعظم احتمال

---

[1] (SPHENODON) مینڈکوں اور غوکوں کی جماعت کے ابتدائی اجداد۔ (از مترجم)

(ریاضی) کے مطابق ہے (BOLTZMAN)[1] ابھی تک ہم اس قابل نہیں ہیں کہ زندہ اجسام کے اپنے ماحول کے ساتھ سکون حاصل کرنے کے رجحان کو الفاظ یا علامات سے ظاہر کرسکیں۔ یہ یقینی نہیں کہ ہم کبھی ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوں گے۔

اکثر کوئی فرد بھی ارتقا کے زینے پر نہیں چڑھتا لیکن ماحول سے مطابقت کرنے پر ہر فرد مجبور ہے۔ ماحول سے مطابقت کے لزوم کو متعین کرنے کے اسباب فرد کے پورے گروہ پر عمل کرتے ہیں۔ ہزاروں ان افراد میں سے جو زندہ رہنے کے لیئے تبدل نوعی پر مجبور ہوتے ہیں صرف ایک بار ایک قلیل تعداد ارتقائی منزل کو طے کر پاتی ہے مگر یہ لازمی نہیں کہ یہ وہی فرد ہو جس نے ماحول کی بہترین مطابقت کی ہو۔ مخصوص داخلی رجحان (طبعی۔ کیمیاوی اور حیاتیاتی) کی مُنظہر مطابقت کا خارجی احوال سے سامنا کر کے فوراً آزمائش کی جاتی ہے۔ اگر یہ نئے افراد آزمائش میں پورے اُترتے ہیں یعنی زیادہ اہل ہونے کی وجہ سے کثیر زا ہوتے ہیں یا

---

[1] (BOLTZMAN) جرمن ماہر طبیعیات جس نے توانائی کے متعلق معرکۃ الآرا تحقیقات کی۔ (از مترجم)

ماحول سے مقابلے میں کم جراحت پذیر ہوتے ہیں تو ان کی نوع چل نکلتی ہے۔ تبدل نوعی۔ مطابقت ماحول اور بقائے اصلح کے تینوں عمل علی الترتیب مشترکہ طور پر کارفرما رہتے ہیں۔

لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ جب مکمل مطابقت کو پیش کرنیوالا توازن حاصل ہوجاتا ہے تو طبعاً جاندار کی آگے قالب یا ہیئت اس عرصے تک رک جاتی ہے کہ جس عرصے میں خارجی احوال اتنے کافی متبدل ہوجائیں کہ نئی مطابقت لازمی ہو جائے اور توازن میں پھر خلل پڑجائے تب یہ نسلی سلسلہ بھی ان لا تعداد منجین شاخوں میں شامل ہوجاتا ہے جو ہزارہا ہزار صدیوں زندہ موجودات کی تواریخ میں ثبت رہ کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں اور گم شدہ ماضی کی اب شہرت مابعد ہوکر رہ گئی ہیں۔ ہماری دنیا کے صحیح حیوانات اکثر عمل مطابقت ماحول کے شاہ کار ہیں لیکن عمل ارتقا کے متروکات میں سے ہیں۔

صرف ایک سلسلۂ نسل ان سب میں ایسا ہے جس نے کبھی توازن حاصل نہ کیا اور باجود اس کے چل رہا ہے۔ یہ وہ سلسلہ ہے جو انسان پر آکر ختم ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مکمل مطابقت ماحول جیسا کہ لامارک اور اس کے پیروؤں کا دعوے ہے کبھی ارتقا کی غایت نظر نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو فقط ایک وسیلہ تھا جس کے ذریعہ ایک عظیم

تعداد نے بے انتہا متنوع افراد کی نشو و نما کی گئی تاکہ دور رس غائیت کی وجوہ کے زیر رہنمائی مناسب انتخاب کا امکان پیدا ہو سکے۔

پری کیمبرین دَور کے بالو میں پائے جانے والے حشرے اغلباً ان حشروں سے زیادہ مختلف نہ تھے جو آج ہمارے سمندری ساحلوں پر ملتے ہیں۔ ان کی ماحولی مطابقت حیرت انگیز تھی اور انسان کی ماحولی مطابقت سے بہت فائق۔ لیکن توازن حاصل کر لینے کے بعد بہت کم متغیر احوال میں رہنے کی بدولت ان کو آگے کایا پلٹ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور وہ کروڑوں برس سے بغیر کسی تبدیلی کے جیئے جا رہے ہیں۔ تاہم ان حشروں میں سے ایک[1] چونکہ اس نے ماحول سے کم مطابقت پیدا کی تھی، ارتقا کے منازل طے کرتا رہا اور اغلباً اس نے ایک ایسی ناپائیداری بہم پہونچائی تھی جو

---

[1] اس نمایاں فرق کو ظاہر کرنے کے لئے جو لاتعداد حشروں اور چند حشروں میں تھا ہم نے یہ بات بے شک بطور استعارہ کے کہی ہے۔ ممکن ہے ان کی تعداد ایک صد ہو یا چند ہزار لیکن کچھ بھی ہو کل تعداد کے مقابلے میں یہ بہت قلیل فی صد تھے۔ علاوہ بریں بہت سے اتفاقی نوعی تبدلات میں سے چند ہی ایسے ہوں گے جن کو بطور انعام کوئی مفید مطلب خاصیت عطا ہوئی ہو۔ (حاشیہ از مصنف)

اُس وقت تو کسی منفعت پر مشتمل نہ تھی، لیکن مزید تبدلات کے لئے مفید تھی۔ اور اسے ہم "تخلیقی نا پائیداری" کہہ سکتے ہیں۔ اس اسلوب بیان سے ہمیں دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ نا پائیداری بذاتِ خود کوئی تخلیقی چیز نہیں ہاں ارتقا کے لئے مناسبت کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ یہ حشرہ چونکہ بطور حشرے کے کم تکمیل یافتہ تھا بہت ممکن ہے کہ یہ انسان کا مورثِ اعلیٰ ہو۔

لہٰذا ہم پھر اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ ماحول سے بہترین مطابقت کرنے والی ہستی ہی ایسی نہیں ہوتی جو عمل ارتقا کی امداد کرے۔ ایسی ہستی زندہ تو رہتی ہے لیکن خلاف توقع اس کی بہتر مطابقت اس کو صعودی سلسلے سے خارج کر دیتی ہے اور اس طرح صرف کم و بیش ان جامد انواع کی تعداد بڑھانے میں امداد دیتی ہے جن سے کرۂ ارض معمور ہے۔

جب سے کول چی سین[1] (COLCHICINE) کے ذریعہ کامیاب تجربات کئے گئے ہیں کسی کو اس میں شک نہیں رہا کہ اکتسابی خواص کی مطابقت ماحول، اور ارث، لازماً ارتقا کے ذرائع پر مشتمل نہیں لیکن

---

[1] یہ ایک مفرد ہے جو نقرس وغیرہ کے علاج میں استعمال کی جاتی ہے۔ (مترجم)

تبدل نوعی کے لئے لابدی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ یہ تبدلات کسی اندھی گلی یا کسی عجیب الخلقت جانور اور کسی تنزلی حالت پر منتج ہوں۔ زود حسی کی طرح یہ ذی حیات مادے کے مخصوص خواص ہیں۔ ان کا بالآخر ایک ہی نتیجہ ہوتا ہے اور وہ تعادل ہے جمود ہے۔

لہذا اعادہ کا خطرہ لیتے ہوئے ہم بہ اصرار یہ کہتے ہیں کہ مطابقت احول کا عمل اندھا دھند اس تعادن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں خود اس کی موت ہے۔ ارتقائی عمل تو صرف ناپائیدار نظاموں یا نامی اجساموں کے ذریعہ جاری رہ سکتا ہے۔ وہ ایک ناپائیدار حالت سے دوسری ناپائیدار حالت میں جانے سے ترقی کرتا ہے اور اگر وہ کسی ایسی حالت میں پہنچ جائے جو مکمل طور پر احول کے مطابق ہو اور پائدار ہو تو وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

چنانچہ حیوانات کی متنوع صورتوں کی بے ترتیب کثرت اور اس متناقضانہ امر کی کہ ارتقاء کی بعض صنعتیں بالآخر اسی کے خلاف جاتی ہیں، ہم کو یہ پہلی توجیہ ملتی ہے۔ علاوہ بریں یہ واضح ہے کہ کسی معیاری مطابقت احول کے لحاظ سے مکمل توازن شاذونادر ہی حاصل ہوتا ہے بالخصوص اعلےٰ اجسام نامی میں۔ اس سے ہمارا مطلب کہنے کا یہ ہے کہ آج جو انواع واقعتاً موجود ہیں ان میں کچھ نہ کچھ آزادی

اور کسی عنصر نا پائیداری جو اکثر گھٹتے گھٹتے بہت کم ہو جاتی ہے موجود رہتی ہے، یہ تسلیم نہ کیا جائے تو یہ سمجھ میں آنا ناممکن ہوگا کہ کس طرح وہ انواع جو قرنہا قرن پہلے ایک پائیدار حالت میں پہونچ چکی تھیں ماحول کے موثرات کے تغیرات سے کروڑوں برس تک مطابقت پیدا کرسکیں۔ لیکن یہ ناپائیداری جو نسل کی پیچیدگی اور عمر کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے صرف ایک ادنےٰ ثانوی مطابقت حاصل کرپاتی ہے اور ایسے غائر تبدلات جو کسی نئی نوع کی تخلیق کا باعث ہوسکیں اس کے مقدر میں نہیں ہوتے۔ تخلیق انواع کی قابلیت تو مدتوں پہلے زائل ہوچکی تھی اور سوائے اس خاص نسل کے جس کا خاتمہ انسان کی تخلیق میں ہونا مقدر تھا بقیہ نسلوں کے تغیرات عموماً حیاتیاتی تفصیلات ہی کی طرف رابح رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے مجمل طور پر بیان کرآئے ہیں زندہ ہستیوں کی اس طرح پر تاویل کرنے سے ان تضاد کی وضاحت ہوجاتی ہے جن کی بدولت ڈارون اور لیمارک کے نظریوں پر بوجوہ ذیل لعن طعن کی جاتی ہے۔ اگر ان کے نظریوں کو درست تسلیم کیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ ایک نسل کا اصلح جب ماحول کے تغیر کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے یا جب ارضی اور آب و ہوائی ہنگامے اس کو اس ماحول کو

چھوڑ بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو ان حالات میں وہی خصوصیتیں جو اس کی فوقیت کی ضامن تھیں بے کار تکلیف دہ بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس وقت عمل مطابقت اپنی ہی سارے مقدم جدو جہد کو باطل کر دیتا ہے اور بقائے اصلح کا عمل جن افراد کو محفوظ کرنے میں لگا ہوتا ہے ان کو خارج کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔

ایسی صورتوں میں صریحاً عمل ارتقا ترقی پذیر نہیں ہوتا بلکہ حفاظتی اور دفاعی بن جاتا ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم نے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ یہ قطعاً ایک طبعی امر ہے کہ رو بہ ترقی رجحان کا انحصار عمل ارتقا پر ہے مطابقت ماحول پر نہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ جب ماحول میں اچانک کوئی تیز تغیر ہوا تو وہ کا یا پلٹ جو کسی نوع میں پہلے ہو چکی ہوتی ہے اور موجود حالات میں مفید ہوتی ہے اور از روئے تشریح ابدان اتنی اہم ہوتی ہے کہ اسے کسی اگلے مماثل عمل سے (مطابقت ماحول انتخاب اصلح) خارج کرنے یا سدھارنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایسی صورت میں اس نوع پر تباہی کا فتویٰ لگ جاتا ہے کیونکہ پھر ان سست رفتار عملوں کے بس کا یہ روگ نہیں کہ کسی ذی حیات نے جو خصوصیتیں بڑی جاں فشانی سے اکتساب کی ہیں اور جو نئے حالات میں اس کے لئے مضر ہیں انہیں

ان کا چھٹکارا کرا سکیں۔ مثال کے طور پر شمالی شائبیریا کے ہرنوں کے بعض اقسام کہ جن کے سینگ بے ہنگم طور پہ بڑھ گئے۔ برفانی دور میں جب برف کے تودے پہاڑوں کی چوٹیوں سے ڈھلک کر میدانوں میں آئے تو انہیں ان میدانوں کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا جن میں اشجار کا پتہ نہ تھا اور ایسے گھنے جنگلوں میں آ گھرے جہاں ان کے بے ہنگم سینگ ان کے لئے آفتِ جان بن گئے اور یہ ہرن بالآخر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے۔

دور رس غائیت کے نقطۂ نظر سے یہ کوئی اہم چیز نہ تھی اور ایسے ہی ہزاروں حادثوں میں سے ایک ناقابلِ لحاظ حادثہ تھا کیونکہ یہ ہرن عمل ارتقا میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر رہے تھے۔ اور ایک ایسی نوع کے دُم چھلا تھے جو مدتوں پہلے ارتقائی سلسلے سے رشتہ توڑ چکی تھی لیکن ارتقائی تصوّر کے مخالفین نے اسی امر کو ہاتھ میں لے کر اسے ارتقا کے خلاف ایک ناقابل تردید دلیل گردانا۔

نئے موثرات جب کسی نوع کی ہستی ہی کو خطرے میں ڈالنے والے نہیں ہوتے اور وقت بے اندازہ میسر آ جاتا ہے تو جاندار کے لئے اس کا امکان ہے کہ وہ رجعتِ قہقری کر کے ترقی پذیر مطابقت ماحول پیدا کرے وہ اس طرح کہ وہ بعض پہلے کے اکتساب کردہ خصوصیات کو زائل کر دے مثال کے طور پر جیسے بل کھود کر زمین کے اندر رہنے والی چھچھوندر

نے رجعت قہقری کرکے اپنی جبلی بصارت کو خیرباد کہہ دیا۔ یہی حال بعض مچھلیوں کی بے بصارتی کا ہے جو ایسی کھوؤں میں رہتی ہیں جہاں روشنی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوتا۔ مطابقت ماحول کے عمل کو اگر موقع مل جائے تو وہ دیو ہیکل اور بدہیئت جاندار پیدا کرسکتا ہے اور جیسے بتایا جا چکا ہے اس کی میکانکیتیں جب ایک دفعہ چل نکلیں تو وہ غیردانشمندانہ عمل کرگزرتی ہیں۔ بعینہٖ جیسے کوئی ہوائی جہاز جو جہازراں سے محروم ہو ممکن ہے گھنٹوں ہوا میں اڑتا رہے لیکن بالآخر زمین پر ہی گرکر برباد ہوگا۔ ارتقا کے ترتیب و تراکیب بھی بعض اوقات جب بے لگام ہوجائیں تو وہ ناآموز ساحر جیسی کارروائی کربیٹھتے ہیں

عملِ ارتقا ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے کہ جیسے وہ کسی قسم کے منفعت بخش غیرتوازنی صورت کی تلاش میں لگا ہوا ہو جس کو وہ عبوری شکلوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو گو اپنے ظہور کے وقت بے ڈھنگی ہی ہوں اور دوسری شکلوں کے مقابلے میں ماحول سے کم ہی مطابق ہوں۔ جیسے کہ ان کی متحجر صورتوں کی کمیابی سے ظاہر ہوتا ہے لیکن بسا اوقات مستقبل میں امکانی توتوں سے معمور ہوں۔ ہم نے "بسا اوقات" کے الفاظ استعمال کیے ہیں کیونکہ بعض حالتوں میں عبوری شکل کسی اہم نتیجے کی طرف رہنمائی نہ کرسکی۔ اسی لیے ہم یہ کہہ

سکتے ہیں کہ عمل ارتقا کے تمام شیوع کسی انتخاب کی تلاش میں مصروف معلوم ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ ایک ہی سودی سمت میں کروڑوں افراد میں سے کسی ایک کو زیادہ حریت بخشنے کے لئے منتخب کرنا چاہتے ہیں اور یہ انتخاب نوع بدلنے والے افراد میں سے ہی ہوتا ہے[1]۔ اگر ہم واحد خلیہ دار اجسام نامّی اور گھونگوں سے شروع کر کے غور کرنا شروع کریں تو ہمیں ذی حیات ہستیوں میں روز افزوں آزادی بین طور پر نظر آتی ہے۔ حرکت کی آزادی، ماحول پر سخت گیر انحصار کی عائد کردہ زنجیروں سے خلاصی (کھاری احوال کا اجتماع؛ درجہ حرارت، خوراک وغیرہ)، دوسرے انواع کی بدولت تباہی سے نجات۔ چلنے یا کھودنے میں ہاتھوں کے استعمال کے لزوم سے چھٹکارا، مفید

---

[1] تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے (پہلے ناڈین صاحب نے اور پھر بعد ڈی ورائز صاحب نے) کہ ان پودوں کے ایک مجموعے میں جو بالکل ایک جیسے بیجوں سے اگا ہو اور اس سے زیادہ شاذ ایک ہی نسل کے حیوانوں میں ناگہانی تبدیل نوع ہو جاتا ہے اور نئے غیر متوقع خواص ظاہر ہو جاتے ہیں جو غالباً بیج یا انڈے میں کسی اتفاقی ناگہانی واقعہ ہو جانے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تبدیل نوعی کرنے والا فرد وہ فرد ہوتا ہے جو ایک ہی مشترک نسل سے پیدا شدہ دوسرے افراد کے ہر اعتبار سے مماثل نہیں ہوتا۔ (حاشیہ از مصنف)

اکتسابی خواص یا تجربے کو آگے منتقل کرنے میں بے حد وقت طلب طریقوں سے رہائی (قوت گویائی اور روایات) اور سب سے آخر ضمیر کے وجود سے جیسے کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے ۔

ہو سکتا ہے کہ جس شکل کا انتخاب ارتقا کے لئے کیا جائے وہ آنی طور پر اور شکلوں کی بہ نسبت کم پسندیدہ ہو۔ بعض اوقات یہ شکل لاکھوں بلکہ کروڑوں برس تک صرف بچے جاتی ہے اور دوسرے اصناف تعداد اور قدوقامت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں جیسے کہ ہم پچھلے باب میں دیکھ آئے ہیں ارضی دورثانی میں بڑے بڑے رینگنے والے جانوروں کے ہمعصر اولین ذوات الثدی کو یہی حالت پیش آئی ۔ تاہم اگرچہ ابتدا میں ڈنو سار ی نسل (DINOSAURIANS) زیادہ محفوظ ہو چکی تھی اور تبدل نوعی، بقائے اصلح اور مطابقت ماحول کی بدولت نہایت متنوع اور دیوپیکر افراد کی کثرت ہو گئی تھی، چھوٹے چھوٹے تھن دار جانوران موثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ تیار تھے جو ان کے وجود میں آنے کے وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے ۔ اس رائے پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی چیز ہو سکتی ہے ۔ بہت مناسب۔ لیکن اس واقعہ کی ہم کیا توجیہ کریں گے کہ ایسے اتفاقات یکے بعد

دیگرے منتقل طور پر ایک ارب سال سے زائد عرصے تک ہوتے رہے یہاں تک کہ بالآخر انسان اور اس کے دماغ کا ظہور ہوگیا۔

یہ ہم بتا چکے ہیں عمل مطابقت ماحول عفریت پیدا کر سکتا ہے۔ انسان کی تخلیق صرف عملِ ارتقا ہی کر سکتا ہے۔ انسان نے بھی اپنے تجربات کے ذریعہ عجیب الخلقت مخلوق پیدا کی ہے (مارگن صاحب اور ان کے مکتبِ خیال لوگوں کے DROSOPHILA MELANOGASTER مکھیوں پر تجربات) انسان عمل مطابقتِ ماحول اور اکتسابی خواص کو اپنا تختۂ مشق بنا سکتا ہے لیکن یقیناً وہ کبھی اس قابل نہ ہوگا کہ ارتقا کا آغاز کر سکے۔

زندہ ہستیوں کے "تذکرہ میں" کڑی" کا لفظ ایک خطرناک لفظ ہے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی خاص شکل سلسلہ ارتقاء کی صحیح درمیانی کڑی ہے۔ بعض اوقات ایسا قرار دینا ممکن ہے لیکن حتمی ہرگز نہیں۔ بہرکیف یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی زندہ ہستی کسی دوسری زندہ ہستی کی مورث نہیں۔ انسان بندروں کی نسل سے نہیں ہے۔ شجر آثار زندگی میں سے اکثر جو نام نہاد وسطی صورتیں کہی جاتی ہیں ان کی حیثیت شاید اس سے زیادہ نہیں کہ انہیں ہم مطابقت ماحول کی ناکام جد و جہد سے تعبیر کریں یا ان کو

اعجوبے سمجھیں جو یا تو اصلی درمیانی شکلوں کی ہم عصر تھیں، پہلے کی تھیں یا بعد کی۔ غالباً آسٹریلیا کے ان اعجوبۂ روزگار حیوانات ORNYTHORHYNCHUS, ORPTATYPUS AND ECHIDNA) MONOTRENES کی بھی یہی صورت ہے جو انڈے دیتے ہیں اور بچوں کو تھنوں سے دودھ پلاتے ہیں۔ ECHIDNA جو PLATYPUS کی بہ نسبت کم معروف ہے مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ ابھی اسکا درجۂ حرارت کو منضبط کرنے والا نظام نامکمل ہے اور اس کے بدن کے حرارت کے درجے ۳۴ فارن ہیٹ تک کے انحرافات کر گزرتے ہیں۔ یہ حیوانات آزمائشی صورتیں تھیں لیکن ان کے اجداد نے خوش بختی سے ایسے موثرات میں جنم پایا کہ بغیر کسی عمیق تبدیلی کے یہ زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ چونکہ اور بر اعظموں پر پہونچنے کی راہیں ان پر بند ہو گئیں اور دوسرے ارضی خطوں میں جو ہنگامہ خیز

حاشیے از مترجم (۱) ORNYTHORHYNCHUS آسٹریلیا کے کچھ حیوان ہیں جن کی چونچ مرغابی کی سی ہوتی ہے اور سمندری تھن دار جانور ہیں۔ (۲) PLATYPUS مرغابی نما چھچھوندر یہ بھی آسٹریلیا میں پائی جاتی ہے۔ (۳) آسٹریلیا کا سیہی کی قسم زمین میں بل بنا کر رہنے والا جانور جس کے دانت نہیں ہوتے۔

انقلابات ہو رہے تھے ان سے یہ محفوظ ہو گئے اس لئے وہ ارتقاء کے ایسے مرحلے پر پہونچ گئے کہ مقابلتاً مستحکم موثرات میں وہ زندہ ہیں۔ اس اعتبار سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے جانور بے مثل ہیں اور فرسودہ شکل کے جانور یہاں بکثرت ہیں۔ ان ممالک میں کوئی ایسا بھی اصلی (ANTOCHTHONOUS ملک کا ابتدائی اور اصلی) وطن دار جاندار نہیں جس پر ان کو فخر ہو ہاں تھیلی دار جانور MARSUPIALS جو اپنے بچوں کو تھیلی میں رکھتے ہیں ان کے ہاں ہیں۔ نیوزی لینڈ اپنے بے پر کے عظیم الجثہ پرندوں کے لیئے مشہور ہے جن میں سے بعض جیسے موا (MOAS) بارہ فٹ بلند تھے پلیپٹس اور اکڈنا ہیں تو اغلباً کچھ برائے نام تغیرات ہوئے بھی لیکن یہ ذوات الثدی کے حقیقی مورث اعلے نہیں ہیں۔ یہ کسی بٹلی پٹری کی آخری صورت ہیں۔

صحیح ارتقائی شاخ بودی اور ہلکی تھی چنانچہ وہ مکمل مطابقت ماحول نہ کر سکی۔ یہ سرعت کے ساتھ بڑھی مگر پھیل نہ سکی۔ ٹھنڈے خون والے جانوروں کے ترقی کرکے، گرم خون والے جانور بن جانے تک بے انتہا درمیانی صورتوں کی ضرورت ہے لیکن ان عبوری انواع کو جو ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، افراد کی تعداد اتنی کم تھی کہ ان کے لئے اس امر کے احتمالات بہت ہی کم تھے کہ وہ پھر

ایک دن اس نسل میں شامل ہوجائیں جس کے اخلاف میں انسان کا وجود میں آنا مقدر تھا۔

تاہم ذوات الثدی کے گروہ میں سے ہم کچھ درمیانی واسطوں سے سلسلۂ نسب مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ تیسرے ارضی دور کے ابتدائی زمانے (EOCENE) کے HYRACOTHERIUM اور (EOHIPPUS) حیوانات سے شروع ہوکر زمانۂ حال کے گھوڑے تک کڑیاں مکمل ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی واسطوں میں سے ہر ایک واسطہ ناگہانی طور پر وجود میں آیا اور منتجر صورتوں کے نہ مل سکنے کی وجہ سے ان واسطوں کے ایک دوسرے میں منتقل ہونے کی ترتیب نہیں بن سکی۔ تاہم یہ ترتیب تھی کچھ ضرور۔ معلوم صورتیں ایک تباہ شدہ پل کے ستونوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ جس تسلسل کی قیاس آرائی ہم کرتے ہیں وہ واقعات سے تو شاید کبھی بھی مستقل بنیاد پر قائم نہ ہوسکے گا۔

بہرکیف یہ امر کسی بڑی اہمیت کا حامل نہیں۔ اصلی مسائل جنس یا انواع کے تذکرے میں سر نہیں اُٹھاتے بلکہ ان جانداروں کے گروہوں اور جماعتوں کے تذکرے میں سامنے آتے ہیں جو کسی مشترکہ مورث اول کی نسل سے ہیں۔ کسی قیاس آرائی کے بل بوتے پر ہم واحد خلیے والے اجسام

نامی سے ان جانداروں تک جن کے پاس خلیہ دار اعضائے (METAZOA) بے ازدواجی نسل کے جانداروں سے ازدواجی نسل تک پہونچنے کی تانبے دار خونی رنگ والے جسم سے لوہے دار خونی رنگ والے اجسام تک پہونچنے کی استحالی صورت کا صحیح تصور نہیں کرسکتے۔ جیسا ہم اوپر دیکھ آئے ہیں ان تغیرات کا مطابقت ماحول کے عمل کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں اور جہاں تک ارتقار کا تعلق ہے ان کی حیثیت اساسی ہے اور یہ چیزیں ہماری زمین کی صغیرسنی کے زمانہ میں بہت دور کے ادوار میں وقوع پذیر ہوچکی تھیں۔

ہم نے ابھی ان وضعیتوں کے اقسام میں سے ایک قسم کا جائزہ لیا ہے جو زندہ اجسام کے تغیر میں معاون ہیں۔ بہت سے سائنس دانوں نے یہ خیال کرنے میں غلطی کی ہے کہ صرف یہی عمل کام کرتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ ڈاروِن اور لیمارک کے کامیاب مفروضے ان کے ہاتھ لگ گئے تو ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ انہیں نظریوں کو توڑ مروڑ کر جیسے کہ وہ لچک دار چادریں ہوں، وہ ان کو ہر اس شکل میں ڈھال لیں گے جو قرنہا قرن کے پیدا کردہ مسائل کے حل کے لئے لازمی ہے۔ بدنصیبی سے ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ عملوں کا یہ گروہ اکیلا اس قابل نہیں کہ وہ ان سب

واقعات کی وضاحت کر سکے جواب تک قطعاً پردہ راز میں ہیں
اور ہمارے حقیقی علم کے حصول کی راہ میں ناقابل عبور سدِ راہ
بنے ہوئے ہیں۔

کیونکہ فرض کیجیے کہ جب ہم کو ایک نقطۂ آغاز دے دیا جائے
تو ہم عمل مطابقت ماحول کے جاری ہو جانے کا تصوّر کر سکتے ہیں
(ہم یہ نہیں کہتے کہ سمجھ سکتے ہیں) تو یہ واضح ہے کہ یہ اساسی
تغیر اتنا کافی منفعت بخش ہونا چاہیئے کہ اسی نوع کے دوسرے
اجسام کے مقابلہ میں، تبدل نوعی کرنے والے جسم نامی کو فوقیت
حاصل ہو۔ اگر کوئی منفعت یا آنی ترقی اس میں اس عمل مطابقت
ماحول سے پیدا نہیں ہوئی تو یہ سمجھ میں آنا مشکل ہو گا کہ کیوں کسی
نئی خصوصیت کی تکمیل کی گئی یا وراثتاً منتقل کی گئی۔ یوں تو مارگن
کی مکھیوں کی طرح ایک عجیب الخلقت جاندار کا بھی اضافہ ہوا
لہٰذا ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ جونہی کوئی حیوان دیکھنے کے
قابل ہوا اس کی آنکھ تکمیل کی طرف ترقی کرنے لگی خواہ وہ آنکھ
بد ہیئت اور ادنےٰ شکل کی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مقصد بصارت کو
کما حقہٗ ادا کرنے کے قابل تو وہ صرف اُس وقت ہوئی جبکہ اس کی تعمیر
قواعدِ نور کے مطابق ہو گئی اور عضلاتی خلیوں کے ذریعہ وہ دماغ کے

حساس بصارتی مرکز سے وابستہ کردی گئی۔ جب تک کہ بصارت معرض وجود میں نہ آگئی ہم بصارت کے لازمی مبادی کے ہم وقتی ارتقاء کی توجیہ کس طرح کرسکتے ہیں۔ جلد کے کسی خاص بالائی حصے کی شعاع نور سے محض اثر پذیری کسی طرح بالآخر آنکھ کے عدسے۔ پردہ عنبیہ۔ اور پردہ شبکی کی توضیح نہیں کرسکتی۔ ایسے ہی قابل پرواز رینگنے والے جانداروں (PTEROSAURIANS) اور چمگادڑوں کے پرواز کے جھلی دار بازو تو اسی وقت ان کو ہوا میں سہار سکے ہوں گے جب وہ مکمل ہوگئے ہوں گے۔ چٹان یا درخت پرے لامحدود دفعہ گرنے نے تو اس جھلی کا افتتاح نہیں کیا ہوگا۔ اگر اس کی توسیع تدریجی تھی تو اس کا آغاز کسی چھوٹے سے جلدی پردے سے ہوا ہوگا جو ابتدا میں تو صرف ایک مزاحمت ہی ہوگا اور اسے اپنی جسامت بڑھالینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اگر یہ جھلی دار بازو ناگہانی طور پر وقوع پذیر ہوئے تو ہم متلازم انگلیوں کی بالیدگی کی علت کیسے مہیا کرسکتے ہیں۔ پھر مذکورہ بالا دونوں حالتوں میں سے کوئی حالت بھی یک لخت تو ارتقی کیسے ہوگئی سوائے اس کے کہ ہم اسے ایک طویل سلسلہ ارتقا کا نتیجہ سمجھیں کوئی دوسرا تصور ممکن نہیں۔ لیکن ہم محض قیاس آرائی کرسکتے ہیں اسے ثابت نہیں کرسکتے اور پورا عمل کلیتاً ہماری دسترس سے چھوٹ جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے فطرت پہلے ہی آزمائش کر چکی تھی اور جانداروں کو قوتِ پرواز دینے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ادھورے طور پر لیکن خاطر خواہ طریق پر، دس کروڑ برس پہلے ڈیوونین (DEVONIAN) دور میں شفاف جھلی دار پروں والے حشرے (NEUROPTEROIDEA) اس مسئلے کو حل کر چکے تھے۔ حشروں کی دنیا سے ایسی صدہا مثالیں اور پیش کی جا سکتی ہیں۔

اگر ایک منصوبے، ایک منشاء، ایک اعلیٰ عقل کے اصول موضوعہ کو شامل کر کے، دوررس غائیت کا اصول ان متحدہ تغیرات پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو جو غیر منقطع سلسلے میں سے گزرتے ہوئے بالآخر انسان پر آکر رکے ہیں، تو ان خصوصی تغیرات کو جو انواع تک محدود و بخت طبعی کیمیاوی قوتوں اور بخت و اتفاق کے چھوٹ موٹ کے کھیل سمجھنا اور اس کے سوا کوئی نتیجہ اخذ نہ کرنا غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

بالآخر کئی ایک آزمائشوں کے بعد ذوات الثدی کا اعلیٰ طبقہ (PRIMATES) جس میں بندر وغیرہ سب شامل ہیں وجود میں آیا اور یہ انتہا نامعلوم درمیانی واسطوں کے سلسلے کے بعد پلٹ ڈاؤن (PILT DOWN) انسان[1]، جاوا کا بندر نما انسان (PITHECANTHROPUS ERECTUS)

[1] (از مترجم) جنوبی انگلستان کے مرتفع میدانوں میں کنکروں کی تہ میں سے انسانی کھوپڑی ملی جس انسان کی

اور پیکنگ انسان وجود میں آئے۔ اعلیٰ طبقہ کے ذوات الثدی کی نسبت ان کی کھوپڑی نے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ بہت سے مصنف اس کے قائل ہیں کہ پیکنگ انسان (NEANDERTHAL[1]) انسان کا اصلی مورث ہے۔ موخرالذکر چند ہزار سال بعد یورپ میں ظہور پذیر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک موخرالذکر انسان کا مبدا معلوم نہیں ہو سکا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اس شاخ میں سے ہے جو مشترکہ شجرے سے اسی وقت علیحدہ ہوئی جس وقت وہ دوسری شاخیں جنہوں نے اورنگ اوٹن (بورنیا اور سماٹرا کا انسان نما لنگور) گبن (GIBBON) انڈین آرچی پیلیگو کے طویل بازوؤں والے بندر) اور چمپینزی (CHIMPANZEE) افریقہ کا انسان سے مشابہ لنگور) کو جنم دیا۔ مشترکہ خاندان شاید اس سے بھی پرانا ہے۔ قابل اعتماد مصنفوں کے قول کے مطابق ارضی دور ثالث کے سمائی ڈی (SIMIIDAE) انسان سے مشابہ بندروں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) یہ کھوپڑی تھی وہ پلٹ ڈاؤن کے نام سے موسوم ہے اسی طرح جو کھوپڑیاں جاوا میں ملیں اور چین میں ملیں ان کے لحاظ سے دوسرے دو نام دیئے گئے

[1] (از مترجم) علاقہ رائن (RHYNE) کی وادیوں میں کچھ انسانی ڈھانچوں کے آثار ملے ہیں جو تمام (NEATNHERPAL) پر نکلے اس لئے جس انسان کے یہ آثار تھے وہ اس نام سے موسوم ہوا۔

کاایک خاندان) انسان بنے کے بیّن رجحانات ظاہر کرتے ہیں اور بعض معدوم انسان نما بندروں کے جسم کے اعضا کی ساخت موجودہ زمانے کے انسان نما لنگوروں کے جسم کے ساخت کے مقابلے میں نوعِ انسانی کے جسم کے اعضا کی ساخت سے قابلِ لحاظ درجے تک زیادہ قریب ہے۔ جیسے مثلاً معدوم خاندان (DRYOPITHECUS) اور SIVAPITHECUS کچھ اور ایسے مصنف بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ پلٹ ڈاؤن کے (DAWNMAN EOANTHROPUS تڑکی انسان) آلی گوسین (OLIGOCENE) قرن یا EOCENE قرن کے (PROPLIOPETHECUS) کی براہ راست نسل میں سے ہے (مصر) لہذا یہ ذات الثدی وہ مشترکہ منبع ہوگا جس سے کہ چار پانچ کروڑ برس پہلے حقیقی ذوات الثدی اور انسان کے سوتے پھوٹے بعض مصنف ایسے بھی ہیں جن کا گمان ہے کہ مشترکہ جد اس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثبوتی طور پر کچھ بھی معلوم نہیں۔

بہرکیف (PITHECANTHROPUS) کا مغز بڑے لنگوروں کے مغز سے بھی زیادہ وزنی ہے ان لنگوروں کے مغز سے بھی جن کا وزن اس سے سہ گنا ہے۔ لنگور انسان (یہ PITHECANTHROPUS کا لفظی ترجمہ ہے) جاوا کے جزیرے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اغلباً پلٹ

ڈارون انسان کے بعد اور ہیکنگ انسان سے کچھ عرصے پہلے۔ اگرچہ وہ کسی قدر خمیدہ قامت ہیں مگر چلنے مستقیم ہیں۔ عمل ارتقا جاری رہتا ہے۔

یہ عمل ارتقا انسان اور فقط انسان ہی کے ذریعہ جاری رہتا ہے۔ تاہم جیسے کہ جلد ہی ہم کو پتہ چل جائے گا بنی نوع انسان کا ارتقا ٹھیک اسی بنیاد پر آگے نہیں چلتا جیسے اب تک چل رہا تھا۔ حیات کے ارتقا اور انسان جیسا کہ ہے اس کے ارتقا میں بعینہ ویسا ہی خلا دکھائی دیتا ہے جس کا عقل ادراک نہیں کرسکتی جیسے کہ برقیوں کے مقلوب ارتقا اور برقیوں سے تعمیر شدہ جوہروں کے درمیان اور جوہروں کے غیر مقلوب ارتقا اور جوہروں سے تعمیر شدہ حیات کے درمیان۔ انسان اپنی ساخت جسمانی کے لحاظ سے ابھی حیوان ہی ہے اور اپنے اجداد سے اسے جبلتوں کی کثیر تعداد ورثے میں ملی ہے۔ اس میں سے بعض ایسی ہیں جو نوع کو محفوظ رکھنے کے لیئے لابدی ہیں۔ تاہم کسی نامعلوم ماخذ سے وہ دنیا میں اپنے ہمراہ کچھ اور جبلتیں اور تصورات بھی لایا ہے جو بالصراحت بشری ہیں اور جو باوجود اس کے کہ وہ پہلی جبلتوں کے متضاد ہیں بعد در سے اہم ہوگئی ہیں اور انہیں تصورات۔ انہیں نئی خصوصیات کی جو

ارتقا کی موجودہ صورت پر مشتمل ہیں آگے ترقی ہونا ہے۔

بنا بریں اگر ارتقا کے اصول کو انسان کے معاملے میں قایم رکھنا مقصود ہے تو ارتقا کے اصول کے اظہار کی مقررہ صورتیں مختلف ہو جائیں گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ارتقا کے تمام نظریئے انسان کے وتیرے (BEHAVIOUR) کی توجیہ کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں

کتاب ۳

بنی نوعِ انسان کا اِرتقا

(۸)

ارتقا کی جدید واضح اور معین سمت: انسان۔
کتاب پیدائش کا دوسرا باب۔

ارتقا کا سلسلہ چل رہا ہے۔ حیوان کی وہ شکل جو روح کی محافظت کرنے اور اس کی نشوونما کی ضامن ہے میسر آگئی ہے۔

اب اس کے آگے ہر امر اس طرح ظہور پذیر ہو رہا ہے کہ گویا اگلا قدم بتدریج صرف اس طور پر اٹھایا جا سکتا ہے کہ زیادہ مکمل صورتوں کے منصۂ شہود پر ظاہر ہو جانے کی وجہ سے، جو اب بھی آہستہ آہستہ ایک انتہائی اور ابھی تک بعید تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہیں، اس باڑے سے جو تعمیر کے لیئے بیکار ہو گئی ہے دست بردار ہو جائیں۔ اگرچہ یہ نمایاں طور پر تو نظر نہیں آتی مگر زندہ نسلیوں میں درمیانی صورتیں جو گزر چکی ہیں ان کی "یاد" اکثر موجود رہتی ہے۔ مثال کے طور پر گلپھڑوں کے آثار انسانی جنین میں اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ جسمانی یاد باقی رہتی ہے، (اور "جسمانی یاد" سے ہماری مراد ان بدنی

ساختوں سے ہے جو بتدریج تعمیر ہوئی تھیں اور بطور ارث منتقل ہوئیں)
بلکہ ہماری مراد ان جبلتوں کی یاد سے بھی ہے جو دماغ میں جمع ہوگئی
تھیں اور جن کو ماحول نے شرائط زندگی کی مطابقت کے لئے کبھی
معین کر دیا تھا۔

اسی ورثے کے خلاف، اسی یادوں کے عظیم مجموعے کے خلاف،
جواب اپنے مقصد سے محروم ہو چکے ہیں اور ان ادوار کی پیداوار
ہیں جو ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکے ہیں، انسان کو جدوجہد کرنا ہے
تاکہ اُس روحانی ہستی کی آمد کی تیاری ہو جو انسان کی آخری مقدر
صورت ہے۔

اَب انسانی دَور میں ارتقا کا سلسلہ جاری ہے لیکن عضویاتی
اور تشریحی سطح پر نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی سطح پر۔ ہمارا دَور ارتقاء
کی نئی صورت کے طلوع کا دور ہے اور احوال کی ترتیب میں جو طوفانی
گرداب اُٹھ رہے ہیں انہوں نے اکثریت کی نظر سے اس حقیقت کو
اوجھل کر رکھا ہے۔ اپنے مورث حیوان (جواب بھی انسان کے اندر
پیچ و تاب کھا رہا ہے) سے ترقی کر کے انسانی صورت میں آنا اتنا
قریبی زمانے کا واقعہ ہے کہ ہم ان شیوعی تصادم کو سمجھنے کے قابل نہیں
جو اکثر ہم کو بدحواس کر دیتے ہیں اور ہمارے فہم کی دسترس سے

بالا ہو جاتے ہیں ۔ ہم ابھی اس انقلاب کا پورا اندازہ کرنے کے اہل تو نہیں لیکن ہم واقعتاً ایک انقلاب میں سے گزر رہے ہیں ۔ یہ انقلاب ارتقا کے پیمانے پر ہو رہا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں وہ عمرانی اور معاشری انقلاب جو ہم دیکھ رہے ہیں خواہ ان میں لاکھوں جانیں کیوں نہ ضائع ہو جائیں المناک بچوں کے کھیل ہیں اور مستقبل میں انکا کہیں نشان بھی ڈھونڈے نہ ملے گا ۔

ہزاروں صدیوں بے رحم ضابطوں کی اندھا دھند فرمانبرداری کرنے کے بعد زندہ ہستیوں کے ایک گروہ نے حیاتیاتی طور پر اپنے آپ کو اور گروہوں سے ممیز کر لیا اور اب اس گروہ کو نئی ذمہ داریوں سے دوچار ہونا ہے ۔ نئے احکام جاری ہو رہے ہیں جو پہلے احکامات کے متضاد ہیں اور انسان کی مسرتوں اور جسمانی لذتوں کی دنیا پر حدود مقرر کر رہے ہیں ۔ اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کرے جس کو وہ ابھی پہچانتا نہیں مگر وجدانی طور پر اس کی عظمت کرتا ہے ۔ وحشی گھوڑا لگام کے دہانے کے خلاف ردعمل کرتا ہے لیکن آخر سدھ کر اپنے مقدر کو قبول کر لیتا ہے ۔ گھوڑے اور انسان کی حالت میں فرق یہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر روک تھام کی حدیں لگاتا ہے ۔ وہ اس

بارے میں آزاد ہے کہ ضبطِ نفس کی حدود کو رد کر دے یا قبول کرے لیکن اسی کشمکش سے وہ بالآخر اپنے اصلی مقدر کا مالک بن جاتا ہے۔ اسی وسعت رس کی بدولت جس کی اساس خواہشات نفس کی تسکین اور روحانیت کی طرف پرواز میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی پر ہے انسانی عظمت کی تخلیق ہوتی ہے۔

حقیقی انسانی شخصیت اُس لمحے وجود میں آئی جب قوتِ گفتار نے نشوونما پانا شروع کی۔ باوجود اس کے کہ لسانی صوریاتی ارتقا جاری رہا حیوانی فہم یعنی جبلتوں کی جگہ ایک بہت ہی مختلف اور مخصوص انسانی طرز کے فہم نے لینی شروع کردی۔ حیوان سے انسان کی تخریج کا منتہیٰ ایک نئی صورتِ حال کا مقتضیٰ تھا اور مقدر یہ تھا کہ اس میں اربوں سال لگیں۔

انسان کی اس نئی ارتقائی سمت کا نشان پہلے پہل قدیم انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں نے مہیا کیا۔ جیسے چقماق کے بھدے اوزار اور آگ جلانے کے آثار۔ مگر جلد ہی انسانی افعال کے اور ثبوت بھی میسّر آگئے اور ہماری رائے میں یہ ثبوت زیادہ یقینی تھے۔ وہ قدیم قبرستان تھے (NEANDERTHAL) انسان نہ صرف اپنے مردوں کو دفن کرتا تھا بلکہ بعض دفعہ ان کو یک جا اکٹھا بھی

کرتا تھا جیسے کہ فرانس میں مینٹن کے قریب بچوں کے ایک خوبصورت غار کے اندر قبرستان میں ملے[1]۔ یہ چیز محض جبلت کی کارکردگی نہیں تصور کی جا سکتی۔ یہ تو قبل ہی سے انسان میں خیال کا طلوع ہے جو موت کے خلاف ایک طرح کی بغاوت کا اعلان ہے۔ اور موت کے خلاف بغاوت دلالت کرتی ہے اس محبت پر جو انہیں اپنے رفتگان کے ساتھ ہے اور اس آس پر کہ ان کا وصال قطعی نہیں یہ تصورات جو شاید اولین تصورات ہیں جمالیاتی تاثرات کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مُردوں کے چہروں اور سروں کی حفاظت کے لئے چپٹے پتھروں کے یا تو ڈھیر لگائے جاتے ہیں یا ایک پتھر کو دوسرے پتھر کا سہارا دے کر کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ بعد ازاں زیورات، ہتھیار، کھانا، اور جسم کو رنگنے کے لئے رنگ بھی میتوں کے ساتھ دفن کئے جانے لگے۔ قطعی جدائی کا تصور نا قابلِ قبول و نا قابلِ برداشت معلوم ہوتا ہوگا۔ مرتے خوابِ مرگ سے بیدار ہوں گے اور ان کو کھانے کی بھوک ہوگی۔ انہیں اپنی حفاظت کرنے کی ضرورت ہوگی۔ انہیں اپنے آپ کو سنوارنے

---

[1] فرانس میں بمقام (MENTON) ایک خوبصورت غار CHILDRENS GROTTO کے نام سے موسوم ہے اس غار میں پرانا قبرستان پایا گیا۔ (مترجم)

اور آراستہ کرنے کا خیال آئے گا۔ مُردے مرے نہیں ہیں۔

یہ امر کہ جن لوگوں کو ان سے محبت تھی جو ان کے قدر شناس تھے، ان کے حافظے میں وہ اب بھی زندہ تھے انسان اور صرف انسان کو ایک ایسے تصوّر کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو وسیع ہو کر فرد کے جذباتی عالم سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ وہ اس تصوّر کو اپنے ماورا متشکل کرتا ہے اور رفتگان کے لئے ایک نئی معروضی زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع نیا پن ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو پھر اس دُنیا میں کبھی نہ دیکھے گا لیکن وہ اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ وہ کسی دوسری دُنیا میں بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ لہذا وہ ایک اور زندگی کا اختراع کرتا ہے ایک دوسری دنیا کی تخلیق کرتا ہے جہاں ایکدن وہ ان سب سے ملیگا۔ یوں ہم قوتِ متخیلہ کی کسی بڑی پرواز کے بغیر یہ تصوّر کر سکتے ہیں کہ مردوں کی حفاظت، زندہ ہستیوں کے پرانے خواص میں سے حافظے کا انسان میں اجتماع، اور اعلا قسم کے حیوانات میں جاری و ساری جذبہ محبت، نے مخصوص انسانی تصوّر حیات بالبعد الممات کو جنم دیا۔ انسان ان تمام وصفوں سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اسکو اپنے اجداد سے ورثے میں ملے ہیں بلکہ اپنی ارتقا کے عمل کو تیز تر کرنے کے لئے ان کی نوعیت کو نئی صورت دیتا ہے۔

حافظہ جو زندہ ہستیوں کے استقلال کے لیے لابدی شرط ہے نہایت ابتدائی حیوانات میں بھی موجود تھا۔ بعض حیاتیات کے ماہر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ واحد خلیوں والے اجسام نامی میں بھی حافظے کی موجودگی کے ثبوت ملتے ہیں مثلاً پیرامیشیم (PARAMECIUM) میں۔ یہ تو یقینی امر ہے کہ اس کے بغیر عمل ارتقا ممکن نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ وہ خاصہ جس نے اول حیوانات اور نباتات میں تفرق پیدا کیا وہ یہی قوت حافظہ ہو۔ اسی میں یہ اہلیت ہے کہ ملزوم افعال اضطراری (CONDITIONED REFLEXES) اور جبلتوں بلا ارادی افعال کی تعمیر کر سکے۔

تاہم یہ اغلب ہے کہ اس حافظے کی وضعتیں ان وضعیتوں سے مختلف تھیں جو ان افراد میں کار فرما ہے جن کے حصے میں مرکزی دماغ آیا ہے حشرات الارض کی جبلتیں ذوات الثدی کی جبلتوں سے زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ اس کے باوجود ذوات الثدی کا دماغ زیادہ مرتب ہے اور یہ حشروں سے زیادہ فہیم ہیں یعنی یہ ان سے زیادہ غیر متوقع موثرات کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنے کے قابل ہیں حشرہ اپنی جبلت کا قیدی ہے۔ ذوات الثدی کی ذہانت ان سے بیشتر اُس حریت کا اظہار کرتی ہے جو اپنے ارتقا سے ان کو حاصل ہوئی

ہے۔ بعض موروثی جبلتیں ہی صرف ان کی محافظت نہیں کرتیں بلکہ ان میں اتنی قابلیت ہے کہ وہ حسب ضرورت دفاع کے نئے طریقے تجویز کرلیں جب ان کو اپنی نقل مکانیوں کے دوران میں لاتعداد غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑے یا بھٹتی ہوئی دنیا کے تشنجی تغیرات سے واسطہ پڑے۔ یا جو تغیرات شہابیوں کی زمین پر گرنے سے پیدا ہوں غرضیکہ ہر قسم کے خطرات میں یہ اپنی محافظت کی راہیں نکال لیتے ہیں۔

ذوات الثدی کے مقابلے میں، ہ نئی ہستی (یعنی انسان) جو اپنے قدیم حیوانی خول سے ابھی نکلی ہی تھی، اور بھی زیادہ آزادی کے مدارج سے بہرہ ور تھی۔ یہ آزادیاں جو کبھی کبھی باہم دگر پیوستہ بدنی اصلاحوں کا نتیجہ تھیں اسی کے حصے میں آسکتی تھیں۔ ہاتھ کی نشوونما اور مہارت خصوصی کی بدولت وہ سیدھا کھڑے ہونے کے قابل ہوگیا۔ ابتدا میں ممکن ہے اور صورتوں کی طرح ہ ایک آزمائشی صورت ہی ہو لیکن اس آزمائشی صورت کو اتنی کامیابی نصیب ہوئی کہ اس کی بدولت دو عظیم منفعتیں اوزار، اور آگ حاصل ہوئیں۔ واضح قوت گویائی جس کا انحصار کسی قدر نچلے جبڑے (آگے کو نکلی ہوئی ٹھوڑی) پر ہے بعد میں آئی ہوگی۔ بعد ازیں راستہ صاف

ہو گیا۔ غایت مقرر ہو گئی اور انسان نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ آئندہ کے لئے اس کا طریق دوسری زندہ ہستیوں سے جدا ہو گیا جن پر وہ ہمیشہ حکمران رہے گا۔ اب ارتقا صرف اسی سے آگے چلے گا اور اس کا راستہ حیوانوں کے راستے سے سرعت کے ساتھ دور ہٹتا چلا جائے گا۔ اب اسی روز افزوں انحراف طریق سے ہمیں عمل ارتقا کی ترقی کو ناپنا ہوگا۔

تاہم یہ ظاہر ہے کہ فوری طور پر انسان اپنی ماضی سے آزاد نہیں ہو سکتا کروڑوں برس پر ممتد توارث کا وزن بہت بھاری ہے۔ اس کی خاص اپنی ارتقا کا خطِ منحنی بتدریج مرتسم ہو رہا ہے لیکن رکاوٹوں کے ساتھ۔ افرادی یا اجتماعی رجعتوں کی بدولت اس خطِ منحنی میں شدید آثار چڑھاؤ ظاہر ہوتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے وہ پھر کبھی کبھی حیوان بن جاتا ہے بجز اس کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟

اس کی ساخت اور وظائف کی اساس پر طبعی، کیمیاوی میکانکی جوہری طور پر وہی ہیں جو اور ذوات الثدی کی ہیں۔ اس کا جسم ویسے ہی قوانین کی مطابقت کرتا ہے۔ اس کا دماغ نئی نوع کی رجاؤں سے معمور تو ہے لیکن اس کا دماغ انہیں خلیوں سے بنا ہے جن سے مقابلتاً

زیادہ ابتدائی ہستیوں کا یہ خلیاں بھی ویسی ہی غذا پر جیتی ہیں جیسی غذا پر اور ہستیاں ان کے وظائف بھی وہی کیمیائی اجزاء متعین کرتے ہیں جو رِسنے والی داخلی غدودیں ENDOCRINE GLANDS خارج کرتی رہتی ہیں اور جو کل جسم کے ہم آہنگ توازن کے نظم و نسق اور قیام کی ذمہ دار ہیں۔ غدود درقیہ THYROID GLAND عقل و فہم کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کا اخراج یا لنقص ایک معیاری ہستی کو ناقص العقل ہستی میں بدل دیتا ہے۔ لیکن ایک فاترالعقل شخص اور ایک غیر معمولی ذہین شخص کی بھوری رنگت والی خلیاں بالکل ایک سی ہوتی ہیں۔ ماورائی غدود درقیہ PARATHYROID GLAND کسی قدر عصبی نظام کو ضبط میں رکھتی ہے۔ بلغم زا غدود (PILUITARY GLAND) ہڈیوں کی نشو و نما کی ضامن ہے۔ اس کے اخراج سے چند ہی دن میں موت واقع ہو جاتی ہے بعینہ ایسے ہی جیسے کہ گردے کے اوپر والے غدود (SUPRARINAL GLANDS) کو اگر نکال دیا جائے تو چند گھنٹوں میں ہی موت واقع ہو جاتی ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ میان بافتی غدود (INTERSTITIAL GLANDS)[1] بعض نرینہ خواص کی نشو و نما میں بے حد موثر ہیں جیسے مثلاً آواز یا بال۔ جب ان غدودوں کو کوئی نقصان پہونچ جائے تو دماغ، قلب، عضلات اور جلد متاثر

[1] (مترجم) دو غدودوں کے درمیان والی غدود۔

ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اخلاقی اور جسمانی توانائی جو مخصوص نرینہ خواص ہیں ان کا بلاواسطہ ان پر انحصار ہے۔

حاصل کلام انسانی جسم نامی کی اساس، مادّی اور کیمیاوی اعتبار سے، ویسی ہی ہے جیسے اور حیوانوں کی۔ اس کے لیے کھانا۔ سونا۔ افزائش نسل کرنا لابدی ہیں۔ انسان کے لئے حیوانوں کے ساتھ اپنے اس رشتہ کو منقطع کرنا مشکل ہے، غدودوں کی غلامی سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں اس تعلق کے خلاف جنگ آرا رہنے سے ہی وہ اس فرق کی توثیق کریگا جو اس کی انسانی عظمت کا موجب ہے اور اس کے آگے ہتھیار ڈال دینے سے کروڑوں برس کی مکتسب حرّیت سے اس کو دستبردار ہونا پڑے گا۔

اپنی قلب ماہیت کے ایک خاص وقت میں انسان کو اِس اساسی ثنویت کا شعور پیدا ہو گیا۔ یہی ثنویت مذاہب، فلسفوں اور فنون کا دائمی موضوع ہے۔ اس تصوّر کی بیداری پوری ارتقا کے نہایت اہم واقعہ پر مشتمل ہے۔ اس وقت تک، اپنی پیشرو زندہ ہستیوں کی طرح اسے ان خارجی مظاہر میں جو اس کی تدریجی ترقی کی رہنمائی کر رہے تھے، مداخلت کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ ایک سلسلے کی ایک غیر ذمہ دارانہ اور بے شعور کڑی تھا۔ باوجود اس امر کے کہ وہ اعلیٰ

ذوات الثدی سے زیادہ آزاد تھا، خارجی موثرات سے اس کی انفعالیت اس کے نسیجوں (TISSUES) کی زود حسی کی بدولت ہی ہوتا تھا اور وہ ان خواہشات کا تابع تھا جو اس نے ان سے ورثے میں پائی تھیں۔ اس کی بہتر عقل، اس کے ہاتھ جو چٹان کی تراش خراش کرنے اور آگ سلگانے کے قابل تھے، اس کا حنجرہ جو ایسی آوازیں نکالنے کا اہل ہوگیا تھا جن کو اس کی زبان اور ہونٹ مسلسل ڈھالتے چلے جا رہے تھے ان سب نے مل کر اسے اس کا اہل بنا دیا کہ وہ اپنے مقدّر کی خود نگرانی کرے اور آئندہ کے لئے اب وہ مختار تھا کہ چاہے تو وہ حیوانیت اور غلامی کی طرف عود کر جائے اور چاہے تو نئی ارتقا میں اپنے فرض کو پہچانے اور اُس کی ادائیگی میں لگ جائے۔

ضمیر کے جنم لینے تک وہ ہستی جسے انسان بننا تھا اپنے اجداد سے صرف اشکال اعضا میں ہی مختلف تھا۔ وہ قوانین فطرت اور قوانین ارتقا کے زیر عمل تھا اسے ان کی حکم برداری کرنا پڑتی تھی اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جس لمحے اس نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا شروع کیا کہ اس کا کوئی فعل "اچھا" ہے یا کوئی دوسرا اس سے "بہتر" ہو اسے وہ آزادی حاصل ہوگئی جس سے حیوانات محروم رہ گئے۔

اس امر کی رومانی توضیح کم و بیش خیرا اہم ہے۔ یہ سوال اس کے

خاندان سے متعلق ہو یا قبیلے سے۔ والدین کے انتقام سے ہو یا محلے والوں کے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور صرف انسان ہی میں یہ اختیار کا امکان ایک اخلاقی تخیل میں تبدیل ہوا ہے۔ اور کسی نوع میں یہ صورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ وقوع پذیر ہوگیا تو انسان نے ایک اور جست بھری اور اس خلیج کو، جو پہلے ہی اس کے اور دوسرے اعلیٰ ذات الثدی کے درمیان حائل ہوگئی تھی، وسیع تر کردیا اس کے ارتقا کی نئی سمت نمایاں ہوگئی۔ آئندہ سے سب دوسرے ذوات الثدی کے عمل کے برعکس اپنی ارتقا کے عمل کی تکمیل کے لئے فطرت کے احکام کی تعمیل اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اسے اب ان خواہشات اور رجحانات پر تنقید کرنا چاہیئے جو اس سے پہلے اس کے عمل کیلئے تنہا ضابطہ اور قانون تھیں، اور ان کو قابو میں رکھنا چاہیئے۔

اس دوامی تلخ جدوجہد ہی نے، جس کی شدت میں آج بھی کمی نہیں آئی، خالص انسانی آویزش کو جنم دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر بنی نوع انسان کی اکثریت پر غور کریں تو اس اخلاقی تخیل کی واقعیت کو مشکوک سمجھنا ممکن ہے۔ روزمرّہ جو مثالیں ہم دیکھتے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر ایک قنوطی یہ سوال آپنے آپ سے کرسکتا ہے کہ آیا انسان اور حیوان کے درمیان جو خلیج ہے

وہ اتنی ہی عمیق ہے جتنی ہم خیال کرتے ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی ہم انسانی ارتقار کے طلوع پر ہی ہیں اور اگر دس لاکھ انسانوں میں سے ایک کو بھی ضمیر کی دولت میسر آگئی ہے تو یہی اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا کہ آزادی کا ایک نیا درجہ ظاہر ہو گیا ہے۔ تذکرۂ ارتقا میں بہت سے اہم قدم ایسے اُٹھے ہیں کہ ابتدا میں افراد کی نہایت قلیل تعداد اور شاید فرد واحد ہی ان سے متاثر ہوا ہے ایسے ہی اخلاقی تخیل بھی خال خال افراد ہی کے حصے میں آیا ہوگا اور واقعہ تو یہ ہے کہ یہ تخیل تحفظ ذات کے لئے اتنا کمزور ہے کہ بجائے اس کے کہ جن کو یہ نعمت میسّر آئی ان کو کوئی جسمانی فوقیت حاصل ہوئی ہو یہ الٹا ان کے لئے سدِ راہ بن گیا ہوگا۔ لاریب غار کے باشی انسان کے وقت میں جذبا تیت۔ رحم۔ انصاف۔ خیرات جو آج بنی نوع انسان کا حسین اور قیمتی سرمایہ ہیں ان افراد کے لئے جنہیں دوسروں کی غیر شعوری بربریت اور تعدی سے سابقہ ہوتا ہوگا یہ صفات سنگ راہ ثابت ہوتی ہونگی۔ آج ہمارے زمانے میں بھی ایسی آویزشیں قلیل الوقوع نہیں ہیں۔ تاہم باوجود اس امر کے کہ ہمارے عوام میں کمزوریاں ہیں اور وہ جذّی جبلتوں کے زیر اثر ہیں اوسطاً وہ بڑی بڑی اخلاقی خوبیوں کے ثنا خواں ہیں اور ان خوبیوں کو عوام میں [illegible]

ایک حیران کن عظمت حاصل رہی ہے گو عمل ان پر کم ہی ہوا ہے۔
باوجود اس کے کہ آج بڑے بڑے انسانی گروہوں کی انفعالی صورت وہ نہیں جیسا کہ ہمارا خیال ہے کہ ہونی چاہئے۔ اور اجتماعی اثر پذیری کا فقدان ہے اب بھی بہت سے افراد ایسے ہیں، جو اگرچہ نہ خود استثنائی طور پر نیک سیرت ہیں، اور نہ ہی راہِ حق میں جان دینے کی روح ان میں ہے، لیکن وہ بلا تحریک غیرے موجودہ حالات کے خلاف علم بغاوت برپا کرتے ہیں اور کبھی کبھی عوام الناس کو بھی اس رَو میں بہالے جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی تاریخ ایسی مثالوں سے معمور ہے اور ٹٹیوں پر چڑھی ہوئی انگور کی بیل کی تمثیل ہماری نگاہوں کے سامنے لاتی ہے۔ اگر اس کی ٹیکن ام اکھڑ جائے یا ٹوٹ جائے تو بیل بے خبری کی حالت میں زمین پر رینگنے لگ جاتی ہے اس تلاش میں کہ کوئی سہارا مل جائے اور پھر ایک دفعہ وہ خس و خاشاک کی صحبت سے نکل کر سر بلند ہو جائے۔ اور جونہی اسے کوئی ٹیک مل جاتی ہے وہ اس سے چمٹ جاتی ہے اور بے شعور مگر انتھک طور پر روشنی کی طرف اُٹھنے کی سعی کرتی ہے۔ اس میں بعض اوقات اسے دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے جس چیز کا اس نے سہارا لیا ہے وہ ناقص ہو۔ جس شاخ کو اس نے پکڑا ہے وہ گلی سڑی ہو لیکن اس میں بیل

کا کوئی تصور نہیں۔ انسانی ریوڑ ایک غیر معروف ہدایت کی اطاعت کرتا ہے وہ سربلند ہونا چاہتا ہے اور یہ بغیر کسی ہادی کے ممکن نہیں خدا کا احسان ہے کہ بد موثرات وجود پذیر ہوئے تو ان کا بعض نادر اور مورد عنایات ہستیوں کے وجود سے ازالہ بھی ہوتا رہا ہے[1]۔ عمل ارتقا میں ان کی مثال ایسی ہے جیسے حیوانات کے ارتقا میں جمہوری جدا نوں کی جو لپنے ہم عصروں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ان خدا کے بندوں کو ارتقاء کی برتر منزل میسر ہوتی ہے اور ان کے ذمے ایک اعلےٰ کردار کی ادائیگی اور ایک بلند فرض کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ سعی انسانیت کی سمت اس طریق پر متعین کریں جو حیوانات کے طریق سے الگ ہو چکا ہے۔ باوجود مزاحمتوں اور ناموافق حالات کے اور باوجود

---

[1] حاشیہ از مترجم:- آیات قرآنی ملاحظہ ہوں:-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲: ۲۵۱)

اور دیکھو اگر بعض آدمیوں کے ذریعہ اللہ بعض آدمیوں کو ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی لیکن اللہ فضل و رحمت والا ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷: ۱۶۸)

اور ہم نے ایسا کیا کہ انسان کے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے بعض برے پھر ہم نے اچھائیوں اور برائیوں دونوں سے ان کو آزمایا کہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

اس امر کے کہ جن عقیدوں کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ کم خوش آئند تھے اور قربانیوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ انہیں ہستیوں کو تاریخ انسانی میں شہرت و ناموری حاصل ہے اور انہیں کے ارشادات و افادات اور تعلیمات کے مقابلہ میں زیادہ دیرپا اور زیادہ روشن ہیں۔

تاکہ عملِ ارتقا کا تسلسل جاری رہے انسان کو اس نئی آزادی کا عطا کیا جانا لازمی تھا۔ جب طبعی سہارے یعنی انسانی جسم کی اضافی تکمیل میسّر آگئی اور فطرت کو نئی آزمائشی صورتیں بے کار نظر آئیں تو عملِ ارتقا کا سلسلہ اب دوسری سطح پر آنا تھا اور وہ سطح جوہری طور پر انسانی یعنی روحانی سطح ہے۔ اس سطح پر آکر انسان کی لگاتار شرکت کے بغیر آئندہ ارتقاء کا تصوّر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں عملِ ارتقاء کے دَوران میں لا انتہا تجربے کئے گئے۔ عالمِ طبعی سے دوچار ہونے پر ان تجربی صورتوں کو بعض اوقات کامیابی بھی حاصل ہوئی اور نئی انواع پھلی پھولیں۔ کبھی یہ تجربے ناکام ہوئے اور ان کی تخلیق کردہ انواع فقط جیتے گئیں یا نابود ہو گئیں لیکن ایک تجربہ حیاتیاتی سطح (تشریحی یا عضویاتی) پر ایسا ہوا جو قلب ماہیت کر کے نفسیاتی سطح پہ ایک آزمائشی صورت اختیار کر گیا۔

اس آخری حالت میں اب سوال صرف اس کی بقا کا نہیں۔ ایک فائق مرتبہ حاصل ہوگیا ہے۔ اب سوال نفسیاتی اور اخلاقی طور پر آگے ترقی کا ہے۔ جیسے زمانہ ماضی میں ہوا آگے ترقی بھی تنازع للبقا مُسابقت اور انتخاب اصلح ہی کی بدولت ہوسکتی ہے۔

اس موقع پر یہ دلچسپ بات مستحق توجہ ہوکہ دور رس غائیت کا اصول انسان کی نہایت قدیم اور قابل تعظیم روایات میں سے ایک روایت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہ وہ روایت ہے جو پوری عیسائی دنیا کیلئے روحانی فیض اور ہدایت کا موجب ہے یعنی توریت اور انجیل (عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید) یہ مماثلت بالکل غیر متوقع تھی مگر جن نتائج پر ہم پہونچے ہیں وہ کتاب پیدائش کے دوسرے باب کے ظاہر کردہ نتائج کے عین مطابق ہیں ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ کتاب پیدائش کے باب دوم کی "تاویل" جدید طریقے پر کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اس صداقت کو نہایت رمزی اور اشارتی طریقے پر ظاہر کیا گیا ہے جس کی حقیقت مدون کتاب کو خود یا ان عارفوں کو جن سے مدون کتاب نے یہ عرفان حاصل کیا وجدانی بصیرت کے ذریعے بہم پہونچی تھی۔

سائنس اور مذہب کے توافق کے اس پہلے اقدام کی تفہیم کے لئے ہم کو بعض الفاظ کے معانی کو احتیاط کے ساتھ معین کرنا ضروری

ہوگا۔ بالخصوص الفاظ آزادی اور ہدایت یا حکم۔

گزشتہ صفحات میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ آزادی ارتقا کا معیار تصور کی جاسکتی ہے ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ جیسے جیسے ہم زندہ ہستیوں کے زینے پر چڑھتے ہیں اسی کی نسبت سے ہماری آزادی نشو ونما پاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس معیار کو پورا مفہوم اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب ضمیر کا جنم ہو جائے نیز یہ کہ یہ آخری آزادی اسی ہستی کو عطا کی جاسکتی ہے جو اور جانداروں سے زیادہ پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہو۔ لیکن اس برتر آزادی کے باوجود بھی اس جسم کے مطالبات کا ویسا ہی محکوم ہو جیسے دوسرے جاندار، اور جو جسم جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں انہیں عناصر پر مشتمل ہے جن سے دیگر جانداروں کے جسم بنے ہیں۔ لہذا حیاتیاتی طور پر انسان ابھی تک حیوان ہی ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ یہ امر لازمی تھا کیونکہ انہیں جبلتوں سے لڑتے جھگڑتے ہی وہ صحیح انسانیت کے مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔

اب اس پر غور کیجئے کہ ایک حیوان کی آزادی کن امور پر مشتمل ہے؟ بہت ہی کم امور ہیں اسے آزادی حاصل ہے۔

مونگے یا ستارہ ماہی۔ مونگے کی بہ نسبت مچھلی زیادہ آزاد ہے ذات الثدی، رینگنے والے جانور سے زیادہ آزاد ہے۔ لیکن زینے

کے سب سے اونچے ڈنڈے سے لیکر نیچے تک سب جاندار بغیر استثنار کے اپنے عضویاتی وظائف اور اپنے داخلی غدودوں کی تعمیری رطوبتوں کے غلام ہیں۔ ان سے ان کا پیچھا چھڑانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اپنی توارثی جبلتوں سے۔ کیونکہ عضویاتی وظائف۔ داخلی غدودوں کی رطوبتیں اور جبلتیں خود ان کی جسمانی ساخت کے راست اور لازمی نتائج ہیں۔ اب ہم خواہ دوررس غائیت کے زاویۂ نگاہ سے اس پر غور کریں خواہ بائیبل کے نقطۂ نظر سے یہ جسمانی ساخت جو عمل ارتقا کا نتیجہ ہے منشائے فطرت تھی۔ لہذا حیوانات آزاد نہیں ہیں۔ اور کتاب پیدائش کے اس فقرے کے کہ "خدا نے ان کو حکم دیا کہ وہ زندہ رہیں پھلے پھولیں اور اپنی نسل کی افزائش کریں" یہی رمزی اور علامتی تفسیر ہے۔ یہ یقین ہے کہ جب خالق مطلق نے حیوانات کی تخلیق خاص اعضا کے ساتھ کی تو اس میں یہ ہدایت مخفی تھی کہ وہ ان کا استعمال کریں۔ اس لئے اس بارے میں وہ مختار نہیں۔ اب ان کی مرضی وہی ہوگی جس کے وہ پابند کردیئے گئے ہیں۔ پیدائش کے چھٹے روز خالق سے پہلے انسانی جوڑے (آدم و حوّا) کو بھی یہی حکم ملا (اس حکم کی تاویل یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی نسل کے متعلق جو ابھی بے ضمیر تھی عمل کریں)

اگرچہ بہت سے مشاہیر سائنس ہمیں ملامت کریں گے مگر آیئے ہم کتاب مقدس کے متن کا[1] یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ سائنسی صداقتوں ہی کا رمزی اور متصوفانہ اسلوب بیان ہے تجزیہ کریں۔ بہت سی کیمیاگری پر تصنیفات کے متعلق یہی روش اختیار کی گئی ہے اور اس سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ بعض کیمیاگر اس سے بہت زیادہ علم کیمیا میں ترقی کر چکے تھے جتنا کہ ہمارا ان کے متعلق پہلے خیال تھا۔ اگر ایسا کرنا نتیجہ خیز نہ بھی ہو تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اس لئے آیئے کتاب پیدائش کا غور و فکر سے مطالعہ کریں۔ آٹھویں دن[2] خدا نے ایک اور ہستی کی تخلیق کی جس کی صورت بھی انسانی ہی

---

[1] (مصنف کا حاشیہ) کتاب پیدائش کے پہلے اور دوسرے بابوں میں جن دو یکے بعد دیگرے تخلیقوں کا ذکر ہے ان کی مقلدانہ تفسیر سے مصنف واقف ہے لیکن بجائے "علم" کے "ممانعت" کے لفظ کا استعمال اتنا چونکا دینے والا ہے کہ مصنف نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی مفروضہ تاویل پیش کرنے میں حق بجانب ہے۔ بلاشبہ یہ امر غیر اغلب ہے کہ ایک ہی اہم واقعے کو ایسے دو مختلف طریق پر بیان کیا جائے جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں۔

تھی اور پہلی مرتبہ متنِ مقدس میں الفاظ بھی دوسرے استعمال کئے گئے ہیں۔ باریِ تعالےٰ نے پہلے تو اس بشر کے نتھنوں میں روح پھونکی اور پھر یہ حکم اس کو دیا کہ خیر و شر کے علم کے درخت کا پھل نہ کھانا یہ جانتے ہوئے کہ وہ ضرور کھائے گا۔ یہ پر اسرار طرزِ کلام کس بات پر دلالت کرتا ہے ؟

یہ اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ قانون ارتقار کا سب سے اہم واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ یہ فطرت میں ایک نئے عدم تسلسل کے ظہور پر دلالت کرتا ہے جو عدم تسلسل اتنا ہی عمیق ہے جتنا کہ بےحس و حرکت مادے اور منظم زندگی میں واقع ہوا۔ یہ ضمیر کے وجود میں آنے پر دلالت کرتا ہے اور آخری آزادی پر۔

بلاریب اگر باریِ تعالےٰ حیوانات کو بھی امتناعی حکم دیتے تو وہ خود اس کے اپنے فعل کے متناقض ہوتا۔ ایک خاص طرز پر ان کی تعمیر کر کے اور ان کو ان حیاتاتی ضوابط میں مقید کرنے کے بعد جو ان کی ساخت کے تقاضوں کے مطابق تھے، وہ بغیر کسی قوی وجہ کے اپنے احکام کو واپس نہیں لے سکتا تھا ہاں جب اس نئی ہستی کو اس نے ضمیر عطا کر دی جو اس کے آئندہ ارتقار کے لئے مطلوب تھی اور جس سے سابق ہستیاں محروم تھیں، احکام میں

ترمیم ہوسکتی تھی۔ اس قول سے ٹھیک اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے
خدا نے اس کے نتھنوں میں زندگی کی روح پھونکی اور انسان
ایک زندہ جان بن گیا۔"

یہ متن اس حقیقت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے کہ خدا نے اسے
اور صرف اسے ایک ضمیر عطا فرمائی یعنی اختیار کی آزادی۔ اب
آئندہ کے لئے خدا اس مخلوق کو بعض ناقابل خلاف ورزی احکام
کی تعمیل کرنے سے روک سکتا ہے یعنی عضویاتی احکام بہ شکل حیوانی
جبلتوں کی تعمیل سے۔ باری تعالےٰ اب ایسا کر سکتا ہے کیونکہ یہ نئی
مخلوق آزاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو غدودی
رطوبتوں کا تحکم رُک سکتا ہے۔ آزادی میسّر آجانے کے بعد اسکو
اختیار ہے کہ وہ خواہ اپنی نفسانی خواہشات کے احکام کی تعمیل
کرے اور اپنے حیوانی اسلاف میں پھر سے جا ملے یعنی ارتجاع کرے
اور خواہ اس کے برعکس وہ اپنی حیوانی جبلتوں کے فطری ہیجانوں
کے خلاف جدوجہد کر کے اپنی آخری اور بلند ترین آزادی کی اکتساب
کردہ عظمت کی توثیق کرے۔ اب اگر وہ یہ طریق اختیار کرتا ہے کہ
جسمانی اذیتیں سہے اور طبعی محرومیوں کو برداشت کرے تو وہ
حیوان پر سبقت لے جائے گا اور بحیثیت انسان ترقی کرے گا

اور انسانی سطح پر عمل ارتقا کو جاری رکھے گا اور اس راستے پر گامزن ہوجائے گا جو بالآخر روحانیت کی بلند سطح پر اس کی رہنمائی کریگا۔
اس طرح کتاب پیدائش کا غیر معمولی طریق پر مختصر کردہ متن قابل ادراک بن کر معنی خیز ہو جاتا ہے اگر ہم اس کی یہ تاویل نہ کریں تو وہ مبہم رہ جاتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حکم امتناعی بھی حکم کا درجہ ہی رکھتا ہے یعنی منفی حکم۔ لیکن اس میں کچھ زاید دلالت بھی ہے یعنی آزادی عمل۔ یقیناً جب کوئی مجرم قید و بند میں ہے تو اس کو کوئی یہ حکم امتناعی نہیں دیتا کہ قید خانے سے باہر نہ نکلنا یا اور جرم نہ کرنا۔ اس کے لئے تو ایسا کرنا حالات کے اعتبار سے ممکن ہی نہیں۔ لیکن جب وہ قید و بند سے آزاد ہو جائے تو اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب اپنی مجرمانہ حرکتیں نہ کرنا کیونکہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مغالطہ اس بات کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوا کہ خالق مطلق جس نے بالارادہ زندہ ہستیوں کی تخلیق کی وہ اپنے احکام الفاظ کے ذریعہ نہیں دیتا بلکہ بعض افعال ان کے لیے طبعاً قطعاً محال بنا دیتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو انجینیر موٹر گاڑی کا کاربن کا ربیرٹر ا بناتا ہے وہ اسے حکم دیتا ہے کہ موٹر کے لئے آتش گیر گیس مہیا کرے لیکن کاربن ڈا پُررنے کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنا وظیفہ

ادا نہ کرے نا ممکن ہے۔ اگر وہ صحیح حالت میں ہے تو جوں ہی موٹر ہوا کو اندر کھینچے گی وہ گیسولین کو بخارات میں ضرور تبدیل کرے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا موٹر میں بیٹھا ہو جو اپنے افعال میں آزاد ہے تو اسے انجینیر ضرور یہ حکم امتناعی دے سکتا ہے کہ وہ موٹر کو چلانے والے پُرزے کو دبائے نہیں۔

جب ہم ان دو اُمور پر غور کرتے ہیں (۱) مقدس متن نے اس تخلیق کے واقعے کو تفصیل سے بیان کیا ہے بلکہ حقیقت میں اسی کو پہلا انسانی واقعہ قرار دیا ہے (۲) باوجود اس کی نافرمانی کے اسی مجرم انسان کو نسلِ انسانی کا بانی بنا یا گیا تو ہم کو پتہ چلتا ہے کہ مقدس کتاب نے جو اتنی اہمیت اس واقعے کو دی ہے وہ ثابت کرنے کے لئے ہے کہ آئندہ کے لئے اختیار کی آزادی کو بہت بھاری اہمیت حاصل ہے۔

باوجود حکم امتناعی کے یہ انسان نافرمانی کرتا ہے اور ابتدائی معصیت کا مجرم بنتا ہے جس کا داغ نسلِ انسانی ہمیشہ دھوتی رہیگی۔ یہ واقعہ ہرگز اس امر پر دلالت نہیں کرسکتا کہ یہ ایک جابرانہ سزا ہے جو انسان کی سب نسلوں کو بھگتنا پڑے گی۔ اس سے تو یہ ہی ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی انسانی ہستی کو ابھی تکمیل کا وہ درجہ حاصل نہیں

ہوا جو اس کے لئے مقدر ہے۔ وہ آزمائش میں ناکام رہا ہے[1] ابھی تک انسان پر اجدادی جبلتوں کا تسلط ہے اور ان کی فرماں برداری کرکے وہ اپنے خالق کی نافرمانی کر رہا ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان کو ایک ہی گومگو (DILEMMA) کی حالت کا سامنا کرنا ہوگا اور ہر انسان کو ایک ہی آویزش کا مقابلہ اور اسکو فتح اسی وقت نصیب ہوگی جب وہ اپنے داخلی حیوانی ہیجانات اور رجحانات کو پامال کرے گا اور روح کی فتوحات کے لئے اپنے آپکو وقف کردے گا۔ اس طرح وہ بحیثیت انسان اپنے مقصد زندگی کی تکمیل کرے گا اور اس ربانی منصوبے کی تکمیل میں مدد ہوگا جس کے پیش نظر ایک مکمل روحانی ہستی کی تخلیق ہے۔ لہذا انسان کی آگے

---

[1] یہ امر جاذب توجہ ہے کہ کتاب مقدس کے تیسرے باب میں ایک آزمائش کا ذکر بھی ہے کیونکہ قانون ارتقاکے پورے تذکرے کا دار و مدار طبعی آزمائشوں سے انتخاب کرنے پر ہے اور چونکہ ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کے وجود میں آنے کے بعد بھی نئی صورتوں کے انتخاب کرنے کے لئے آزمائشی طریقہ جاری رہا تاکہ اخلاقی اعتبار سے اصلح کا انتخاب ہوسکے۔ اب تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو کتاب مقدس نے پہلے سے بھانپ لیا تھا۔ (مصنف)

ترقی کا دار و مدار صرف خدا پر نہیں بلکہ ہر انسان کی فرداً فرداً سعی پر اس کا انحصار ہے۔ انسان کو آزادی اور ضمیر کی نعمتیں عطا کرنے کے بعد خالق اپنی قدرت کاملہ کے کچھ حصے سے اپنی مخلوق کے حق میں دستبردار ہوگیا ہے اور یہی انسان میں خدا کے نور کی توجیہ ہے ("خدا تمہارے اندر ہے") یہ آزادی حقیقی ہے کیونکہ خدا نے اس پر پابندیاں لگانے سے گریز کیا ہے۔ یہ امر ناگزیر ہے کیونکہ اسکے بغیر انسان آگے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا اور ارتقا کی غایت کو پورا نہیں کرسکتا۔[1]

"تنازع للبقا" کے لئے فطرت کے خلاف۔ عناصر کے خلاف۔ دشمن کے خلاف جو حیوانی جد و جہد ہو رہی تھی اور جس کی بدولت کروڑ صدیوں کے بعد انسانی صورت منصہ شہود پر آئی اَب اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اس جنگ کو ان حیوانی آثار کے خلاف شروع کرے جو اس کے اندر ابھی باقی ہیں۔ لیکن ضمیر کی موجودگی کی وجہ سے اَب آئندہ کے لئے فرد کو اہمیت حاصل ہے نوع کو نہیں۔ فرد ہی یہ ثابت

---

[1] اعتراضوں میں سے ایک اعتراض اس شکل میں ہو سکتا ہے "اگر خدا ایسے برتر قادرِ مطلق ہے تو اس نے ابتدا ہی سے مکمل انسان کی تخلیق کیوں نہ کردی" اس دلیل کا جواب ہم اگلے باب میں پیش کرینگے۔ (از مصنف)

کرکے دکھائے گا کہ آنے والی نسل کا وہ پیش رو ہے۔ روحانی طور پر
مکمل انسان کا جدِ اعلیٰ ہے۔ جس انسان کی ایک اعتبار سے قبل
از وقت مثال حضرت عیسےٰ تھے جو اس جنگ میں منصور اور کامیاب
نکلے۔ اس طرح ہم مسیح علیہ السلام کو درمیانی واسطہ۔ عبوری صورتوں
نئے تشبیہ دے سکتے ہیں جو شاید عمل ارتقار کے صحیح نتیجے کے وقت سے
دس لاکھ سال پہلے وجود میں آگئے اور اس لئے آئے کہ ہم کو مایوس
نہ ہونے دیں اور ہم پر یہ ثابت کر جائیں کہ ہماری سعی کامیاب
ہوسکتی ہے اور ضرور ہوگی۔ وہ ہمارے لئے جان دے گئے کیونکہ
اگر وہ صلیب پر نہ چڑھائے جاتے تو ہمیں اِن کی عظمت پر ایقان
حاصل نہ ہوتا۔[۱]

لہٰذا ضمیر کی آزادی پر کسی پابندی کو عاید کرنا عظیم قانون ارتقا
کے منشار کی مخالفت کرنا ہے یعنی ربانی منشار کی مخالفت کرنا ہے

---

۱ مصنف عیسائی ہے اور رحمۃ اللعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت سے ناواقف
ہے اس مقام پر پہونچکر وہ ایک ماہر سائنس کی حیثیت کھو کر ایک متعصب عیسائی
کی شکل میں جلوہ گر ہے ورنہ یہ حکم لگانے سے پہلے اور مذاہب کے ہادیوں کی
طرف بھی توجہ کرتا۔ اور جانچتا۔ (مترجم)

اور یہ شر کو پھیلاتا ہے۔

اگر بعض افراد اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے شر پھیلاتے ہیں تو یہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ یہ ارتقا کی ناسازگار صورتیں ہیں۔ ان کا ارتقاء اتنا مکمل نہیں ہوا کہ وہ غایت ارتقا کو سمجھ سکتے جہانتک ایسے افراد کا تعلق ہے آزمائش ناکام ہو گئی۔ کائنات فطرت میں مچھلی کے لاکھوں انڈوں میں سے 'بخت و اتفاق' انڈوں کی بہت کم تعداد کے لئے سازگار ہوتا ہے۔ چونکہ ایک انڈے سے دوسرے انڈے کو ممیز کرنا ناممکن ہے اس امر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ کونسا انڈا بچ نکلا۔ بنی نوع انسان میں فرد کی وہ صورت نہیں کہ وہ ممیز نہ ہو اور ہر فرد کے لئے اخلاقی ارتقاء کا عنصر بننے کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ایک سا موقع ہے۔ اگر انسان اس اتفاق حسنہ سے فائدہ نہ اُٹھائے اور اگر وہ وجدانی یا عقلی طور پر اپنے فیصلے کی اہمیت کو نہ سمجھے تو یہ اس امر پر دلالت کرے گا کہ وہ اپنا کردار ادا کرنے کے ابھی قابل نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں دوسرے افراد اور ارتقاء کے عروجی دور کے ضامن بن کر اس ذمہ داری کو قبول کر لیں گے۔

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بنی نوع انسان کی تعلیم و ہدایت کا بندوبست کریں اور یہ بہانہ کر کے کہ معاشرہ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر

ان کی رہنمائی کرے گا ان کو تاریکی میں نہ چھوڑ دیں۔کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے ضمیر کو کسی دوسرے کے ضمیر کا قایم مقام بنا دے کیونکہ ترقی کا انحصار ذاتی سعی پر ہے اور اس سعی کو کچل دینا جرم ہے۔

" انسان کا پورا عزم اس جدو جہد پر مجتمع ہونا چاہیئے جس میں کہ انسانی عظمت کا جدید حاصل کردہ احساس اس کا ہر طرح موید ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسی احساس سے اسے اپنے بلند مرتبہ مقدر کے حصول کے لئے ضروری قوت اور تصدیق بھی پیدا کرنی چاہیئے۔اس سعی کی شدّت ہی صحیح مدارج انسانیت کو بروئے کار لا سکتی ہے نہ کہ اس سعی کی شکل اور نتائج ۔

دور رس غائیت کا انداز اور صحف انبیا کا اسلوب بیان دونوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کو آزادی خدا نے بخشی۔ ہر دائرۂ عمل میں مادی ہو یا اخلاقی یہ ایک حقیقت ہے اور جن وجوہ سے کہ آمریتوں کو قابلِ ملامت سمجھا جاتا ہے انہیں وجوہ سے مذکورہ بالا حقیقت بعض اور عقیدوں کو بھی رد کرتی ہے۔آزادی صرف ایک عطیہ ہی نہیں وہ ایک آزمائش بھی ہے۔

اس ساری بحث کا فوری نتیجہ یہ ہے کہ ضمیر کی آزادی کا تعمیری مظاہرہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب انسانی جماعت کے

فرد کو معلومات کے سب ماخذوں تک رسائی ہو اور وہ اپنی قوتِ فیصلہ کو مزاحمت کے بغیر آزادانہ کام میں لا سکے جیسے عملِ ارتقا میں کسی نئی جاندار نوع کو ماحول سے عہدہ برا ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا ویسے ہی یہ بھی مطابقت ماحول کی اہلیت کو جانچنے کے لئے ایک آزمائش ہے۔ لہٰذا اس کو بھی اسی طرح آزاد ہونا چاہیئے کہ وہ ان عناصر کو بہم کرسکے جو اس کے قوتِ فیصلہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہوں کتابِ پیدائش[1] کے صحیح صحیح نقطۂ نظر سے کسی غیر شخص کو اپنی قوت ارادی سے کسی فرد کی قوت ارادی کی جگہ لے لینا یا پہلے ہی سے کسی ایسے انتخاب کو بروئے کار لے آنا جو کسی فرد کے ارادے کو متاثر کرسکے ایک ناقابلِ معافی فعل ہے۔ ہر فرد کو اس امر کی آزادی ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی قوتِ استدلال کی نشوونما کرے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرے تاکہ اس کی قوتِ فیصلہ صحت مند ہو اور بدہیئت نہ ہو جائے۔ جو ہدایت کے متلاشی ہیں وہ پوری طرح آزاد نہیں۔ ان کے دماغوں کو علم کی روشنی سے منور کرنا چاہیئے ان پر جبر و اکراہ نہیں ہونا چاہیئے[2]۔

---

[1] اور عہد نامۂ جدید "جہاں کہیں روح ربانی ہوگی وہاں آزادی ہوگی" (پال کارنتھیز ۳، ۱۷) (مصنف) [2] قرآن پاک کا ارشاد ہے "لااکراہ فی الدین" دین کے قبول کرنے میں جبر جائز نہیں۔ (از مترجم)

اگر کتاب پیدائش کی یہ تاویل قبول کرلی جائے تو یہ لزوماً انہیں نتائج کی طرف رہنمائی ہے جو دورس غائیتت کے ہیں۔ فرق صرف اغراض ومقاصد کا ہے۔ کلیسا کے نزدیک انسانی سعی کی غرض وغایت "گناہ آدم" جس کی اجازت خود خدا نے دی سے نجات بالکفارہ ہے اور ہم اس کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اجدادی یا دوں کے ورثے جن کے خلاف جنگ فرد ہی کے لئے ممکن ہے، زائل ہوں چونکہ "گناہِ آدم" اتنا ہی کچھ تھا کہ جاندار نے فطری میلانات اور خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور انسانی عظمت کو نظر انداز کیا' دونوں صورتوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔

اس توضیح کے مطابق ارتقاء میں اب کچھ حصہ ابنِ آدم کے ذمے ہے۔ اب تک جو فریضہ "عمل بقائے اصلح" ادا کرتا تھا وہ اب بہت کچھ آزاد "اختیار" ادا کرے گا۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ اپنے اور اپنی نوع کے مقدر کی سمت متعین کرنے میں محرک بن کر ترقی کی راہ پر چل نکلے۔ اب سوال یہ ہیں کہ اس عمل کا اظہار کیونکر ہوگا؟ فطری مطالبات کی (صحیفوں کی زبان میں خواہشات وتحریصات) جن سے زیادہ وہ کل تک اور کچھ جانتا ہی نہ تھا کیونکہ صرف یہی اہم تھے' کیونکر مدافعت کرکے وہ عمل ارتقا کا ممد بن سکے گا؟ کس طرح سے اصلح' جو ضروری

نہیں کہ اقوامی، زیادہ مستعد، زیادہ مدافعت کرنے والا بھی ہو اپنا کردار کرنے کے قابل ہو گا؟

یہ اپنا کردار ارتقار کے نئے عنصر کی بدولت ادا کر سکے گا یہ عنصر قوتِ گویائی کے ساتھ ساتھ ہی جزوِ ارتقار بن گیا ہے۔ یعنی روایات۔
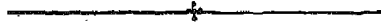
(۹)

روایات، ارتقا کی انسانی وضعیت "بے کار علامات" اخلاقی تصوّرات اور خیر و شر کا تخیل۔ خدا پر ایمان، اور خدا کا تصوّر منزلِ مقصود۔

انسانی نسل کے ارتقا میں ایک نیا آلہ روایات کی شکل میں نمودار ہوگیا ہے اور یہ آلہ اسی ہستی کے اپنے قبضے میں ہے جسے آگے ارتقا کے زینے طے کرنا ہیں۔ اگر عمل ارتقا کا مطمح نظر صرف مادی ہوتا اگر اس کی غایت اور حیوانات کے مقابلے میں انسان کے مادی جسم کی صرف تکمیل ہی ہوتی تو کم از کم دیگر عمیق استحالے کر کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ انسان طبعی توازن اور آزادی کی ایسی اضافی حالت میں پہنچ چکا ہے جس نے اس کی عقل و فہم کی مدد سے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ سب حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکتا ہے۔

برعکس اس کے اگر یہ اضافی حیاتیاتی تکمیل کسی اعلےٰ اور فائق

طبعی مطابقت کے حصول کی صرف کوئی پہلی منزل ہو تب اس کی ضرورت تھی کہ ارتقاء کسی اور زیادہ معنی خیز مرحلے کی طرف چلتی۔

دماغ کے بے نظیر عطیہ نے جسے تجرید (ABSTRACTION) کی واقعی حیرت انگیز قوت حاصل ہے، ان سست رفتار اور کبھی کبھی بھدی وضعیتوں کو فرسودہ بنا دیا ہے جن پر ارتقاء اب تک عامل رہا ہے۔ انسان کو صرف اپنے دماغ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس کی بدولت صرف تین نسلوں کے عرصے میں اس نے مملکت ہوا کو فتح کر لیا ہے۔ جس کو عملِ ارتقاء کے طریقوں سے حاصل کرنے میں جیوانات کو لاکھوں برس لگے[1]۔ یہ بھی دماغ ہی کی کارگزاری ہے کہ ہمارے حواس کے اعضا کا دائرۂ عمل لاکھوں گنا وسیع ہو گیا ہے جو ہمارے وہم گمان کی حدود سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ہم چاند کو کھینچ کر تیں میل کے فاصلے پر لے آئے ہیں۔ ہم بے انتہا چھوٹی چیزیں اور بے انتہا دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں۔ نہ سنائی دینے والی آوازیں ہم سن سکتے ہیں۔ فاصلوں کو ہم نے گھٹا دیا ہے اور طبعی زمان کی ہم نے جان نکال دی ہے۔

---

[1] مصنف کا مطلب انسان کا ہوائی جہاز دں کر ذریعہ اور پرندوں کا پروں کے ذریعے اڑنا ہے۔ (مترجم)

پیشتر اس کے کہ ہم ان کو کما حقہٗ سمجھنے کے قابل ہوتے ہم نے کائنات
کی قوتوں کو محکوم بنا لیا ہے۔ ہم نے فطرت کی آزمائشیں کرکے غلطیوں
کی اصلاح کے ناگوار اور غارت گر اوقات طریقوں کو نیچا دکھا دیا ہے اور
یہ اس لئے کہ فطرت انسانی دماغ کی شکل میں اپنا شاہکار پیش کر چکی
تھی۔ لیکن باوجود اس کے کہ مطابقت ماحول کا قانون جہاں تک ہمارا
تعلق ہے اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ ارتقا کے بڑے بڑے قانون اب بھی
کار فرما ہیں۔ اب ارتقا کے آگے چلنے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اگر ہم
اپنی فتوحات کے مطالب اور مقصد کو غلط معنی پہنائیں تو ہم اپنے آپ کو
ورطۂ ہلاکت میں ڈالنے کے لئے آزاد ہیں۔ اور اگر ان فتوحات کی صحیح
بصیرت ہم کو ہو جائے اور ہم یہ سمجھ جائیں کہ اب ترقی صمیم قلب سے اخلاقی
اور روحانی نشوونما کے لئے سعی کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے تو ہم بہت
سے آگے بڑھنے، ارتقا کو وسعت دینے اور خدا کے ساتھ تعاون کرنے
میں بھی آزاد ہیں۔ ہماری آزادی، جس پر فخر کرنے میں ہم حق بجانب
ہیں، ہم کو اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ اب ہم ہی عمل ارتقا کے
قراول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جس طریقہ سے ہم اس آزادی کا
استعمال کریں گے اس سے ہم یہ ثابت کر کے دکھلائیں گے کہ آیا ہم
اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے آمادہ ہیں جو تقریباً

ناگہانی طور پر ہم پر نازل ہوگئی ہے۔

انسانی جسم میں کچھ چھوٹی موٹی تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔ بعض مصنفوں نے معلوم حالات سے نامعلوم حالات اخذ کرنے کی صحیح سعی کئے بغیر اور مخالفت کے خطرے کا نہ خیال کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مستقبل کا انسان بالوں سے محروم ہوگا اس میں امعائے زائدہ (APPENDIX) نہیں ہوگی اور شائد دانت بھی اس کے غائب ہوں یہ ممکن ہے لیکن کلیتاً غیر دلچسپ پیشگوئی ہے۔ جو چیز جاذب توجہ ہونی چاہیئے وہ تو یہ معلوم کرنا ہے کہ انسان کو ارتقار کی جو مناسب امداد کرنا ہے اس کی کیا صورت ہوگی۔ اس کی ان ناقابل اندازہ حقیقتوں کا کیا حشر ہوگا جو وہ دنیا میں اپنے ساتھ لایا ہے یعنی تجریدی تصوریت اخلاقی تخیئل، روحانی تصورات، اور ان کا ہم آہنگ باہم ارتباط۔

روایات کے بغیر جنہیں اب ارتقا کی اور وضعیتوں کا قائم مقام بننا چاہیئے، انسان کی آئندہ ذہنی اور روحانی نشوونما کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ افراد کی یادداشتیں، ان کے تجربات، ان کی ترقی یافتہ حالت، آئندہ ان کے اسلاف تک حد درجہ کارگر اور سریع طریقے پر منتقل ہو سکتی ہیں۔ ارتقی جبلتوں کو مستحکم ہونے میں ہزاروں صدیاں درکار ہوئیں اور پھر بھی بعض اشارات ہی، جو نوع کے تحفظ کے لئے لابدی تھے،

استمرار پذیر ہوسکے۔ معین موثرات کے زیر اثر ان کی ترقی کسی طبعی نتیجہ کے پیدا کرنے تک ہی محدود تھی، جب حالات و موثرات بدلتے تھے تو بڑی محنت و کاوش سے اور جبلتیں بہم کرنا پڑتی تھیں جب صرف حیاتیاتی صنعتیں ہی کام کر رہی ہوں تو یہ طریق عمل بے حد سست رفتار رہے۔ جب سے موٹر گاڑیوں کی ایجاد ہوئی ہے ہزاروں کتوں اور بلیوں کے بچے اور لاکھوں چوزے اور دیگر حیوانات سڑکوں پر کچلے جا چکے ہیں۔ یہی حالت مدت مدید تک جاری رہے گی اور محض اس لئے کہ جو حیوانات اتفاق سے ایسے حادثوں سے بچ نکلے وہ اپنے تجربات، قوت گویائی اور روایات کے فقدان کی وجہ سے اپنی اولادوں کو منتقل نہیں کر سکتے۔ محض واضح گویائی ہی کی بدولت اکثر ماحولی مطابقتوں کو بروئے کار لانے میں جو وقت ضروری تھا اس میں بھی بے مقدار بہ کمی ہو گئی ہے۔ جس چیز کو ہم بچوں کی تعلیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ایک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ منزل پر پہنچا دینے والا راستہ تصور کیا جا سکتا ہے جو حیاتیاتی عمل مطابقت با حول کا قائم مقام ہے اور جس کی بدولت ہم ایک نسل کے عرصہ میں ان نتائج سے بہتر نتائج حاصل کر لیتے ہیں جس کو اور جانداروں نے لا تعداد جانیں تلف کر کے قرنہا قرن میں حاصل کیا۔ قوت گفتار اور روایات چند ہی سالوں میں

ملزوم افعال اضطراری کو تیار کر دیتے ہیں اور پھر ان افعال اضطراری کو ارثی خواص میں منتقل کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ویسے ان تقلبات کے لئے مدتیں درکار ہوتیں مگر قوتِ گویائی کی مدد سے ہر چیز اس طرح وقوع پذیر ہوجاتی ہے کہ تجربے کے سارے اکتسابات فوری طور پر ارثی بن جاتے ہیں۔

اسی امر کی بدولت ہم نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ روایات ارتقا کی نئی وضعیت پر مشتمل ہیں۔ اسی نئی وضعیت کا انسان مرہون منت ہے کہ اس نے تیس ہزار برس سے کم مدت میں اتنا کچھ حاصل کرلیا۔ اسی کی بدولت انواع کی وہ یادداشتیں جو کروڑوں برس ہیں ذہن میں محفوظ ہوئی تھیں ہمارے داخلی اعماق میں مدفون ہوگئیں اور ان کی جگہ راست انفرادی یادداشتوں نے لے لی اور جس کی وجہ سے ماحول کے تغیرات سے فوری مطابقت میسّر ہوگئی۔

روایات کی یہ تصوّریت بے ساختہ ہم سے اپنے اس خیال کے قبول کرلینے کا مطالبہ کرتی ہے یعنی یہ کہ گویا قانون ارتقا نے بقیہ اجسام نامی کی طرف سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور انسانی دماغ کے منصہ شہود پر آتے ہی اپنے عمل کو انسان کی نشوونما کی طرف منعطف کر دیا، ارتقا کی پوری تاریخ اس امر کی توثیق کرتی ہے جوانواع کامیاب ہوئیں

یا بہ الفاظ دیگر جو زندہ رہیں اور ارتقا کے زینے طے کرتی رہیں ان کی
کامیابی کا انحصار ان نئی "ایجادات" پر تھا جو ان کے طبعی اجسام کو
تبدل نوعی، مطابقت ماحول، بقائے اصلح، اور اغلباً کچھ دیگر عناصر کی بدولت
میسر آیا۔ جب کوئی جدید خاصہ جو ترقی یا منفعت کا حامل تھا "ایجاد"
ہوگیا تو جس نوع یا جنس کو یہ قسمت ملی اس کی ارتقا، عموماً اس سے
متاثر ہوئی اور اس مخصوص خاصہ کی آئندہ نشوونما اور ترقی مشاہدہ
کی جاسکتی ہے (آنکھ، کان، مستقل درجۂ حرارت وغیرہ) انسان کو جو
خاصہ نصیب ہوا وہ یقیناً اس کے دماغ کی پیچیدہ ساخت ہے اور
اسی دماغ میں قوت گویائی، عقلی، جمالی، اخلاقی، اور روحانی سرگرمیوں
کے مراکز۔ لہذا بدیہاً اسی دماغ کے ذریعے اس کے ارتقا کو آگے گامزن
ہونا چاہیئے۔

ہمارے اس مفروضے کا مقصد یہ تھا کہ سائنس کے کم سے کم متنازع
فیہ مسائل کی اساس پر قانون ارتقا اور زندہ ہستیوں کے زینے کی چوٹی پر
انسان کے ظہور کی قابل قبول توضیح پیش کریں۔ اس کے پیش نظر یہ واضح
کرنا بھی تھا کہ گویا ارتقا کے لا محدود امتداد کا تصور ہمارے لئے ممکن
ہے کیونکہ اس طرح عمل ارتقا کو ایک ٹھیک ٹھیک اہمیت حاصل
ہو جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر کرنا بھی اس کا مقصود تھا کہ انسانی عظمت،

عقل و فہم کی نشوونما، اور روحانی تصورات کا ارتقاء میں اپنا ایک
مقام ہے جو در اصل ارتقاء کے آخری مرحلے پر مشتمل ہے۔ بالآخر اسکی
بھی اسے وضاحت کرنا تھی کہ بہت سی دیو مالائیں ، اور اخلاقی یا
مذہبی عقیدے ایسی خالص قدر کے حامل ہیں جو تجربے کے ماورائے
ہے لیکن بحیثیت مجموعی عمل ارتقا کے ساتھ بہت قریبی تعلق رکھتی ہے۔

ہمارا مفروضہ صرف جسمانی صورتوں کے ارتقا پر ہی حاوی
نہیں بلکہ تصورات کے ارتقاء پر بھی۔ اس امر سے کوئی شخص بھی انکار
نہیں کرسکتا کہ انسان ایسی قوتوں کے زیر اثر ہے جن کا ماخذ تصورات
ہیں۔ بعض تجریدی تصورات کے ماحصل نے ہمارے مادی ماحول
کی کایا پلٹ کردی ہے (مثلاً سائنس، مشینیں) اور ہماری خانگی زندگی
اور معاشرتی زندگی کو نئی شکل دے دی ہے۔ لیکن اگر اس محرک اور
روحانی فیضان کی تلاش کی جائے جن کی بدولت انسان نے یہ سب
کچھ حاصل کیا تو وہ ان تصورات میں ملیں گے جن کو "بیرمی تصورات"
(LEVER-IDEAS)" کا نام دیا جاسکتا ہے یعنی ضعیف اعتقادات،
امنگیں اور مذہبی تصورات۔ ہر وہ نظریہ جو ان کو نظر انداز کرتا ہے
اور صرف بنی آدم کی جسمانی فلاح کو اسے ایک ریوڑ سمجھ کر قابل لحاظ
امر سمجھتا ہے نامکمل اور ناکافی ہے۔ ہم روایات اور ان کے ماحصل

تمدن کو بطور جدید عناصر انتقار پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے ماحول کے ساتھ ایک پائدار ربط قایم رکھتے ہیں۔ اس کے لئے لازمی ہوگا کہ ہم تمدن کی اس سے وسیع تر تعریف منطقی کریں جو معمولاً آجتک کی گئی ہے۔

ایک واقعی تمدن کے ابتدائی آثار (CRO-MAGNON) انسان میں ملتے ہیں یہ فرانس اور شمالی سپین میں آباد تھا ہزاروں برس سے اس کے آبا واجداد چقماق کو تراش کر تیشے، لکڑی چھیلنے کے رندے اور پیکان بنانا جانتے تھے۔ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ان انسانی صنعتوں کی عمر متعین کرنا مشکل ہے۔ بعض مصنف اس بات کے قائل ہیں کہ (CHELLEAN) ثقافت سب سے پرانی اور چھ لاکھ پہلے کی ہے۔ اس زمانے کی انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں مسلمہ فنی مہارت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن اور مصنف اس رائے کے ہیں کہ اس زمانے کو گذرے صرف چالیس پچاس ہزار سال ہوئے ہیں۔ لیکن اس رائے میں بہت شک کرنے کی گنجائش ہے۔ ابتدائی (PRE-PALEOLITHIC)[1] پرتوں میں ہم کو صرف تیشے

---

[1] وہ زمانہ جب ابتدائی آدم پتھروں کے اوزار بنا تا تھا وہ (PALEOLITHIC) دور کہلاتا ہے (PRE) کا اضافہ ابتدا کے معنی دیتا ہے۔ (مترجم)

پتھر ملتے ہیں جو اتنے ناہموار ترشے ہوئے ہیں کہ یہ امر موضوع بحث بن چکا ہے کہ آیا واقعی ان کی تراش خراش انسانی ہاتھوں نے کی۔ اس سے بھی بہت پہلے غالباً دس لاکھ برس ہوئے (OSBORN کے خیال کے مطابق) ایزوک واقعہ انگلستان میں اغلباً ایک خام سے تمدّن نے نشوونما پائی۔ اور اس کا بھی دعوے کیا گیا ہے کہ انسان ارضی دور ثالث (PLIOCENE AND MIOCENE) میں وجود میں آچکا تھا۔ ان انکشافات پہ ابھی تک اتنی کچھ رد و کد ہو رہی ہے کہ ہم اس کو اپنا موضوع بحث نہیں بنا سکتے۔

تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قدیم CRO-MAGNON نسل کا پہلا نمائندہ تقریباً تیس ہزار برس پہلے قریب PALEOLITHIC دَور میں ظاہر ہوا۔ آخری CRO-MAGNON کا تمدّن تقریباً بیس ہزار برس پُرانا ہے۔(۹)

یہ انسان دراز قد تھے اوسطاً چھ فٹ ۳ انچ کے۔ اور جن کی بود و باش بحیرہ روم کے خطوں میں تھی ان کے قد چھ فٹ ساڑھے پانچ انچ تک تھے۔ ان کی پیشانیاں اونچی۔ چہرے چوڑے۔ ستواں ناکیں اور آگے کو نکلی ہوئی ٹھڈیاں تھیں۔ ان کی کھوپڑی کی سمائی ہماری کھوپڑی سے زیادہ تھی۔ وہ بنی نوع انسان کے حسین

نمونے تھے اور سب سے زیادہ خوبی ان کی یہ تھی کہ وہ بڑے صناع تھے۔
جو نقش و نگار ان کے غاروں میں ملتے ہیں وہ اکثر قابلِ تعریف ہیں۔
ان کے تراشے ہوئے بُت اور ہڈیوں اور ہاتھی دانت پر ان کی کھودی
ہوئی تصویریں، نہایت عمدہ حقیقت نگاری کے مظہر ہیں۔ اس کے اوزار
اور اسلحے شاندار تزئین کے حامل ہیں۔ اس کے جواہرات اور زیورات
حیرت انگیز طور پر خوش سلیقگی اور دلربائی کی نمائش کرتے ہیں۔ کرومیگنن
ثقافت تقریباً بارہ ہزار برس پہلے اپنے عروج پر تھی۔

یہ بے کار فنی تخلیقیں، بے کار کا لفظ اس لیئے استعمال کیا ہے کہ
حیات کو قایم رکھنے یا اس کا تحفظ کرنے کے لئے یہ غیر ضروری تھیں،
بنی آدم کی تاریخ میں ایک اہم عہد کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ ارتقار کی
نئی سمت پر انسانی روح کے نشو و نما کا ثبوت پیش کرتی ہیں وہ
سمت جو حیوانوں کی سمت سے انحراف کر رہی تھی۔ یہی ابتدائی
"بے کار علامتیں" اصل میں توجہ کے قابل ہیں۔ یہی تجریدی اور روحانی
تصوّرات کی اصل کی حامل تھیں، انہیں میں خالق مطلق کے اس تصوّر
کی ابتدا تھی جو دہشت کی آمیزش سے پاک تھا۔ اور انہیں میں
اخلاق، فلسفے، اور سائنس کا تخم تھا۔

دوسری حرکات یعنی جبلی اشارات جو زندگی کے تحفظ اور

نسل کی افزائش کے لیۓ ضروری تھیں اور جو اب سے پہلے کتنا اہمیت کی مالک تھیں اب ثانوی حیثیت پر اتار دی گئیں اور اب ان کا کام صرف یہ رہ گیا کہ ان نئی علامتوں کو نمایاں کرنے میں امداد کریں۔

اگر انسان اور حیوان میں اساسی اور جوہری تفرق کے لیۓ کسی ثبوت کی ضرورت باقی تھی تو وہ ان "بیکار علامتوں" کے ناقابل تصوّر اور پیش بینی کی گرفت میں نہ آنے والے ظہور نے مہیا کر دیا۔ گزرے ہوۓ کروڑہا برس کے دوران میں کبھی کوئی اس سے پہلے کی چیز وجود میں نہ آئی تھی۔ اب تک حیوان کا واحد جبری مشغلہ یہی کچھ رہا کہ بھوک کی اذیتوں کا تدارک کرتا رہے، دشمنوں سے بچاؤ کے لیۓ جدوجہد کرے اور خاص موسموں میں اوقات مقررہ پہ غیر فانی خلیوں سے مرکب طوبت شونی لطافت کو خارج کر دے۔ الله الله خیر سلا آگئی موت!

حشرات الارض میں تو بے حد مہارت خصوصی نے فرد کے سالمہ شخصی کو اور بھی محدود کر دیا ہے۔ وہ معاشرے یعنی مہال یا چھتے کی لاشخصی شخصیت میں گم ہو گیا ہے۔ ہر فرد کی حیثیت صرف ایک علیحدہ عضو کی سی رہ گئی ہے جو اندھا دھند اس کام میں لگا ہوا ہے جس کے وجود کا جواز کچھ اور بجا بر متعین علامات میں ہے وہ علامات معدے، انتڑیاں، جبڑے، خود مختار عضلات ہیں جو اگر جماعت سے

علیحدہ کر دیئے جائیں تو فرداً فرداً زندہ نہیں رہ سکتے۔

ہر جگہ، اور ہمیشہ، بے حد متنوع صورتوں میں، یہ کارآمد علامات
سخت گیری کے ساتھ تحفظ نوع ہی کی طرف مائل ہیں اور ایسی صورت
میں بھی کہ نوع آگے کوئی ترقی کرنے کے قابل نہیں رہی اور ناکام
تجربہ ہے جس کی قسمت میں معدوم ہو جانا یا محض جیئے جانا لکھا ہے۔

اب یکایک نجات کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ نئی ہستی ابن
آدم، اپنے عالم کو بدلتا ہے۔ وہ طبعی کیمیاوی اور حیاتیاتی قوانین سے
اپنا پیچھا چھڑاتا ہے۔ جمالی خواہشات اور تصورات جنم لیتے ہیں،
اور اس کے ہاتھ ان کو مادی طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔ آئندہ کیلئے
جسمانی خواہشات اور تحریصات کی تسکین کفایت نہیں کرتی۔ اب بھی
کائنات کی طرف وہ نگاہ اٹھاتا ہے۔ لیکن اب وہ اسے سمجھنے لگتا ہے۔ وہ
خیال آرائیاں کرتا ہے، فطرت کے چربے اتارتا ہے، ایجادات کرتا ہے
اور آگاہی حاصل کرتا ہے۔ جمال کا احساس اس پر جلوہ آرا ہوتا ہے
وہ اپنی آرائش کرتا ہے وہ رنگوں کی تلاش کرتا ہے اور ان کو ترکیب
دیتا ہے۔ اس کے اسلحوں اور اوزاروں میں، جسم کو منفعت پہونچانے
والے آلوں سے زیادہ، کچھ اور چیز بھی درکار ہے۔ ان میں حسن بھی ہونا
چاہیئے۔ وہ ان پر نقش و نگار کندہ کرتا ہے، ان پر صیقل کرتا ہے اور

ان پر موتیں بنا تا ہے۔ روز مرہ کی مروج اشیا ابنِ آدم کی ہستی کی بقا کے لئے اب اس کے سامنے ایک نہیں دو وجوہات کی علامت بن کر آجاتی ہے۔ ایک تو بقائے نسل کا تحفظ اور دوسرے تصورات کی خالص انسانی مملکت میں اس کی اصلی ارتقا کی امداد۔ جمالیاتی احساس کا ظہور، جو جلد ہی ترقی کرکے حیرت انگیز بلندی تک جا پہونچتا ہے، ارتقا کی نئی تعیین سمت کی پہلی بین شہادت ہے۔ اور یہی خالص تخئیل کا ماخذ ہے۔ جمالیاتی حُسن ہی فہم و ذکا کا علامتیت کا SYMBOLISM لکھنے کا اور ان سب ذرائع کا ابتدائی ماخذ ہے جو اس کی آئندہ کی نشو و نما کو متعین کرتے ہیں۔

اب ابنِ آدم شکار کرکے پیٹ بھرنے کا ذریعہ نکالتا ہے۔ وہ جنگلی جانوروں کے پکڑنے کے لئے دام اور پھندے بناتا ہے۔ وہ صید افگنی میں کامیابی کے لیئے جادو کی تخلیق کرتا ہے گویا ایک خیالی اور جھوٹ موٹ کی دُنیا کی تخلیق کر رہا ہے جس کے رہنما جادوگر ہیں جن میں اثر و اوہام کو قابو میں رکھنے اور ان کی رہبری کرنے کی اہلیت ہے۔ یہ سب وہ جزیات ہیں جن کا فرانس کے غاروں کے نقش و نگار اور تصویریں اظہار کرتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اگر ہم کو عالم آخرت اور حیات بعد الممات کے تصور کے

موجود ہونے کے ثبوت کی تلاش ہو تو ہمیں اسے اس زمانے سے بھی قبل قبرستانوں میں ملے گا جو پہلی غیر ضروری علامتیں ہیں۔ اس دور کے ابن آدم کے نزدیک مردوں کی خواہشات اور ضروریات بھی وہی ہیں جو زندہ انسانوں کی۔ زندہ انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مُردوں کی امداد کریں اور ان کے ساتھ وہ چیزیں رکھدیں جن کی موت کی خواب سے بیداری کے بعد ان کو یاد آئے یا جنکی ان کو ضرورت ہو۔ اس دور میں بھی ابنِ آدم کی یہ خواہش تھی کہ اس کی زندگی دوامی ہو (PALEOLITHIC) دور میں مُردوں سے متعلق خبرگیری کا عقیدہ نقطۂ آغاز تھا ان مراسم تکفین و تدفین کا جو آج بھی ہم رفتگان کے لیے بجا لاتے ہیں۔ یہی منبع تھا ان سب تصوّرات کا جو پہلے توہمات کی صورت میں ظاہر ہوا اور بعد میں اس نے مذہبی اور عقلی صورت اختیار کی۔

(CRO-MAGNON) دور کا ساحر دواؤں کا سیانا ہوتا تھا۔ جب کوئی بیمار ہوتا یا بستر مرگ پر ہوتا تو اسے بلایا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ اور اس کا ایک اہم مقام تھا۔ معتدبہ شہرت و نفوذ اس کو محیط رہتے تھے۔ حیات بعد الممات کا تصوّر (صید سے معمور جہاں میں نئے سرے سے صید افگنی کی توقع۔ مسرت افروز

میدان شکار کی خواہش جو ہمارے زمانے میں اب بھی عام ہے) نے
اغلباً NEANDERTHALIAN انسانوں میں جنم لیا اور
MAGDALENIAN[1] غاروں میں اس نے ترقی کی اور
پھلا پھولا۔ یہ تصورات بھی جن کی اہمیت اس امر سے بھی ثابت ہوتی
ہے کہ بعد ازاں یہ ہم وقتی طور پر دنیا کے سب خطوں میں ظہور پذیر
ہوئے، ایک ارتقار میں سے گزرے۔ اگرچہ ان کو بعض انسانی جماعتوں
نے عملاً بغیر کسی تبدیلی کے جوں کا توں رکھا، یا پھر سے ان کو ایجاد
کر لیا، لیکن اور جماعتوں نے ان کی نئی وضعیں قائم کیں، ان کو نئی
شکلوں میں ڈھالا، اور ان کو عقیدوں اور فلسفیانہ تصورات میں الجھایا۔

اب فرد کا فریضہ ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے جیوانی
ارتقا میں بھی نئے خواص جو ارتقار کی کسی وضعیت کے نتیجے کے طور
پر ظاہر ہوتے تھے ہمیشہ افراد ہی میں نشوونما پاتے تھے پورے جنس کے
حصے میں نہیں آتے تھے اور بغیر اس لحاظ کے کہ جن افراد کو یہ خواص
ملے ہیں ان کی فضیلت کے ضامن ہونے کے یہ اہل ہیں یا نا اہل۔
تبدل نوعی میں نہ کبھی عمومیت ممکن ہے اور نہ ہم وقتیت اگر ایسا ہو

---

[1] غالباً شمالی امریکہ میں سینٹ لارنس خلیج کے جزائر کے غار (مترجم)

تو وہ عمل تبدل نوعی نہیں ہوگا بلکہ ایک صریحی مظہر فطرت ہوگا جس کا
کوئی سبب ہوگا۔ یہ تبدل نوعی کرنے والے چند افراد یا کوئی ایک
فرد کلیتاً غیر ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ کسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے نامزد
نہیں ہوتے تھے۔ وہ گمنام اوزار ہوتے تھے بخت و اتفاق کا اوزار
اور انفعالی کردار ہی ادا کر سکتے تھے۔

اس کے برعکس ساحر، فن کار، نقاش یا بت تراش جنکو خالق
فہم و ذکا کی یا استعداد کی نعمت میسر آئی تھی وہ اپنے ذاتی جوہروں
کی نشوونما کرتے تھے اور اسے آگے اپنے اخلاف کو منتقل کرتے تھے۔
اپنے شاگرد یا مرید وہ بہترین افراد ہیں سے منتخب کرتے تھے اس طرح
سے وہ قانون ارتقا کے عملوں (انتخاب اصلح) کا علم نہ رکھتے ہوئے
اس کی ہمسری کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام توسید انگتی۔ کھیل کود۔
جنگ و جدل اور افزائش نسل میں لگے رہتے تھے اور ان کے سیانے
لوگ لاشعوری طور پر عمل ارتقا کے سر بستہ تھے۔ اور انہیں بچوں
میں سے جو عوام اپنا فریضہ افزائش نسل پورا کر کے کثیر تعداد میں
معاشرے میں شامل کرتے تھے ساحر اور فنکار ایسے بچے منتخب کر لیتے
تھے جو ہونہار ہوں اور ان کے فنون کو آگے ترقی دے سکیں۔ اس سے
ہمارے اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ قانون ارتقا نوع انسانی

میں دماغی کمالات کی بدولت اور انسان کی خود اپنی سرگرم اور بالارادہ شرکت کے باعث جاری ہے۔ اب بھی یہ سلسلہ چل رہا ہے یا چلنا چاہیئے لیکن آج کل بعض اوقات تعجب کا موقع ہو سکتا ہے کہ آیا صرف قدر، قابلیت، اور صلاحیت ہی اب انتخاب کے عناصر لازمی ہیں۔

اخلاقی تصوّرات اگرچہ قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں جو ابتدا میں اغلباً اتنی کثیر تعداد میں نہ تھے مگر جب تک کہ کوئی صحیح معاشرہ نہ بنا اس وقت تک ان کی سماجی توثیق بہت خفیف رہی قرینِ قیاس یہ ہے کہ پہلے اخلاقی قاعدے جو قائم ہوئے ہوں گے وہ "قتل مت کرو" "چوری مت کرو" ہونگے۔ جوں ہی کہ سماجی جواز نے انفرادی یا خاندانی جذبۂ انتقام کو ختم کرکے یہ خدمت قبیلے کے سپرد کی اور جوں ہی کہ انتقام مبدل بہ سزا ہوا یا بہ الفاظ دیگر جب صحیح معاشرہ مرتب ہوگیا۔ اور قانون کا تصوّر وجود میں آگیا اخلاقی تصوّرات نے سرعت کے ساتھ نشو ونما پانا شروع کردی۔ اب سے چھ ہزار برس قبل وہ شائستگی کے ایسے مرحلے پر پہونچ چکے تھے جس پر آج بھی مشکل سے کوئی اضافہ ہوا ہوگا۔ بلاشک ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ رہائے دُنیا کے صرف ایک خطّے یعنی مصر کے لئے صحیح ہے۔ ممکن ہے یہی رائے چین کے لئے بھی درست ہو۔ اس دعوے کا مادی ثبوت جو

ہمارے پاس ہے وہ دنیا کی دو نہایت قدیم کتابوں میں سے ایک کتاب ہدایات تاہو ٹیپ (PTAH-HOTEP) ہے۔ یہ پانچ ہزار تین سو برس پہلے مصر کے پانچویں شاہی خاندان کے زمانے میں مصری شاہزادوں کی رہنمائی کے لئے لکھی گئی تھی۔ ہمارا منشا اس حیرت انگیز قلمی نسخے کے تجزیے کا نہیں ہے لیکن اس کے مصنف نے جن حکیمانہ اقوال کا اظہار کیا ہے ان کی بلند پائیگی کو ثابت کرنے کے لئے اس کے دو فقرے نقل کرتے ہیں۔ پہلا فقرہ کنبے کے سردار یعنی شوہر کو مخاطب کرتا ہے۔

"اگر تم صاحب بصیرت ہو تو تم کو اپنے کنبے کی خبرگیری کرنا ہوگی۔ اپنی بیوی کو عزیز رکھنا ہوگا، اس کو اچھی طرح سے کھانا پلانا ہوگا، اس کے لباس کا خیال رکھنا ہوگا، اور جب وہ علیل ہو تو اس کی خدمت کرنا ہوگی۔ زندگی بھر اس کے قلب کو مسرت سے لبریز رکھنا اور کبھی اس پر سختی نہ کرنا...... اپنے حتی المقدور اپنے خادموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ جس گھر کے نوکر ناخوش رہیں اس گھر سے امن اور مسرت اپنا ڈیرہ اٹھا لیتے ہیں۔"

دوسرے فقرے کا مخاطب شاہزادہ ہے۔

"اگر اپنے عہدے کی ذمہ داریاں قبول کرنے کی خواہش ہے تو محنت کرکے ان کی اہلیت کی تکمیل کرو۔ اگر کسی

مجلس مشاورت میں شرکت کرو تو یاد رکھو کہ فضول الفاظ سے خاموشی بہتر ہے . . . . "

پانچ ہزار برس سے زائد عرصہ گذرا کہ ایک دانا اُستاد نے یہ نصیحت دی۔ ساری دُنیا کو اس پر عمل کرنے کے لئے ابھی کتنے برس اور درکار ہوں گے۔؟

یہی دو اقتباسات اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ابھی تک ہم نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی، نیز یہ نصائح، اخلاقی تہذیب کی ایک ایسی تہذیب سے متعلق ہیں، جو ہماری تہذیبی حالت سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس لئے ہم کو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ پہلا اخلاقی ضابطہ اس سے بہت پہلے عالم وجود میں آچکا تھا۔ کئی صدیوں تک یہ بطور روایت کے چلتا رہا ہوگا لیکن یہی صورت تو احکام موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی ہے جن کی آج ساری دُنیا کے مہذب ممالک میں تعمیل کی جاتی ہے۔

خیر و شر کے تجریدی تصور کا کبھی بھی مطلق طور پر انضباط نہیں ہوا۔[1]

---

[1] (مصنف) یہ ذہن میں رہے کہ ہم لفظ "مطلق" ABSOLUTE کو لفظ "اضافی" RELATIVE کے تضاد کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ جتنی انسانی رائے اور معیاروں سے یہ اتنی ہی آزادی

تاہم انسانی تجربے کے جنم کے وقت سے ہی یہ موجود رہا ہے۔ ہمارے مفروضے کے مطابق یہ خیال ضرور نئی مکتسبہ آزادی کا ماحصل ہوگا۔ اگر کتابِ پیدائش کی ہماری تاویل درست ہے۔ تو یہ خیال کتابِ مقدس کے بھی خلاف نہیں۔ مذاہب نے خیر کے تصور کو ایک یا بہت سے دیوتاؤں اور شر کے تصور کو ایک یا بہت سی بدروحوں سے علامتی طور پر وابستہ کیا ہے۔ خیر اپنے جلو میں نیک مکافات اور ایک مسرتوں سے معمور مستقبل کی دنیا لاتی ہے اور شر بدترین سزاؤں کا موجب ہے۔ انعام اور سزا کے نتیجے کے وجود میں آنے سے جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے مقصد پورا ہو گیا۔

فلسفیوں نے ان دونوں تصورات میں موشگافیاں کیں اور

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) کا اظہار کرتا ہے جتنا کہ کسی علمی بیان کے یہ الفاظ لیکن اس سے زیادہ نہیں" عالم دین کے نزدیک (ABSOLUTE) صرف خدا ہی مطلق ہو سکتا ہے یا جو چیز اس سے مشتق ہو اس لیے اس عالم دین کی اختراعی (A PRIORI) "مطلق" کی تعریفات عالم سائنس کے استقرائی (APOSTERIORI) معیاروں سے "مطلق" نہیں ہیں۔ خیر و شر کی تعریف جو سینٹ ٹامس کی تصنیف SUMMA THEOLOGIAE I - II Q. 18 ARTS 5 AND 6 میں اخلاقی جاتی ہے مثلاً ان فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ دونوں مقولات میں کوئی تضاد نہیں۔ صرف ایک ہی لفظ دو مختلف تصورات کے مجموعوں کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

جہاں تک ان کی اپنی ذاتی تسکین کا تعلق تھا ان کو یہ "ثابت" کرنے میں کوئی مشکل نظر نہ آئی کہ ان تصورات کی قدر خالصتاً اضافی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جو چیز ایک ملک میں خیر ہے دوسرے ملک میں وہی شر ہے۔ خیر مطلق بے معنی چیز ہے۔ بہت ہی قلیل تعداد فلسفیوں کی مستثنیٰ کر کے کسی فلسفی نے بھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اغلباً ان تصورات نے بہت سی قدیم ہستیوں میں خود بخود بے ساختہ طور پر جنم لیا اور اس باعث کے پیش نظر ان کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ ان پر بطور اقدار مطلق غور کیا جائے۔ یقیناً یہ کام آسان نہیں لیکن خیر و شر کے اضافی تصور کو عوام میں نفوذ کرنے کی اجازت دینے میں اتنا بڑا خطرہ ہے کہ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے صرف مذہبی مصنفوں اور فلسفیوں نے اس معاملے پر غور کیا ہے اور بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس وہ سائنٹیفک اور عقلی دلائل نہیں جو لاادریوں کو قائل کرنے کے لئے کافی ہو سکیں۔

یقیناً خطرہ موجود ہے۔ انسانوں کی بہت بڑی تعداد جن میں بہت سے ذی فہم اور روشن خیال لوگ بھی شامل ہیں اپنے برتاؤ میں مسلمہ اخلاقی طریقوں کو کام میں لاتے ہیں کیونکہ جب تک وہ کسی معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اس کو ضروری خیال کرتے ہیں یا اس وجہ

سے کہ بچپن میں ان کی تربیت اچھی ہوئی ہے اور ملزوم اضطراری افعال
ان میں پیدا ہو گئے ہیں ذاتی طور پر ایسے لوگ بے ضرر ہیں باوجود
اس کے کہ وہ خیر و شر کی مطلق قدر پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن ان کو اس
حقیقت کا احساس نہیں کہ بنی نوع انسان کا ایک کثیر حصہ ایسا ہے
جن کو اپنے نفس پر اتنا قابو نہیں جتنا ان کو ہے اور نہ ہی ان کو اچھی
ابتدائی تربیت کی منفعت میسر آئی ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جنکو
جذباتی، روحانی، یا عقلی قیود کی ضرورت ہے۔ ایسے لڑکوں اور نوجوانوں
سے عدالتیں معمور نظر آتی ہیں جو جرموں میں ماخوذ ہوتے ہیں لیکن حقیقت
میں ان کو بے گناہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ ان کو مناسب اخلاقی تربیت ہی
نصیب نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک بہت پرانا معاشرتی مسئلہ ہے جس کا حل
کرنا اُس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہوگا جب ہمارے ذی فہم طبقے
کو یہ یقین ہو کہ خیر و شر اضافی قدریں ہیں۔ کیونکہ دنیا بھر کے اُستادوں
کا گروہ خواہ وہ خود اس کے قائل نہ ہوں فلسفیوں اور مصنفوں کے
خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ موخرالذکر گروہ میں سے بعض اپنے
آپ کو ان لوگوں سے برتر خیال کرتے ہیں جو آنکھیں میچ کر کلیسا کے
اخلاقی ضابطوں، زمانہ سلف کے عقلمند اصحاب کے اقوال، کی تعمیل کرتے
ہیں کیونکہ انہیں ان کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن کی قدر مطلق

کا ان کو یقین ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص کا ذاتی اثر اور ان کی تصنیفات کا اثر آفت انگیز ثابت ہو سکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی ہی ہوگا جسے اس کا احساس ہو۔ یہ لوگ بعض اوقات اپنے غور و فکر کی اساس بڑے بڑے فلسفیوں کی تصنیفات پر تعمیر کرتے ہیں جن کا مطالعہ انہوں نے سطحی کیا ہوتا ہے یا بڑے سائنس دانوں پر جن کی تصنیفات کا مطالعہ انہوں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ والٹیر (VOLTAIRE) اور ڈارون (DARWIN) کو ملحد گردانتے ہیں اور اس سے زیادہ صداقت سے دور کوئی اور چیز نہیں۔ اپنے اس قول کو ثابت کرنے کے لئے اجازت دیجئے کہ آپ کے سامنے والٹیر کی تصنیف فلوسافیکل ڈکشنری میں جو مقالہ "الحاد" پر اس نے لکھا ہے اس کے چند فقرے پیش کروں۔

"اس سب بحث سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ یہی کہ الحاد ایک نہایت ہی مہلک عفریت ہے۔۔۔۔"

بعض غیر فلسفی ریاضی دانوں نے علت العلل کے تصور کو مسترد کر دیا ہے لیکن حقیقی فلسفیوں نے اس کو تسلیم کیا ہے اور جیسا کہ ایک مشہور مصنف نے ایک مرتبہ لکھا کہ بچوں کو مذہبی سوالات کے جوابات تعلیم کرانے والا معلم تو خدا

کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اور نیوٹن عقلا کے سامنے اسکی ہستی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔"

"الحاد وہ بدخیالی ہے جس میں چند ذی فہم مبتلا ہوجاتے ہیں اور ضعیف الاعتقادی وہ بدخیالی ہے جسمیں احمق مبتلا ہوجاتے ہیں۔"

ہمارے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ سائنٹیفک، اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے والٹیر کی سند دقیانوسی ہے۔ لیکن امریکہ کے بعض زندہ چوٹی کے سائنس داں جن میں سے دو علم طبیعیات کے ماہر ہیں اور نوبل پرائز بھی جیت چکے ہیں مذہب کے پابند ہیں جیسے کہ فرانس کا سب سے بڑا فلسفی برگسان (BERGSON) بھی تھا۔

اِن علما کو' جو خوش نصیبی سے پیدا ہی عقل و فہم کے ساتھ ہوئے ہیں اور جن کو تعلیم اور صحیح رہنمائی میسر آئی ہے' اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ ان کے کندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بار ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے میں کامیاب نہیں کہ خدا ہے اور سب سے اعلےٰ انسانی قدریں اخلاقی اور روحانی ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ اس سوال پر غور کریں اور اپنے آپ سے ایمانداری کے ساتھ دریافت کریں کہ ان کے منفی ایقان کا مرتبہ علمی ہے یا جذباتی ؟

اس کا جواب جو کچھ بھی ملے وہ پھر اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ انسانیت کے قدیم اور مدتوں کے آزمودہ معیاروں یعنی مذاہب کو ہٹا کر انکی جگہ پر کیا چیز لا کر رکھینگے؟ ہم پُر امید ہیں کیونکہ اور کوئی چیز ان کو قائل کرنے کی ہمارے پاس ہے بھی نہیں کہ یہ نفس الامری حجت (PRAGMATICAL PLEA) اگر ان کے عقل کے دروازے اس پر بند ہی ہیں، تو ان کے قلوب میں گھر کر لے گی۔

یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریئے کی روشنی میں جسے ہم نے گزشتہ صفحات میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، ہم آزمائشی طور پر خیر و شر کے معیار منضبط کر لیں۔ یہ قدرتی امر ہے کہ یہ معیار بھی قانونِ ارتقا کی طرح تو مطلق نہیں جس پر ان کی بنیاد اٹھائی گئی ہے لیکن اس سے کچھ کم بھی نہیں اور اگر ہماری تاویل کو تسلیم کر لیا جائے تو بہ لحاظ بنی آدم یہ مطلق ہیں۔

خیر وہ شئے ہے جو صعودی ارتقار کی رفتار کی ممد ہو اور حیوانوں کے طریق سے ہٹا کر آزادی کی طرف رہنمائی کرے۔

شر وہ شئے ہے جو عمل ارتقا کی مخالفت کرے اور قانون ارتقا کی گرفت سے نکل کر اجدادی غلامی حیوانیت کی طرف تنزل کرنے کا باعث ہو۔

بہ الفاظِ دیگر، اور انسانی نقطہ نظر کی سخت گیری کے ساتھ، خیر انسانی شخصیت کا احترام ہے، شر اس شخصیت سے اعراض ہے۔

بلا ریب انسانی شخصیت کے احترام کی اساس اس عظمت کے اعتراف پر ہے جو انسان کو ارتقا کے عامل اور ربانی منشا کے شریک کار ہونے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس عظمت کی اساس ارتقا کی نئی وضعیت پر ہے جس نے ضمیر کے ساتھ ساتھ جنم لیا۔ وہ ضمیر جو ارتقا کا راستہ روحانی سمت کی طرف منحرف کرتی ہے یعنی آزادِ قوتِ ارادی کی جانب جو عظمت ذمہ داری کے احساس سے محروم ہو اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور جو ذمہ داری ابنِ آدم کو حاصل ہوئی ہے وہ معتدبہ ہے۔ اب اس کے ہاتھوں میں صرف اپنا مقدر ہی نہیں ارتقا کا مقدر بھی اسی کے ہاتھوں سے پورا ہونا ہے۔ کسی لمحہ بھی وہ ترقی اور تنزل کے راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتا ہے۔ کتاب پیدائش کے دوسرے باب کا مفہوم ہمارے نزدیک یہی ہے۔

ایک مرتبہ پھر ہم اس حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں کہ آج ہمارے سامنے کوئی ایک امر واقعہ، یا کوئی ایک مفروضہ ایسا نہیں جو تخلیق حیات یا طبعی ارتقا کی کوئی توجیہ کر سکے۔ جہاں تک کہ حیات کے مصدر کا تعلق ہے ہم مختصراً اس کتاب کے پہلے حصہ میں اس علمی مسئلے

کا مطالعہ کر چکے ہیں لہٰذا چار و ناچار ہم مجبور ہیں کہ یا تو ہم ماورائے ادراک مداخلت کے تصور کو تسلیم کریں جیسے سائنس داں قادر مطلق کہے تو وہ بھی اتنا ہی موزوں ہوگا جتنا کہ بخت و اتفاق کی ضد کہنا (ANTI-CHANCE) یا محض اس کا اعتراف کر لیں کہ ہم چند و چنیوں کے ماوراء ان مسائل کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ایسا کہنا ایک مسلمہ سائنٹیفک اظہار ہے عقیدے کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ ہم نہیں بلکہ اتفاقی مادہ پرست دہریہ ہے جو اس مستحکم عقیدے کا اعلان کرتا ہے، گو منفی عقیدہ ہی سہی، جب بغیر کسی ثبوت کے وہ متمردانہ یہ مانے چلا جاتا ہے کہ ابتدائے حیات، قانون ارتقاء، انسانی دماغ، اور اخلاقی تصورات کا جنم سب ایسے مسائل ہیں جن کی علمی توجیہ کسی نہ کسی دن ضرور ہو جائے گی۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر جاتا ہے کہ اس کے لئے موجودہ سائنس کی مکمل کایا پلٹ ضروری ہے اور یہ کہ نتیجۃً اس کے ایقان کی اساس محض جذباتی دلائل پر ہے۔

٭ علاوہ بریں خدا پر ایمان صرف چند باتوں پر مشتمل ہے۔ ایک نامور عیسائی مصنف 'MIGNEL DE UNAMUNO' نے ایک حسین جملے میں اس کو واضح کیا ہے:

"خدا پر ایمان لانا اس کی ہستی کی تمنا کرنے کا نام ہے

• اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس طرح عمل کرنا چاہیے موجود ہو"

بہت سے انسان جو ذی فہم ہیں اور صالح دیانت کے حامل ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ خدا پر اس لئے ایمان نہیں لا سکتے کہ اس کی ذات کا تصور وہ نہیں کر سکتے۔ ایک دیانت دار انسان کے لئے جسے سائنٹفک تجسس کا مادہ ملا ہے خدا کو دیکھ سکنا اتنا ہی غیر ضروری ہونا چاہیئے جتنا کہ ایک ماہر طبعیات کے لئے برقیہ کو آنکھوں سے دیکھنا غیر ضروری ہے۔ ان ہر دو صورتوں میں بعینہ تصویر حاصل کرنے کی سعی نامکمل اور غلط نتیجہ دے گی۔ مادی طور پر برقیہ ناقابل تصور ہے تاہم اس کے اثرات کی بدولت ایک سادہ لکڑی کے ٹکڑے کی بہ نسبت ہمیں اس کے متعلق زیادہ مکمل آگاہی ہے۔ اگر ہم حقیقت میں خدا کا تصور کر سکتے تو ہمارا یقین بھی اٹھ گیا ہوتا کیونکہ جو نقشہ بھی ہم بناتے چونکہ یہ انسانی ساختہ ہوتا ہم سے دلوں میں شبہات پیدا کرتا۔ بے شک یہ بات اسی شخص پر چسپاں ہوتی ہے جو اپنی ذہنی وصنعتیوں کے فقد اور ادراک کی حقیقت اور قدر کو تسلیم کرنے کی قابلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ان غیر عقلی تمناؤں کا بھی معترف ہو جو اس کی ابتدائی نشو ونما کی منزل پر خود بخود نوعِ انسانی میں ابھر آئیں۔ یہ غیر عقلی تمنائیں واقعی چیزیں ہیں۔

ابن آدم ان سے مسرّت حاصل کرتا ہے اور کسی نے بڑی عقلمندی کی بات کہی ہے کہ جو شے ہماری مسرّت کا باعث ہو وہ غیر حقیقی نہیں ہوسکتی۔ یہی ہماری اعظم قدروں، ہمارے اخلاقی تصورات، ہماری جمالیاتی حس، اور مطامع نظر کا سرچشمہ ہیں۔ لہٰذا ان کی علتِ فاعلی بھی حقیقی ہے گو وہ ناقابلِ تصوّر ہی کیوں نہ ہو۔

خدا کا جو تصوّر ہم باندھتے ہیں وہ خدا کے وجود پر گواہ نہیں ہوتا بلکہ وہ سعی جو ہم اس تصویر کی تخلیق میں صرف کرتے ہیں خدا کی ہستی کا ثبوت ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اخلاقی خوبی یا نیکی خالص نفسی سعی پر مشتمل ہے نہ کہ اپنے نتائج پر۔ روحانی سعی اپنی علّت سے الگ اپنی حیثیت رکھتی ہے اور یہ سعی ہی ہے جو ہمارے مدارج بلند کرتی ہے۔ وہ عناصر جن کی بدولت ہماری ضمیر ہمیں ارتقاء کو آگے بڑھاتے ہیں، ربانی منصوبے میں شریک کار بنانے میں ممد ہوسکتی ہے ہم اپنے نفس ہی میں تلاش کرسکتے ہیں۔

اس خیال کو مستثنیٰ کرکے جو اخیر میں ہم نے شامل کیا ہے، دیکھا جاسکتا ہے کہ ہم عقلی دلائل سے انہیں محمولات پر پہنچے ہیں جو مسیحی اخلاق کے محمولات ہیں۔

گذشتہ چھ ہزار سال میں عقلی اقلیم میں تو کوئی جاذبِ توجہ پتہ اس کا نہیں چلتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحانی اقلیم میں ارتقا کے اگلے قدم انفرادی انسانی شرکت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اسی باعث آزاد اختیار ممکن ہوا ہے اور یہی آزادی کا موجب ہے۔ گناہ آدم کے قصے کی تاویل انسانی ضمیر کے طلوع کی علامت سمجھ کر ہی ہو سکتی ہے جو ابتدائی دور کے انسان میں نمایاں ہوئی۔ جنت جو انسان کھو چکا ہے اور جس کو بے انتہا صعوبتیں اٹھا کر دوبارہ مفتوح کرنا ضروری ہے ایک ایسا تصور رہے جو سرگرمی پیدا کرنے والی قوتوں کے امکانات سے معمور ہے۔ ہمارا پورا انسانی ڈراما جو ہزاروں صدیاں چلتا رہے گا چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کوئی فلسفی اختصار نویسی کی یہ دولت نہیں پا سکا جب ہم اس اشاریت کی تفصیل کرنے کی سعی کرتے ہیں تو اس کے مفہوم کو صرف مبہم ہی کرتے ہیں۔

جہاں تک کہ اس ذہانت کا تعلق ہے جسے ابلیس (LUCIFER) کی اشاریت میں ظاہر کیا گیا ہے اور جو فہیم و عقیل گروہ کا سردار ہے، تو وہ ہمیشہ اخلاقی اور روحانی ترقی کے مخالف رہے گی اور یہی خوشی کی جستجو کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہے گی عقلیت پسند، جسے گزشتہ چالیس برس میں عقل کی قوت کا ملہ میں شبہ کرنے کے وجوہ

پیدا ہو گئے تھے ان طبعی نظریوں کی شکست کو بغیر کپکپائے قبول کر لیتا
ہے جو اس کے عنفوان شباب میں نہایت مستحکم تھے۔ وہ اس ناقابل
تصور فضائے بسیط (مکان) کو تسلیم کر لیتا ہے جس میں برقیے حرکت
کرتے ہیں (ہر موجود برقیے کے لیے تین ابعاد، دس برقیوں کے لیے تیس ابعاد)
وہ یہ قبول کرتا ہے کہ برقیہ "احتمال کی ایک موج" ہے۔ وہ ایسے ذرات
کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے جیسے ("NEUTRINO" معتدلے) اور
("ANTI-NEUTRINO" ضد معتدلے) جن کی ایجاد محض ریاضیاتی
تناسب پیدا کرنے کے باعث کی گئی تھی۔ وہ ان متناقض وجودوں
کی ہستی اور واقعیت کو تو بغیر کسی مزاحمت کے تسلیم کرتا ہے جن کی
مرئی شکل اس کے لئے تجربہ ممنوع ہے۔ باوجود اس کے وہ متمردانہ ایک
فوق الفطرت تخلیقی طاقت کے وجود کے امکان سے انکار کرتا ہے
جس کو تسلیم کئے بغیر سب سے بڑے سائنٹفک مسائل ناقابل فہم
بن جاتے ہیں اور یہ انکار محض اس لیئے کہ اس کا حسی تجربہ جو مثالیں
مہیا کرتا ہے ان کی مدد سے وہ اس ہستی کا نہ تصور کر سکتا ہے اور نہ
جس کی مرئی شکل کا وہ معائنہ کر سکتا ہے حالانکہ وہ محسوسات کی
کوتاہیوں سے خوب واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے مگر اس حقیقت
کو کبھی زیر بحث بھی نہیں لاتا کہ کائنات کی جو شبیہ اس نے تعبیر کی

ہے اس کی اساس ان انفعالات پر ہے جن کو اس کے محیط ارتعاش کی کسر قلیل (اربوں میں سے ایک یا ۰۰۰٫۰۰۰٫۰۰۰٫۰۰۱ فی صد) اس کے اندر متعین کرتی ہے اور جو ارتعاشات اس کے جسم میں سے گذر جاتے ہیں اور اس کے شعور پر کوئی نقش پا بھی نہیں چھوڑ جاتے۔ اس شخص سے زیادہ کوئی شے بھی نامعقول نہیں ہو سکتی جو عقلیت پسندی کی بدولت نامعقول بنا ہو۔

باوجود اس امر کے کہ روایات انسانی ارتقار میں شامل ہو چکی ہیں اور یہ ذہنی اعمال کی رفتار کو تیز کرتی ہیں تاہم ابھی بہت سی صدیاں حقیقی ترقی کو قابلِ احساس بنانے کے لئے درکار ہیں۔ اگرچہ چند ہزار برس میں ہی روایات نے حیرت انگیز نتائج پیدا کر دیئے ہیں۔ اب تک انسان کا سب سے بڑا مشغلہ اپنے عالم کائنات کی تسخیر رہا ہے مستقبل میں اسے اپنے آپ کو مسخر کرنا ہوگا۔ اس کی تکمیل کے لئے اسے نہ صرف اپنی پست جبلتوں[۵۱] پر قابو حاصل کرنا ہوگا بلکہ ان عادات کو بھی مسخر کرنا ہوگا جو میکانیکل قنون کی مربع

---

[۵۱] "میری روح ہمیشہ ابن آدم کے کوششوں میں ممد نہیں رہے گی کیونکہ وہ بھی گوشت پوست ہی ہے"۔ کتاب پیدائش ۶، ۳) (مصنف)

ترقی نے اس میں پیدا کر دی ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ عادات "عملی" ہیں یا یہ کہ وہ محنت مشقت کو کم کر دیتی ہیں اور اس طرح سعیِ انسانی کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتی ہیں بلکہ وہ اکثر خوش آئند بھی ہیں۔ انسان بغیر محسوس کئے ان عادات کا غلام بن جاتا ہے اور آخر اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ ان عادات ہی کو غائت نظر سمجھنے لگتا ہے۔ آغازِ تمدن و تہذیب سے ابن آدم کی اکثریت نے جو مصائب جھیلے ہیں اور کڑیاں سہی ہیں ان کو اگر ہم سامنے رکھیں تو اس کا عادات ہی کو مقصود بالذات سمجھنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس لئے بنی نوعِ انسان کے کثیر حصے کو ان مصنوعی احوال کے ساتھ توازن حاصل کرنے میں اغلباً طویل عرصہ درکار ہوگا جو ماہرانِ خصوصی کے (موجدوں۔ علمِ کیمیا کے ماہروں، علمائے طبیعیات، انجنیروں) چھوٹے سے طبقے نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر یہ توازن بالآخر قائم ہوگیا، جو یقینی نہیں، تو عالمِ انسانیت کو یہ سمجھنے میں لمبا عرصہ لگے گا کہ اس کا فریضہ دوسرا ہے جو اسے اعلےٰ اور بے کراں مسرتوں سے سرفراز کرے گا لیکن ان مسرتوں کا ماخذ داخلی ہوگا، خارجی نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ دماغ اور روایات ہی کی عنایت سے انسانی ارتقاء کا سلسلہ آگے چلتا ہے لیکن دماغ کے وظائف لاتعداد ہیں اور وہ

ان سمتوں کے علاوہ جو اصلی ارتقاء کی طرف رہنمائی کرتی ہیں دوسری سمتوں کی طرف بھی نمودار ہوسکتے ہیں۔ خالص ذہانت، اگر اخلاقی پس منظر سے محروم ہو جائے، تو اس کا انجام تخریبی تنقید، یا لا طائل مباحث ہوتے ہیں ایسی ادق اور الجھی ہوئی طفلانہ باتیں جن کی مثال قرون وسطےٰ کی متکلمانہ اندھی تقلید میں ملتی ہیں۔ اگر ذہانت اپنے آپکو ہی مقصود بالذات سمجھنے لگے تو وہ اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے۔ جمالیاتی حس بھی انسانیت سوز بدہیئتیوں، بے ہودگیوں، اور نفرت انگیز پستیوں کی طرف لے جا سکتی ہے۔ انسان کی سرگرمیاں کچھ بھی ہوں اسے اپنے برتر مقدر کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ اور اس حقیقت کی شناخت سے جو جائز افتخار حاصل ہوتا ہے وہ اس لائق ہونا چاہیئے کہ عمر بھر اس کی اپنے آپ سے اور دوسروں سے محافظت کرے۔ اس کی ساری کوشش اپنے آپ کو ارفع اور اعلےٰ بنانے میں صرف ہونا چاہیئے۔ اب سے انسانی آویزش صرف ان جبلتوں ہی کے خلاف جہاد کرنے پر مشتمل نہیں جو ابن آدم کو درندے سے ورثے میں ملی ہیں بلکہ ان عادتوں کے خلاف بھی جنگ کرنا اس میں شامل ہے جو خود روایات ہی کا پیدا کردہ نتیجہ ہیں اور اس کے اپنے ہی نفس کے عارضے ہیں۔

یہ الفاظ دیگر انسانی آویزش میں کمی ہونا تو درکنار وہ انسانی

ذہانت اور اس کے اختراعات کی ترقی ہی کی بدولت اور اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ ابن آدم کی ایجادات نے زندگی کے احوال کو تہ و بالا کر دیا ہے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو ابھی ان سے مستفید نہیں ہو رہے وہ تہذیب و تمدّن کی جھوٹی علامت اور ان کی تمناؤں کا مطمح نظر بن گئی ہیں۔ یہ ہیں زمانہ حاضرہ کے کافرانہ معبود باطل۔ اب تک تو ان سے صرف بے حد مذہب پرست لوگ، مذہبی دیوانے ہی جیسے مسلمان اور ہندو ہیں اس نجاست کی چھوت سے بچے ہوئے ہیں۔

ارتقا کے مختصر مطالعے کے دوران میں ہم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ خارجی موثرات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ زندہ اجسام نامی نئے موثرات سے مطابقت پیدا کریں اور اکثر اوقات یہ مطالبہ پورا بھی ہو جاتا تھا۔ نفسیاتی سطح پر بھی بعینہ ویسے ہی مطالبات موجود ہیں۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ حیوان کی طرف سے ایسی مطابقت کا پیدا کر لینا ارتقائی نقطۂ نظر سے ہمیشہ ترقی پر مشتمل نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی یہی حقیقت ہمارے مشاہدے میں آرہی ہے۔

انسان کو یہ سمجھ آنا ہوگی کہ جو میکانیکی تغیرات اس نے اپنے ماحول میں داخل کر دیئے ہیں وہ اور ان کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کا نتیجہ یا تو ترقی ہوگی یا تباہی اور اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ آیا اسکی

اپنی اخلاقی حالت بھی لازم وملزوم طریقے سے اُنکا ساتھ دے رہی ہو یا نہیں

لہذا انسان کا یہ فرض ہے کہ تمدن کے اس جھوٹی علامت کو معاشرے میں سے نکال باہر کرے اور اس کی جگہ پر سچی علامت یعنی انسانی عظمت کی نشو ونما کو لاکر بٹھائے۔ اس کے لئے طریقہ کار یہ نہیں کہ میکانیکی طریقے کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں جو درحقیقت ناممکن بھی ہوگا اور مصیبت خیز بھی کیونکہ خالص سائنس اور علم طب کے میدان میں ابھی ترقی کرنا ضروری ہے، بلکہ اس کے لئے بنی نوع انسان کی تربیت کی جائے اور اس کے اخلاقی معیار کو بلند کیا جائے۔ اگر عقلی تعلیم کے ساتھ سکولوں میں قدیم عیسائی اصولوں کے مطابق صاف صاف مذہبی تعلیم کو بھی شامل کر لیا جائے تو اغلباً حیرت انگیز نتائج مشاہدے میں آئینگے لیکن ابھی تک اس طریقہ تعلیم کی آزمائش صرف چند ایسی درسگاہوں میں کی گئی ہے جو اعلےٰ تعلیم کے لئے وقف ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی ذہانت گزشتہ دس ہزار برس میں اپنی گہرائی میں تیزی کے ساتھ بڑھی ہو۔ ابتدائے کار میں جب انسان کے پاس نہ علم تھا نہ تجربہ تو تیر او کمان کی ایجاد میں بھی اتنی ہی ذہانت درکار تھی جتنی قبل کی ایجادوں کی مدد سے مشین گن کی ایجاد میں درکار تھی۔ کالیمونشش ، لاوٹزی

گوتم بدھ، اور ڈیماقطریس، فیثا غورس، ارشمیدس، افلاطون اتنے ہی ذہین تھے جتنے بیکن، ڈے کارٹے، ہیگل، نیوٹن، کیپلر، برگساں اور آئن شٹائن تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ذہانت بڑھے کیوں؟ یہ پہلے وقتوں میں بھی حیرت انگیز تھی اور آج بھی اتنی ہی ہکّا بکّا کرنے والی ہے۔ ابھی اس کے ترکش میں بہت سے تیر ہیں۔ اگر پرندوں کے کھمبوں اور آنکھ کو اور تکمیل کی کوئی وجہ نہیں تو ذہانت کو بھی آگے ترقی کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہ محض ایک ذاتی رائے ہے۔ تحریری اور زبانی روایات نے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہوئی آرہی ہیں واقعات کا جو ڈھیر لگا دیا ہے اس کی عنایت سے ذہانت ابھی اور انوکھے کمالات انجام دے گی اور تمدنوں کی جان خطرے میں ڈالے گی ..... یہ تمغے کا وہ دوسرا رُخ ہے جو ابن آدم کے اخلاقی خوبیوں کی مداخلت کا مطالبہ کرے گا۔ آسمانی صحیفوں کی اشارتی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا اور ابلیس کے درمیان کشمکش ابھی جاری ہے

یہ استثنا چند جزئیات اخلاقی ضابطہ قرنہا قرن میں بہت کم بدلا ہے۔ اس میں اور اصلاح نہیں ہوسکتی۔ یہ یا تو رہے گا یا نہیں رہے گا۔ یہ بہت ہی تھوڑے ایسے قواعد ہیں مرتکز کیا جاسکتا ہے جو یوں کہنا چاہیئے کہ معجزانہ طور پر چار دانگ عالم میں مختلف زمانوں میں نمودار

ہوگئے اور اس امر کی بدولت اس کو ایک ایسی عالمگیر حیثیت حاصل ہوگئی ہے جو تجربے اور انسانی ذہانت سے اورا ہے۔ یہ ضابطے غیر تغیر پذیر ہونا چاہئیں اور ان کی ترقی نشر و اشاعت پر ہی مشتمل ہو سکتی ہے کسی کو اس میں شک نہیں کہ ان کا نفوذ بتدریج ہو رہا ہے اور صفحۂ زمین پر وہ دن بدن پھیل رہے ہیں۔ ان کی ترقی آہستہ آہستہ ہی ہوگی کیونکہ انسان کی کثرت کے نزدیک انسان اور حیوان کی کشاکش میں یہ ان کی فتح کی علامت ہے۔ ابھی اسے بہت کچھ آگے بڑھنا ہے۔ صدیوں سے مذاہب کا مقصد اعلیٰ یہی رہا ہے کہ ترقی حاصل ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس سعی میں اگر کامیاب نہیں رہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ باوجود ان مذاہب کے بانیوں کے اعلیٰ نصب العینوں کے یہ بعض اوقات ایسے پیروؤں کے ہاتھ میں آگئے ہیں جن سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور جن کا بہت سا وقت باہمی جنگ و جدل میں صرف ہوگیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس روحانی تعلیم نے جس کے حامل یسوع مسیح تھے کوئی ترقی اپنی گہرائی میں یا اپنی سطح پر نہیں کی یہی توقع بھی کرنا چاہیئے تھی کیونکہ یہ تعلیم انہیں انسانی جماعتوں میں نشو و نما پا سکتی تھی جو پہلے سے ہی اخلاقی تکمیل کے ایک اعلیٰ درجے پر پہونچ چکی ہوں۔ ایسی منزل پر ابھی ہم نہیں پہونچے۔ صریحاً ابھی ہم اس سے

بہت دور ہیں۔ تاہم انسانیت کے اعلیٰ مطمح نظر کی یہ تعلیم نمائندہ ہے۔

معلوم ہوا کہ انسانی ارتقا کا اب بھی انحصار ذہانت ہی کے حاصلات پر ہے۔ لیکن اب اس میں ترقی کی اور ضرورت نہیں جو بہت پہلے سے بعض افراد میں اعلیٰ درجے پر پہونچ چکی تھی مگر اس کے بعد اس میں اور کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اب اس کا انحصار سب سے زیادہ اخلاقی ترقی پر ہے یعنی کثیر جماعت انسانی میں اخلاق کی توسیع پر کیونکہ اساسی اخلاقی تصوّرات مطلق ہیں اور آگے ان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اب انسان کے لیئے یہی زیبا ہے کہ ان تصورات کی اشاعت کرے اور لوگوں کے قلوب میں ان کو نقش کا حجر کردے یہاں تک کہ ان میں بھی وہی قوت پیدا ہوجائے جو جبلتوں میں ہے ہاں یہ خیال رہے کہ یہ غیر شعوری مشین نہ بن جائیں۔ سوال اب مستقبل میں اخلاقی نسلوں کی تشکیل کا ہے۔

اگر نوع انسانی نے یہ کوشش کرلی تو یہ ایک اعلیٰ ضمیر کو بروئے کار لانے میں ممد ہوگی اور یہ پیش خیمہ ہوگا اس خالص اور روحانی نسل کا جس کا ظہور ایک نہ ایک دن مقدر ہے۔

جو فریضہ کہ ذہانت کو عمل ارتقا میں ادا کرنا ہے اس کا مختصر خاکہ ہم نے پیش کیا ہے اب ہم کوشش کرکے تمدن و تہذیب کی تعریف

کرنا ہے جس سے یہ واضح ہوگا کہ کیوں اسے ارتقا کا عنصر تصوّر کیا جائے
اور یہ کس طرح مقدّرِ انسانی پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔

(۱۰)

تہذیب وتمدن

ہم واضح کر آئے ہیں کہ ابتدا میں روایات نے عمل ارتقا کے ایک جدید عنصر کی حیثیت سے بعض مخصوص انسانی خاصوں، جیسے تخلیقی مطلق ذہانت اور اخلاقیات کو بہت سریع ترقی دی۔ ان خواص کی مزید توسیع کی سہولت کے لئے یہ لابدی تھا کہ جس ہستی کو پہلے حیوانات پر عظیم عضویاتی فوقیت حاصل ہو گئی ہے وہ اس طرف اب توجہ مبذول کرے۔ دماغ کی ساخت میں ابھی ایسی تکمیل ہونا تھی جس کی بدولت مستقبل میں نفسیاتی سطح پر ترقی کا امکان پیدا ہو جائے۔

دورانِ ارتقا میں ہر طرح کے تجربات کیے گئے۔ ان میں سے بعض تجربات ناکام ہو گئے یا تو اس وجہ سے کہ وہ انواع ہی کلیتًا نیست ونابود ہو گئیں یا ان کا ارتقا ایک خاص منزل پر پہونچکر ماحول سے مطابقت کلی حاصل ہو جانے کی وجہ سے رُک گیا اور صدیوں میں

غیر اہم تغیرات ہی ان میں ہوئے۔ اسی طرح مختلف انسانی قوموں میں دماغی نشوونما بھی ایک سی سرعت کے ساتھ نہیں ہوئی۔ بعض انسانی جماعتیں بالخصوص براعظم اسٹریلیا کے جزائر کے رہنے والے فیوجی، بشیمن، اور پستہ قد جنگلی اسی جمودی حالت میں رہ گئے ہیں، اور PALEOLITHIC دور میں جو ان کی کیفیت تھی اس سے شاید ہی کچھ بہتر ہوئی ہو۔ خود ہمارے زمانے میں ایسے لوگ ہیں جنکے طور طریقے وہی ہیں جو حال کے پیلیولتھک دور کے انسانوں کے ہیں۔ صاف گوئی تو یہ ہے کہ سفید اور زرد رنگ والی قومیں تو شروع ہی میں اپنے تہذیب وتمدّن کی عنایت سے آگے نکل گئیں۔ مگر ان دو اقوام میں بھی ذہانت اور اس کے عملی ماحصل نے بھی ہمیشہ اخلاقی ترقی کو ساتھ لے کر ترقی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ یہ امر مابہ النزاع نہیں چونکہ آخری مرحلہ یعنی روحانی نشوونما کا انحصار کسی قوم کی اخلاقی اساس پر ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسانی تمدنوں اور تہذیبوں نے ہمیشہ صحیح سمت میں ارتقار کی رہنمائی کی ہے۔ اس سوال کے جواب کیلئے تمدّن وتہذیب کی جدید تعریف اور حد بندی کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو تعریف ہم کریں گے وہ کچھ ان سے زیادہ اچھی ہوگی کہ جو حد بندیاں ان الفاظ کی اب تک ہو چکی ہیں۔

یہ ان سے مختلف اس لئے ہے کہ اسے اس فریضے کے مطابق ہونا چاہئے جو اس کتاب کا محور ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ یہ تعریف زیادہ وسیع ہو کیونکہ اس کی اساس محض داخلی یا خارجی انسانی معیار پر نہیں بلکہ اس کی بنیاد اس شے پر ہے جسے کائیناتی تصور کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ لفظ "کائیناتی" کے معنی تذکرۃ الارض تک ہی محدود رکھے جائیں۔

ہم نے جو خیالات ان "مخصوص" ارتقاؤں کے متعلق ظاہر کیے جن کا راستہ اتفاق کی مداخلت سے اصلی ارتقا سے کٹ جاتا ہے اور ان کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے کہ ان راستوں پر چل نکلنے والی انواع معدوم ہو جائیں یا خاص شکلوں پہ قائم ہو جائیں یا تنزل پذیر ہو جائیں، وہی خیالات تمدنوں اور تہذیبوں پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔ ماضی کے کسی نہایت دور کے دور میں تمام زندہ ہستیوں کا آغاز ایک ہی اجسام نامی سے ہوا تھا۔ انواع کے باہمی اختلافات جلد ہی رونما ہونا شروع ہو گئے اور صدیوں کے دوران میں بجائے اس کے کہ یہ اختلافات گھٹ جاتے، بتدریج زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ بعض ادوار ارضی میں بر اعظم اور سمندر جانداروں سے بھر پور تھے لیکن ان کا تعلق ان کثیر التعداد شاخوں سے تھا جو عمل ارتقا نے رد کر دی تھیں۔ ارتقا کی وہ اصلی شاخ جو انسان پر منتہی ہونے والی تھی وہ بظاہر ان "مخصوص" ارتقاؤں کے حاصلات

دیکھیں طرح ۶

کے بوجھ کے نیچے پامال تھی۔ ایسے زمانے بھی آئے کہ یہ شاخ ان کی کثرت میں تقریباً ایسی گم ہو گئی کہ ایک سطحی مشاہد شاید یہ دعویٰ بھی نہ کر سکتا کہ وہ ابھی زندہ اور موجود ہے۔

باوجود اس امر کے کہ ان کثیر زامگر ارتقاء کی مردود انواع نے کرۂ ارض پر ہلہ بول دیا وہ سلسلہ انواع جس کو ارتقا نے منتخب کر لیا اپنی انتھک کوششوں میں لگا رہا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض کرۂ ارضی کے ادوار میں اس نوع کے چند ہی افراد نمائندے رہ گئے ہوں ان کی زندگی بھی لاتعداد خطروں کی وجہ سے مخدوش حالت میں رہی ہوگی۔ باوجود پُرخطر طرزِ زندگی کے ان کی ترقی جاری رہی اور ہر نسل نے آیندہ نسل کو وہ منفعتیں منتقل کر دیں جن کے تحفظ کے لئے دکھ درد ان کو سہنے پڑے۔ انہیں فضیلتوں سے آج کا طبعی انسان متصف ہے اور یہی اس کی برتری کی ضامن ہیں۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانیت کے اس ارتقائی عنصر کو، جس نے کہ اخلاقی ترقی کا برتر درجہ حاصل کر لیا ہے، ویسے ہی بڑے خطرات کا مستقبل میں بھی سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن اب کے یہ خطرات انسانیت کے اس اژدہام کی طرف سے پیش آئیں گے جو ارتقا کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ امر ناقابلِ تصور نہیں کہ روحانی ترقی کے ہراول کو کسی نہ کسی دن،

شاید اس سے بھی زیادہ جلد جتنا ہمارا خیال ہے، مجبوراً صحرا میں پناہ لینا پڑے گی۔

جیسے آزمائشی انواع پھلے پھولے اور کتمِ عدم میں چلے گئے ایسے ہی تمدنوں نے بھی جنم لیا اور موت کے گھاٹ اتر گئے تاہم مرکز بھی وہ کبھی کلیتاً معدوم نہیں ہوئے ان میں سے بعضوں کی یاد ان کے فنی اور جمالی خزانوں کی وجہ سے اب بھی باقی ہے گو زمان ان کو ہمیشہ احترام سے محفوظ نہیں رکھے گا۔ لیکن ان کا سب سے قیمتی عطیہ غیر مادی ہے اور اس لئے ہم کو امید ہے کہ وہ غیر فانی ورثہ ہے۔ اور وہ ہمارے جمالی، تجریدی، اخلاقی، اور روحانی تصورات ہیں۔

اس طرح سریع الزوال تمدنوں کے ذریعے، اور بعض اوقات ان کے علی الرغم، دائمی تمدن نے اپنا صعودی اقدام جاری رکھا۔ بتدریج اس میں اضافہ بھی ہوتا رہا اور وہ نکھرتا بھی رہا۔ یہ ابھی اور اپنا عمل دور کرے گا۔ لیکن اس کے لئے اسے چند اُن ترقی کی مادی شکلوں کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا جو بظاہر اس کو شکست و نابود کرنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔ تمدنوں میں ایسے اُتار چڑھاؤ باقاعدہ ہیں اور فطری ہیں۔ یہ شریفانہ، اعلیٰ مرتبت، اور معصوم تصورات کے لئے لازمی ہیں جو جدوجہد ہی کے بعد رونما ہو سکتے ہیں۔ کشمکش نہ ہو تو

ارتقاء کا سلسلہ رک جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توازن پیدا ہو گیا
انسان کو اپنی تکمیل کے لئے کوئی دعوت باقی نہ رہے گی۔ ارتقاء کی
موجودہ منزل پر تنازع للبقاء کی جگہ اخلاقیات اور روحانیات نے
لے لی ہے۔ صوریاتی اور عضویاتی ارتقاء کو مرئی شکل میں دیکھنے کے
لئے ہمیں جبرًا لاکھوں صدیوں میں سے گزرنا پڑا۔ ایسے ہی اگر ہم
روح کے ارتقاء کو مرئی صورت میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں بلندی پر
سے اور قریبًا قرن کا تصور کر کے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالنا
پڑے گی کیونکہ یہ ارتقاء ہی اس کی طوالت کا موجب ہے۔ افسوس یہ
ہے کہ عمومًا ہم ان واقعات ہی کے زیر اثر رہتے ہیں جن میں ہم حصہ
لیتے ہیں۔ ان کا قرب، یہ واقعہ کہ ہم خود اس ڈرامے کے ناٹک ہیں،
ہمارے تناظر (PEREPECTIVE) کو بگاڑ دیتا ہے، مظاہر کی حقیقت
مجموعی قابو میں لانے میں حائل ہوتا ہے اور ہر واقعے کو اس کی خدائی
قدرت سے منسوب کرنے سے روکتا ہے۔ کوئی حتمی فیصلہ دینے کے ہم اتنے
ہی نااہل ہو جاتے ہیں جتنا کہ وہ شخص جو کسی چیونٹی کے لگائے ہوئے
مٹی کے ڈھیر کے پیچھے زمین پر چت لیٹے ہوئے کسی بڑی منظر کی داد
دینے کے نا اہل ہوتا ہے۔

صریحًا لفظ "تہذیب" کے دو معنی ہیں۔ ایک سکونی اور ایک

حرکی معنی سکونی نقطۂ نظر سے تو اس کے معنی ایسی حالت کے ہیں جو کسی
معلوم وقت پر تہذیب کی ہے۔ مثلاً یونانی تمدن و تہذیب پیری
کلیز کے عہد میں۔ حرکی نقطۂ نظر سے یہ ان عناصر کی نشو و نما اور تاریخ
کے مترادف ہے جن کی بدولت یہ تہذیب رونما ہوئی ہے اور
جو اس کے ارتقا کو آگے بھی چلائیں گے۔

سکونی تہذیب کا نظریہ من مانا ہے۔ اس کی تمثیل میں ہم
ان بے حس پتلی نسیج کی قاشوں کو پیش کر سکتے ہیں جن کو خوردبین
کے نیچے رکھ کر ایک ماہر حیاتیات معائنہ کرتا ہے۔ خلیئیں مردہ ہوتی
ہیں اور ان لاشوں کا تقریبی تصور بنانے کے لئے ہمیں درجنوں ایسی
تراشوں کا معائنہ کرنا پڑتا ہے۔ حرکی تہذیب کا تخیل، اس کے برعکس
سینما کی حرکت کرتی ہوئی تصویروں کی طرح زندہ خلیوں، نسیجوں
یا اعضا کے مطالعے کے مطابق ہے۔ لہذا دو تعریفیں سامنے رکھنا
ضروری ہیں۔

اول سکونی تعریف۔ تہذیب نام ہے ان تمام تبدیلیوں
کی تفصیلی فہرست کا جو صرف دماغ کی بدولت معاشرے میں انسان
کی عام زندگی کے اندر اخلاقی، جمالیاتی، اور مادی احوال میں پیدا
ہوتی ہیں۔ [illegible]

[illegible]

دوم حرکی تعریف۔ تہذیب نام ہے اس ماحصل کا جو پورے کرۂ ارض کو اس کشمکش کی بدولت حاصل ہو رہا ہے جو ابنِ آدم کی پہلی ارتقا کی پیدا کردہ قائم یادوں اور اس کے اخلاقی اور روحانی تصوّرات کے درمیان جاری ہے تاکہ پرانی یادیں فراموش ہو جائیں۔

بالفاظ دیگر یہ نتیجہ ہے یا ہونا چاہیے اس جدوجہد کا جو ہمارے حیوانی ورثے اور ہماری جدید اُمنگوں میں جاری ہے اور حق یہ ہے کہ یہی جدید تمنائیں ہیں جو ہماری انسانی شخصیت کے حقیقی معمار ہیں۔

ممکن ہے کہ ناظر کتاب کو اس تعریف پر یہ اعتراض ہو کہ جس مادی ترقی کا سکونی تعریف میں ذکر کیا گیا تھا وہ اس میں نظرانداز کر دی گئی ہے۔ لیکن دونوں تعریفوں میں فرق بھی تو بے انتہا ہے۔ سکونی تعریف کے ذمے تو صرف یہ کام تھا کہ کسی خاص لمحے میں جو احوال ہوں ان کو تفصیل سے بیان کرے اس کو تو ایک عکسی تصویر سمجھو جسے جزئیات پر حاوی اور حتی الامکان مکمل ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس حرکی تعریف کا کام یہ ہے کہ ان حقیقی ماخذوں کے ان غائر محرکات کی تلاش کرے جو انسانیت کو موجودہ مرحلے پر لے آئے ہیں، اسے آگے بڑھا رہے ہیں اور ایک ایسے بعید مستقبل تک اس کی

رہنمائی کریں گے۔ دوسری تعریف ان میکانیکی ترقیوں کو قابلِ لحاظ نہیں سمجھتی جو کسی ایک دور کی امتیازی علامتیں ہیں اور دوسرے دور کے متروکات۔ ہاں پہلی تعریف میں یہ چیزیں مہاسشا میں سے ہیں۔ آج کی تہذیب میں موجودہ غسلخانے ریڈیو اور ہوائی جہاز کا ایک مقام ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصری ثقافت یا اُنیسویں صدی کی ثقافت کی نشو و نما میں بھی ان اشیاء کا کوئی حصّہ تھا۔ یہ بھی نہیں کہ ان چیزوں نے انسانی کوششوں کی کوئی سمت متعین کی ہو یا ان میں کوئی تازہ روح پھونکی ہو۔ یہ تو ماحصل ہیں صدری محرکات نہیں۔ یہ ذہنی سرگرمیوں کے نتائج ہیں ترقی کے علل نہیں۔

حقیقی انسانی ترقی جس کا رشتہ ارتقا سے جوڑا جا سکے اور جو ارتقاء کے سلسلے کی توسیع کر سکے، ان چیزوں پر مشتمل ہے جو خود انسان کی اصلاح اور تکمیل کرنے میں مدد ہوں اور انسان جو آلات استعمال کرتا ہے ان کو بہتر کر لینے یا جسمانی آسائشوں میں اضافوں کا نام انسانی ترقی نہیں۔ موخرالذکر اندازِ فکر تو مادہ پرستوں کا ہے اور انسان کے لئے باعثِ ملامت۔ کیونکہ یہ ان بلند پایہ انسانی خصوصیات کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کرتا ہے جو انسان کو اسکی عظمت کے مناسب مسرتیں بہم پہنچانے کی ضامن ہیں اور ایک

جگالی کرنے والی گائے کی خصوصیات سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ انسان اپنے حیوانی اجداد کی شادمانیوں سے بہت برتر مسرتوں کی آرزو کر سکتا ہے اور جو اشخاص اس کے برعکس یقین رکھتے ہیں یا یقین کے جھوٹے دعویدار ہیں وہ اگر سادہ لوح شہری ہیں تو قابلِ رحم ہیں اور اگر وہ رہنما ہیں تو ان سے خائف رہنا چاہئے۔ وہ ارتقا کے خلاف ربانی منشا کے خلاف عمل پیرا ہیں: وہ شر کی اشاعت کر رہے ہیں۔

ضمیر کے عالم وجود میں آنے سے پہلے والے زمانے کے دوران میں، حیوان ہوں یا پہلے مرحلے کی نمائندہ ہستیاں ہوں، سب صرف اپنی بانی خواہشات اور فطری ضروریات کی تسکین ہی کے متمنی رہتے تھے انکی داخلی رجحانات انکے "فرض" کو متعین کرتی تھیں اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ ایک حیوان کے لئے نہ شر کا امکان ہے اور نہ گناہ کے ارتکاب کا کیونکہ وہ علم و بصیرت سے بے بہرہ ہے" وہ ننگے پھرتے ہیں مگر ان کو نہ شرم ہے اور نہ حیا" فقدان ضمیر اور مادی اور جبلی تعینات میں اسیری کی وجہ سے اس کے لئے اختیار کی راہ بند ہے۔ حیوان کی توجہ ارادی کا انحصار اس کی بھوک پیاس پر ہے۔ البتہ وہ بعض نایاب صورتیں (جیسے مثلاً کتے کی) مستثنیٰ ہیں

کہ جب اس کی جاں نثاری جذباتی طور پر اسے اپنے آقا کی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے جو اس کے نزدیک دیوتا بن جاتا ہے۔ لیکن ضمیر کے نزول کے بعد ابنِ آدم جب کسی فعل کے ارتکاب کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک غیر معمولی اضطراب جوش مارتا ہوا محسوس کرتا ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے فعل کی قدر کا احتساب کرے۔ یعنی قوتِ اختیار کو عمل میں لائے۔ اختیار کی سکت کو وہ محسوس کرتا ہے اور فوراً ان اشخاص کے متعلق ایک رائے بھی اس کی قایم ہو جاتی ہے جو قوتِ اختیار کا استعمال نہیں کرتے۔ اخلاقی تصور، جو روحانی تصور کا پیش رو ہے، اس میں بیدار ہو جاتا ہے۔ کتاب پیدائش میں اسی حقیقت کو بے حد ارتکاز اور پر اسرار اختصار کے ساتھ اس جملے میں پیش کیا گیا ہے "اور ان کو علم ہوا کہ وہ ننگے ہیں"

ہم نے عقلی طریقے سے ارتقا کے تنقیدی مطالعے سے آغاز کیا تھا۔ اور ہم آزادی کے معیار کو تسلیم کرنے پر شدہ شدہ پہنچ گئے اس نے ارفع آزادی کے تصور، آزاد قوتِ اختیار کو جنم دیا جسکے مدلول ضمیر اور انسانی عظمت کا احساس ہیں۔ ذاتِ باری تعالےٰ کا تصور بتدریج ایک مطلق قدر کی صورت میں سامنے آیا۔ استقرائی طور پر

ان واقعات کے منطقی لزوم اور سلسلہ بندی کے ذریعہ اس کے برعکس صحائف آسمانی، بعینہٖ ہمارے جیسے اخلاقی تصورات کو ایک قادر مطلق ذات باری تعالےٰ کے وجود کو شرط لازمی قرار دے کر اخذ کرتے ہیں۔ یہ امر نہایت ہی عجیب و غریب ہے کہ یہ دو بعد المشرقینی طریق استدلال ایک ہی مرکز پر آکر مل جاتے ہیں قابل غور یہ اہم بات ہے کہ عمل ارتقار کا تصور، جو بائیبل کی تصنیف کے وقت کسی کو معلوم بھی نہ تھا، طریق استدلال میں شامل ہو جائے۔ یہ عظیم رزمیہ، جس کا گل سرسبد ابن آدم کا وجود ہے، اس پر مجبور تھا کہ ہمارے خدا پر ایمان لانے کے لئے منطقی اساس مہیا کرے اور انسان کی طرز زندگی اور طور طریقوں کی تادیل کے لیئے مفید ثابت ہو۔

یقیناً آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو اگر اس کتاب کے گزشتہ صفحات پڑھیں گے، تو وہ ان کو نا قابل فہم پائینگے۔ انہوں نے اپنے قلب کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی ڈھکی چھپی مگر پے در پے آنے والی آواز نہیں سُنی جو ملامت کرتی ہے یا ہمت بڑھاتی ہے۔ ان کو کبھی انسانی عظمت کے شعور احساس کے پیدا کردہ جذبۂ افتخار کا تجربہ نہیں ہوا۔ ایک بڑی قیمت دے کر حاصل کیا ہوا افتخار جو

مسرتوں سے زیادہ قربانیوں کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہ لوگ
بھی ایک صورت پر قائم حیوانوں کی طرح، آج تمثیل ارتقا کے شاہد
ہیں جو ان کے بغیر آگے بڑھ رہا ہے۔ ان میں سے بعض حیوانیت
کی طرف تنزل کر کے اپنی داخلی غدودوں کی رطوبتوں کے اشارات
کے زیر فرمان ہیں۔ بعض ایسے ہیں، جن کی تعداد زیادہ ہے، جو اخلاقی
قواعد کے توڑنے کی سزاؤں سے ڈر کر اپنے طور طریقوں میں انسان
بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب کے سب وہ انحطاطی یا جامد شکلیں ہیں
جو ارتقا کی تمام تاریخ میں ہم کو ملتی ہیں۔ ان کو کوئی الزام نہیں
دیا جا سکتا کیونکہ ذمہ داری تو صرف ان پر عائد ہو سکتی جو یہ جانتے
ہوں کہ جو راہ وہ <u>اختیار</u> کر رہے ہیں وہ شر کی راہ ہے۔ بقیہ
سب ایسے ہیں جو قوت اختیار کو کام میں نہیں لاتے اور جبلتوں
کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں لیکن یہ لوگ اپنی مثال سے خطرے
کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے طور
طریقے فطرتاً عظمت کا پہلو لئے ہوئے ہیں گو وہ ٹھیک ٹھیک جانتے
بھی نہیں کہ وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں، اور اپنے طور طریقوں کی لم بھی
معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اور انہیں اپنے تساہل کی وجہ سے
متنوع منفعت بخش عملی محرکات کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح

عمل ارتقا کے حاصلات تو ہیں لیکن یہ اسے اب آگے بڑھانے میں کوئی مدد نہیں کر رہے۔ ان میں ذمہ داری کے احساس کا فقدان ہے۔ وہ انسان بن جانے کی نعمتوں کو تو قبول کر لیتے ہیں لیکن اس درجہ کے فرائض سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

تہذیب و تمدن کا کار منصبی یہ ہے کہ افراد کی ان تینوں جماعتوں کی وسعت کو کم کرے۔ اس مشکل کام کو سرانجام دینے کے لیئے ان سب ذرائع، عقلی، جذباتی، اور روحانی کا جو اس کے ہاتھ میں ہیں، استعمال کرنا از بس ضروری ہے۔ عقلی ذرائع صرف انسانوں کی اس قلیل تعداد کے لیئے کارآمد ہو سکتے ہیں جن کا راہ پر لانا مشکل ہے، کیونکہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان غائر حقیقتوں کے وجود کا عقلی دلائل سے ان کو قائل کیا جائے، جو انسانی منطق کی دسترس سے باہر ہیں کیونکہ یہ منطق اور ہی اغراض کے لئے وضع کی گئی ہے[1]۔ اپنے ذہنی قویٰ کے گھمنڈ میں، وہ صرف اس بات پر یقین لاتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آجائے، یعنی وہ باتیں جو ایسے میکانیکی نمونوں میں پیش کی جا سکیں

---

[1] (از مصنف) ایسی چیزیں ہیں جنکو صرف عقل ہی تلاش کر سکتی ہے لیکن جنکو اپنے ہی بل بوتے پر کبھی نہیں پا سکتی۔ یہ چیزیں ادراک ہی پا سکتا ہے، لیکن یہ کبھی ان کی تلاش نہ کرے گا۔"

H-BERGSON, CREATIVE EVOLUTION

جو محدود تجربے سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ان کا طریق استدلال کچھ تازی کتوں کے استدلال سے ملتا جلتا ہے جو میدان میں زندہ خرگوش کا تعاقب کرتے ہوئے یکایک قدم روک لیتے ہیں یہ کہتے ہوئے: "ہم بھی کیسے احمق ہیں، یہ اصلی خرگوش تو ہے نہیں، اس کے پہیے نہیں لگے ہیں"[1]

جذباتی ذرائع بڑی تعداد پر کام آسکتے ہیں لیکن یہ بالواسطہ ہیں۔ روحانی ذرائع ہی بلا واسطہ ہیں لیکن جب تک ایک سلسلۂ عظیم جسمانی، اخلاقی، اور جذباتی آزمائشوں کا پہلے سے میدان ہموار نہ کردے، یہ ذرائع چیدہ لوگوں پر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں، آسائش، فلاح و بہبود، اور آرام وہ زندگی معلوم ہوتا ہے روحانی نشوونما کو راس نہیں آتیں۔ افسوس ہے کہ یہی بات بے حد اذیت کی زندگی پر بھی صادق آتی ہے (یعنی وہ بھی روحانی زندگی کو راس نہیں آتی۔ مترجم)

بہرکیف یہ بالکل واضح ہے کہ تہذیب کا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر طرح پر ابنِ آدم کی مدد کرے کہ وہ ترقی کرے، اور ایسی اڑکھی کلیں نہ جگائے جو جہانی کوششوں کو گھٹائیں۔ اسی

---

[1] (از مترجم) کتوں کو سدھانے کیلئے اول پہیوں والے مصنوعی خرگوشوں پر چھوڑا جاتا ہے۔

صورت میں انسان عمل ارتقا کی ایک وضعیت بن سکتا ہے۔ اسی
صورت میں وہ پائندگی حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس حالت میں اسکے
استحکام کی اساس سب افراد کی مجموعی قوت پر ہوگی۔ یہ اس کی
تعمیر داخلی ہی ہو سکتی ہے خارجی نہیں۔ ہر وہ تہذیب جس کا دارومدار
میکانیکی ترتیبوں اور صنعتی حلوں پہ ہوگا، بالآخر ناکامی کا منہ دیکھیگی۔

جس طرح انسان کو ایک ناطق صورت میں لانے کے لیے
لاتعداد امتحانی صورتوں کو معرض وجود میں لانے کی ضرورت تھی اسی
طرح تہذیب و تمدن کو بھی اپنے حد درجے بعید مقصد یعنی ایک اعلیٰ
ضمیر کی آمد کے انتظار میں مدتوں ٹکریں مارنا پڑیں گی۔

یہ آخری دور بہت طویل ہوگا کیونکہ اغلباً انسانی معاشرے ایسے
ہوکھم کے کاموں میں پڑتے رہیں گے جو حقیقی ترقی کی راہ میں حائل
ہوں گے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ابن آدم کی غائر اور خفتہ امنگوں کی
صحیح حقیقت سے قطعی نافہمی پر ان کا دارومدار ہوگا۔ ابن آدم کو
ترنہا قرن کی وراثت سے چھٹکارا دلانے میں ممکن ہے اتنا ہی عرصہ
لگے جتنا گنوگلوں کو ایک ڈھانچہ دینے میں لگا کیونکہ یہ آگے کی ترقی
تو انسان کے اپنے عمل ہی سے وقوع پذیر ہوگی۔ اب کے بعد ابن آدم

کو اپنی ہی نوع کے خلاف جہاد کرنا ہوگا اور روح کو جسم کو مسخر کرنا ہوگا جو اشخاص اس جہاد کے لیئے تیار ہیں ان کی تعداد ابھی کمیاب ہے۔ ان کی تعداد اتنی ہی شاذ ہے جیسے پہلے کبھی کا یا پلٹ کے آغاز پر تبدیل نوع کرنے والی صورتوں کی ہوا کرتی تھی۔

جب ہم فطری جذبات کی تسخیر یا حیوانی جبلتوں کو قابو میں لانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان جبلتوں کی فطری تسکین ممنوع ہے یا موجب شر۔ برائی اس بات میں ہے کہ ہم ان کی غلامی قبول کرلیں کیونکہ ایسا کرنے میں آزادی پر حدبندی ہوجاتی ہے۔ ابن آدم کو اس اسیری سے چھٹکارا پانا چاہیئے جو حیوانوں کے لئے فطری عمل ہے اور لہذا انسان کے لئے وہ شر ہے۔ انسان کے مطمح نظر کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے اپنے فطری جذبات اور کمزوریوں پر پورا تسلّط حاصل ہو۔ وہ غلامی تو کسی شکل میں قبول کرہی نہیں سکتا۔ لیکن ان جبلتوں کو، جو اس کا جسمانی رشتہ حیوانات سے جوڑتی ہیں، اگر مسخر کرلیا جائے تو پھر ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔

اگر اعتدال مدِنظر رہے تو محبت کرنا، کھانا، پینا، اور تفریح بذاتہٖ خود قابلِ ملامت نہیں اور "اعتدال" کے لفظ میں "اعتدال کرانے والے" کا مفہوم بھی شامل ہے جو ضمیر ہے یعنی انسانی عظمت کا احساس۔

اعتدال سے تجاوز بے کم و کاست اعتدال کرانے والی قوت کی ناکامی اور حیوانیت کی شادکامی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک مخمور شراب خوار اس لیئے نفرت انگیز ہے کہ وہ اپنے نفس پر ضبط کھو بیٹھا ہے اور اس لئے نہیں کہ اس نے شراب پی ہے۔ وہ شخص جو شراب پی کر بدمست ہوگیا ہے وہ انسان ہی نہیں رہا۔ یہ صورت اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ اس کا ضبط نفس ایسے تجاوز کے رحم و کرم پر ہے جس پر اس کا قابو جاچکا ہے۔ ایسے شخص پر ہم کیا بھروسہ کرسکتے ہیں؟ اس کی ناعاقبت اندیشانہ حرص اس کے دماغ کو مختل کر دیتی ہے اور بتدریج اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔

دور رس غائیت کے حامل اخلاقی اصول زندگی کو اس کی طمانیتوں اور فرزانہ مسرّتوں سے محروم کرنا تو درکنار، اُلٹا اسے مزید طمانیت بخشتے ہیں جو ابن آدم کے صحیح طور طریقے رکھنے اور خواہشاتِ نفسانی اور جبلتوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی وجہ سے اس کو حاصل ہوتے ہیں۔

یہ جذبۂ حریت، جس کی جلو میں یہ یقین بھی شامل ہو کہ عمل ارتقا کی افزونی میں امداد کر رہا ہے ابنِ آدم کو لازوال مسرّتوں کے سرچشمے عطا کرتا ہے۔ یہ مسرّتیں، چونکہ عضویاتی میلانات اور تندرستی کے احوال سے مجبور ہوتی ہیں، اس لیئے زیادہ قیمتی اور پائدار ہوتی ہیں۔

اعتدال سے تجاوز کی دوسری صورتیں پہلی کے برعکس رہبانیت اور نفس کشی ہیں اور یہ بھی اتنی ہی ضرر رساں ہیں۔ ان کا ضرر صرف اس وجہ سے ہی نہیں کہ جسم پر چڑھ دوڑنے سے دماغی خلیوں کے قدرتی عمل کے بگڑ جانے سے قوتِ فکر کے متاثر ہونے کا بھی امکان ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان سے ایک خطرناک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ روح اور جسم کو مل کر ایک ہم آہنگ نظام پیدا کرنا چاہیئے کیونکہ صرف اسی صورت میں ابنِ آدم مروت، رواداری اور انسانی ہمدردی کے جذبات کی نشوونما کر سکتا ہے اور ان صفات کی سب کو ضرورت ہے۔

تمدن و تہذیب کو دو کردار ادا کرنا ہیں۔ اسے اپنے عمق میں بھی افزونی پیدا کرنا ہے اور انسانوں کی ممکن و حصول کثیر تعداد میں اپنی توسیع بھی کرنا ہے تاکہ ایسے احتمالات میں اضافہ ہو جو انفرادی ترقی میں عمق پیدا کریں۔

ہم خواہ کسی ارتقائی وضعیت کا حوالہ دیں یا محض بختِ اتفاق ہی کو موجب ٹھہرائیں عمل ارتقاء کے دوران میں اگر کسی نسل نے آگے ترقی کی ہے تو وہ افراد ہی کی بدولت چلی ہے۔ بلا شک و شبہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ہی اتفاق ایک ہی طرز پر کسی نوع کے لاکھوں بلکہ اکثر کروڑوں

افراد کو پیش آیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اتفاق نہ کہلاتا۔ جب کوئی ارتقائی خاصہ تبدل نوعی کے وقت کسی جدید صورت میں رونما ہوتا ہے تو وہ چند افراد ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہی بات ارتقائے ابعد الحیوانات پر بھی صادق آتی ہے۔

فرداً فرداً ہم سب کو اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ لیکن بہ احسن طریق تو یہ فریضہ اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب ہم ہمیشہ بہتری کی سعی کریں اور اپنے نفس کو مات دیتے رہیں۔ یہی وہ سعی ہے جو عمل ارتقاء میں ہماری ذاتی شرکت پر مشتمل ہے۔ یہی ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم یہ سعی کرنے میں ناکام رہے تو ہم ترقی کی امداد میں کوتاہی کریں گے اور ربانی منشاء جو فرانس کے مفکر اعظم ارنسٹ رینان (ERNEST RENAN) کے قول کے مطابق حیات جاودانی کا ضامن ہے، کو پورا نہ کریں گے۔ اگر ہم افزائش نسل کریں تو ایک طرح پر داجبی اور شماریاتی شرکت تو عمل ارتقاء کے ساتھ ہو گی لیکن اگر اپنی شخصیت کی نشوونما نہ کی تو انسانی ارتقاء میں ہمارا کوئی نقش پا نہ ملے گا۔ ہماری زندگی کے اعمال شاہ راہِ ارتقا کے تعمیری پتھر تو ضرور سمجھے جائیں گے مگر سنگ میل بننے کا امکان ہم کھو بیٹھیں گے۔ اعلےٰ اور ارفع ضمیر کو منصۂ شہود پر لانے میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔

انسانی ترقی کا، اور اس کے سوا اور کوئی ترقی ہے نہیں دارومدار جیساکہ ہم بتا چکے ہیں اب انفرادی کوششوں پر ہے جو بیک وقت انسان کے اوزار بھی ہیں اور ماحصل بھی۔ اوزار تو اس لئے کہ حر حرکیات (THERMODYNAMICS) جو غیر متحرک مادے پر حکمران ہے، نہ صرف ترقی کو قابلِ التفات نہیں سمجھتی بلکہ ایک ایسا مبرم تنزل عاید کرتی ہے جس کے خلاف انسانی ذہن اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ ماحصل اس لئے کہ یہ امر ہی کہ ایک انسانی ہستی نوع انسانی کی ترقی پر یقین رکھتی ہے اور اس میں امداد کرتی ہے، اس کی ترقی پر مشتمل ہے۔ یہی حقیقی فرق ہمیں حیوانوں سے ممیز کرتا ہے۔ برگساں کا مقولہ ہے: "ایک ذی عقل ہستی کے خود اندر ہی وہ سب سامان موجود ہوتا ہے جس سے وہ اپنی موجودہ حالت سے ارفع حالت میں جا سکتا ہے۔" اس حقیقت کے جاننے کی ابن آدم کو ضرورت ہے اور کوشش کرکے اس حقیقت کو بروئے کار لانا اس کے لئے لابدی ہے۔

اگر ذہانت کو اخلاقی اقدار کی ادراکی اور عقلی بصیرت کے زیر اثر نہ رکھا جائے تو وہ تن تنہا خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس کی رہبری سے صرف مادیت ہی وجود میں نہیں آئی بلکہ کئی انسانیت سوز اعمال بھی۔ ہ ہرکا گرنے کا دُنیا کو علم ہونے سے بہت پہلے یہ سطور

لکھی گئی تھیں۔ اس کی دریافت ہمارے مطلب کو حیرت انگیز طور پر واضح کرتی ہے۔ یکایک ساری دنیا کے لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ سائنس کی ایک محیرالعقول فتح مندی نے وحشیانہ طور پر بنی نوعِ انسان کی سلامتی پر دھاوا بول دیا ہے۔ اور فی الفور نام نہاد مہذب ممالک کے لوگوں کی سمجھ میں یہ آیا کہ ان سب کا اخلاقی اتحاد ہی اس خطرے سے ان کا تحفظ کر سکتا ہے۔

وقت اتنا کم ہے کہ تحفظ کی واحد امکانی صورت تحریری معاہدوں میں تلاش کرنا پڑی۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ تحریری معاہدے صرف اتنے ہی مناسب اور قابل اعتماد ہوتے ہیں جتنا وہ شخص جسکے دستخط ان پر ثبت ہوتے ہیں اور جب تک یہ شخص دیانت دار اور پُرخلوص نہ ہو اور ایسی قوم کا حقیقی نمائندہ نہ ہو جو اس کے واجب التعظیم عہد کا پاس کرے گی یہ معاہدے بے حقیقت ہیں۔ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ خالص ذہانت اور اخلاقی قدروں کے درمیان ایسی کشمکش پیدا ہوئی ہے جس پر موت و حیات کا مدار ہے۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ توقع کریں کہ یہ سبق جو انسانیت کو ملا ہے اس سے وہ تنبہ پکڑے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں اس میں شک ہے۔ ضمیر بھی ذہانت کی طرح، انسانوں میں غیر یکساں طور پر اُبھری ہے۔

تاہم ایک معمولی ذہانت والی ہستی بھی اگر پرخلوص اور لگاتار کوشش کرے تو ایک بڑے دماغ سے زیادہ پُر اثر ضیاباری کرسکتی ہے جب حضرت مسیح سادہ روح اشخاص کو آسمانی بادشاہت کا وعدہ دیتے ہیں تو انکے ذہن میں نحیف و ناتواں یا کودن نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ مراد ہوتے ہیں جنکا ادراک انکی ذہانت پر چھایا ہوتا ہے اور جنکو انسانی عظمت اور مقدر انسانی پر ایک مضمر تحت الشعوری اعتقاد ہوتا ہے۔

ربانی منشا کی تکمیل میں شریک کار بننے کے لئے جتنا ممکن ہو اتنا ہی ارفع نصب العین رکھنا چاہیئے بلکہ ضرورت ہو تو ایسا جو اسکی دسترس سے بھی باہر ہو۔ ایک ناممکن الحصول نصب العین جو ہماری پوری زندگی کی رہنمائی کرتا ہو ان ثوابت کی طرح جو جہازراں کی رہنمائی کرتے ہیں ایک اوسط درجے کے مقصد سے بہت زیادہ مرجح ہے کیونکہ جونہی ہم اس موخرالذکر مقصد کو حاصل کرلیتے ہیں تو ہم ایک نئے مقصد کی تلاش پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ آخری نصب العین ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اصلی اہمیت اتنی مقامی یا وقتی کامیابی کو نہیں بلکہ سعی کے تسلسل کو ہے اور اگر ہمارے اندر دل شکستگی کے رجحانات پیدا ہوں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ شمع ہدایت بھی ہمارے اندر ہی ہے اور خارج میں ہدایت کی تلاش سعی لاحاصل ہوگی۔

(۱۱)

جبلتیں۔ حشرات الارض کے معاشرے۔ ذہانت
تجریدی تصورات۔ فرد کا فریضہ۔

زمانہ حال کے غور و فکر کا ایک نہایت عجیب و غریب امتیازی وصف، جو اس وجہ سے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ وہ ابنِ آدم کے عام افتخار کا منہ چڑاتا ہے، اس سعی بین ظاہر ہوتا ہے جو یہ ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہے کہ انسانی ذہانت، حیوانی جبلتوں اور حیوانی عقل کی ایک چکیلی درازی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ابنِ آدم اور حیوان کی ذہانتوں میں نشانات امتیاز کو واضح کرتے، جو دل نشین ہیں، فلسفیوں کا ایک مدرسہ فکر باقاعدگی کے ساتھ ان امتیازات کو گھٹا کر کم سے کم کرنے میں مصروف ہے اور اپنی لمبی چوڑی تصانیف میں یہ دکھلاتا ہے کہ اونچے طبقے کے حیوانات کے دماغی وظائف جوہری طور پر ویسے ہی ہیں جیسے ابنِ آدم کے۔ اس امر کے پیش نظر کہ انسانی دماغ صریحاً کروڑوں صدیوں کے طویل ارتقا کا نتیجہ ہے،

اس کے برعکس اگر کسی اور نتیجے پر یہ مفکر پہنچتے تو وہ نہایت حیرت انگیز بات ہوتی۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے ان مفکروں نے کھلے ہوئے دروازے کو بڑی مشقت سے توڑ کر اندر جانے کی سعی کی ہو۔ تاہم یہی دماغی وضعیتوں کی یکسانیت ہی مسئلے کو اور بھی معمّہ بنا دیتی ہے کیونکہ یہ مفکر تصوّرات کے جنم کو، جن کا نقش پانہ تو دائلی غدودوں کی رطوبتوں میں ملتا ہے اور نہ ہی اونچے طبقے کے حیوانات کی کسی تقابلی رجحان میں، توجیہ کرنے میں قطعًا کامیاب نہیں ہوئے۔

ایسی کوششیں، جن کو بعض لوگ نہایت وقیع سمجھتے ہیں اور بعض لاطائل، بہر حال مضرت رساں نہ ہوتیں بشرطیکہ انہیں سائنٹیفک اساس بنا کر ابطال توحید کے لئے استعمال نہ کیا جاتا، جو غیر متعلق بات ہے، اور نہ ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ انسان کو اپنے معاشرتی مسائل حل کرنے کے لئے حشرات الارض کے معاشروں کی مثال سے فیضان حاصل کرنا چاہئے۔

بظاہر ان مفکروں کی دور رس نگاہ حشروں کے "معاشروں" اور انسانی معاشروں کے درمیان جو امتیازی فرق ہیں ان تک نہ پہنچ سکی۔ انسانی معاشرے کی اساس ایسی آزاد خود اختیار ہستیوں کے بالارادہ باہمی شرکت پر ہے جو معاشرے سے الگ رہ کر بھی زندگی بسر کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ حشرات الارض کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے

معاشرے میں انفرادی خود اختیاری کا فقدان اس حد تک ہوتا ہے کہ اس کے بعض افراد اپنی خوراک حاصل کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتے اور ان کی خوراک کا دار و مدار دوسرے خصوصی مہارت رکھنے والے افراد پر ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حشروں کے "معاشرے" انہیں معنوں میں معاشرے ہیں جن معنوں میں انسانی جسم خلیوں کا ایک "معاشرہ" ہے لیکن معاشرتی جماعت کے معنوں میں نہیں۔ انسانی جسم کی ترکیب اس طرح بنی ہے کہ دماغی خلئے سوچ سکتے ہیں، تخلیق کر سکتے ہیں، ترقی کر سکتے ہیں حالانکہ دیمک کے گھروندوں کی سرگرمیاں بے حقیقت اور منجمد ہوتی ہیں۔ ان دونوں معاشروں کے فرق کا مقابلہ اس فرق سے کیا جا سکتا ہے جو زمانۂ حال کی حسابی مشین اور انسان میں ہے جس نے اس مشین کو اپنے حسابی مسائل حل کرنے کے لئے وضع کیا ہے۔ یہ مشین خواہ کتنی ہی مکمل اور پیچیدہ ہو قوت فکر اس میں نہ آئے گی۔ یہ انہیں مسائل کے حل مہیا کرے گی جو انسان نے تجویز کئے ہیں۔ یہ ایہام کہ ہمیں حیوانی بیل جول اور حشروں کے معاشروں سے اطمینان حاصل کرنا چاہئے ایک بے پایاں احمق پنا ہے۔ ممکن ہے کہ جن مصنفوں نے یہ حل تجویز کیا ہے ان میں سے بعض اپنے خیال میں مخلص ہوں۔

اس لحاظ سے ان کا انداز فکر اور بھی رقت انگیز ہے کیونکہ یہ انکی انسانی مسائل سے کلی بے خبری، انسانی عظمت کے احساس کے ہولناک فقدان، اور ابن آدم کے ارتقائی فریضے سے ناواقفیت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ ابن آدم کو حیوانی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے اور تمام روحانی ترقیوں کا مانع ہے۔ یہ ہر شرافت آفریں سعی ہر رفعت پسند امنگ کو رد کرتا ہے، یہ ابن آدم کو گھٹا کر وہ کار منصبی اس کو سپرد کرتا ہے جو افزائش نسل کے لئے مخصوص سانڈ کا ہے اور یوں اس کے وجود کی اساسی وجہ پر پردہ خفا ڈالتا ہے۔ یہ ان اشخاص کے ہبوط کا بھی خواہاں ہے جو پہلے سے ارتقاء کی کچھ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ان مصنفوں نے کبھی اس سوال پر غور نہیں کیا کہ افزائش نسل کرنیوالی "ملکہ" یا مرد "نر" کا کردار کون ادا کرے گا یا اس سوال پر کہ آیا لاجنس (SEXLESS) مزدور ایک ایسے نصب العین کے حامل ہیں جو ہماری عضویاتی ساخت اور ہماری تمناؤں کے لئے موزوں ہو۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ دیمک کے گھروندے اور شہد کی مکھیوں کے چھتے میں کوئی قائد نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ یہ بے شعور غلاموں کے جتھے مل جل کر صاف کی ہوئی مشین کی طرح ٹھیک ٹھیک کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ ابن آدم مشین سکا

دندانے دار پہیّا نہیں بلکہ ایک آزاد ہستی ہے۔

گروہ پسند حشروں کی جبلت میں ایک عجیب کایا پلٹ ہوجاتی ہے۔ فرد کی محافظت کرنے پر مائل یا دوں کا ایک ڈھیر ہونے کی بجائے، جیسا کہ جانداروں کی اور جماعتوں میں ہے، یہ جبلت ہر حشری گروہ کی صوریاتی اور عضویاتی ضرورت کے ماتحت دوسرے محرکات میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ایک ہی جنس کے حشروں میں بے حد متنوع صورتیں، نامعلوم اثرات کی بدولت، نمودار ہوجاتی ہیں۔ ان جماعتوں کے افراد اگر ایک دوسرے سے علیحدہ کردیئے جائیں اور اپنے حال پر چھوڑ دیئے جائیں تو جبلتیں اب ان کی محافظت نہیں کرسکتیں۔

"انفرادی" جبلت، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے فرد کے تحفظ کے کام کو فراموش کرکے "اشتراکی" جبلت بن گئی ہو جو اب بغیر کسی آویزش، یا جدوجہد کے ہر علیحدہ علیحدہ گروہ (مزدور، سپاہی، ملکہ، نر) کے فائدے کو دوسروں کے فائدے میں مدغم کردیتی ہے۔ ہر چیز اب اس طرح ہونے لگتی ہے گویا ہم کسی نئی شخصیت کی تخلیق مشاہدہ کررہے ہوں (چیونٹی کا گھروندا، دیمک کی بستی) جس کو افراد کی جبلتوں کے مجموعے سے حاصل کردہ اپنی جبلت ملی ہو لیکن وہ انفرادی جبلتوں سے اتنی برتر ہے کہ اس میں افراد کے فائدے جماعت کے فائدوں پر قربان

ہو گئے ہیں۔ جبلت کے متعلق جو ہمارا تصور تھا اور جو اس کی تعریف ہمارے ذہن میں ہے یہ اس کے بالکل منافی ہے۔ ایسی حیاتیاتی جماعت ایک شماریاتی مجموعی ماحصل ہے جن میں نہ روح ہے اور نہ جس کا کوئی مستقبل اور جو اپنی جماعت کے ارکان کی زندگی کی محض ایک وجہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے افراد کی جماعت سے علیحدگی ان کی موت ہے۔ یہ حیرت انگیز وضعیتوں کے پیدا کردہ کسی اندھی مطابقت ماحول کے شہید ناز ہیں اور جن وضعیتوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے، ان کے خالق کو اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

اسی طرح پر انسانی جسم بھی ممیز ہستیوں یعنی خلیوں سے بنا ہوا ہے۔ ہر خلیہ کو بالکل جدا جدا خواص ملے ہیں۔ ان میں معمولی اور نیچ ذات کے کثیر زاعوام یعنی FIBROBLASTS ہیں[۱] جگر اور ہڈیوں کے گودے کی خلیئیں خود مختار ماہر علم کیمیا ہیں۔ پھر ایسی کیمیا داں خلیہ ہیں جو دماغ اور عصبی نظام کے احکام کی تعمیل میں لگی رہتی ہیں اور جو یہ جانتی ہیں کہ کیسے اعصاب کی نوکوں پر حسب

---

[۱] بے قاعدہ شکل کی چپٹی نسیجی خلئیں جو سفید نسوں کی رطوبت خارج کرتی رہتی ہیں۔ (مترجم)

ہدایت آنا فانا ACETYLCHOLINE[1] تیار کر دی جائے جو عضلوں کو سکیڑنے کا کام دیتی ہے اور (ADRENALINE)[2] مہیا کی جائے جو پھر عضلوں کو پھیلا دیتی ہے۔ ایک گروہ مشرفا خلیوں کا ہے یہ دماغ کی مخروط نما خلیاں ہیں جو اپنے بانجھ پن میں مست ہیں اور کبھی نئی خلیوں کو جنم نہیں دیتیں: اعصابی خلیہ ہیں جو احکام اور انفعالات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ارسال کرتی رہتی ہیں؛ کچھ ایسی ہیں جو دفاع کا فریضہ ادا کرتی ہیں کچھ محافظت میں لگی رہتی ہیں کچھ ایسی ہیں جن کے ذمہ زخموں کے اندمال کا فریضہ ہے۔ ان سب کی ربط دہی سے انسان کی خود مختار شخصیت وجود میں آتی ہے۔

لیکن چیونٹیوں کے گھروندوں اور شہد کی مکھیوں کے چھتوں میں، جہاں خلیوں کی طبعی کیمیاوی اور حیاتیاتی خواص کی جگہ جبلتیں ہیں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ محض نامکمل خاکے ہیں، ایک طرح کے سخریہ تصویریں، چالو پرزوں کا ایک مجموعہ ہیں جو

---

[1] ایک کیمیاوی مرکب (مترجم)

[2] گردے کے قرب میں ایک غدود (ADRENAL) نامی ہے وہ یہ مفید رطوبت خارج کرتا ہے۔ (مترجم)

بظاہر بغیر کسی قابلِ فہم وجہ کے گھومے جاتے ہیں۔ ہم زندہ ہستیوں کے جسموں میں بھی اسی طریق کے آثار پاتے ہیں یعنی تقسیم عمل لیکن انسان میں آکر یہی ترکیب ایک حقیقی، سرگرم، اور تخلیقی شخصیت کو جنم دے کر گلِ سرسبد بن گئی ہے اور یہ صورت دیمک کے گھروندے میں غائب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کو ذہانت اور جبلت کے درمیان کیت کے فرق سے کچھ زیادہ چیز نظر آتی ہے۔ حیوانوں کے "معاشرتی" نظاموں بالخصوص حشری "معاشروں" اور انسانی معاشروں کے درمیان کم وبیش کے فرق سے بہت کچھ زائد بھی ہے۔ انسانی ذہانت کی سب سے زیادہ جاذبِ توجہ خصوصیت، جو اسے نہایت بیّن طور پر اونچے طبقے کے حیوانات سے ممیز کرتی ہے، وہ تجریدی تصوّرات کی تخلیق ہے۔

جو لوگ کہ فلسفیانہ اسلوب بیان سے ناواقف ہیں ممکن ہے ان کے لئے مجرّد تصوّرات کا تخیل بہت واضح نہ ہو۔ اس لئے ہم اسکی توضیح کی سعی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر آیئے بچے کے ٹھیک ٹھیک گول گیند پر غور کریں۔ یہ بہت اغلب ہے کہ ذوات الثدی بھی عموماً اس کو اسی شکل میں دیکھتے ہوں جیسے ہم اسے دیکھتے ہیں۔ بہر صورت ایک کتے کا پلا جو اس سے کھیلتا ہے، انسانی بچے کی طرح، جلد ہی اس کی خصوصیات

جانی جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گیند لڑھکتی ہے۔ ٹپّہ کھانا اس کا معمول ہے اور مختصراً اس میں بغیر ضرر پہونچائے حرکت بھی ہے اور اتنی کافی فردیت اس میں ہے کہ وہ اس کی نظر میں ایک دلچسپ شے ہے۔ گیند کی اس طرح حد بندی کر لینے سے جانور مطمئن ہے۔ یہ حد بندی اس کی توقعات کے مطابق ہے اور غالباً گیند کی یہ تعریف انسانی بچے یا ابتدائی انسان کی ذہنی حد بندی سے مختلف نہ ہوگی۔

لیکن ایک ذہین انسان کو گیند کی یہ تعریف مطمئن نہیں کر سکتی خواہ اس نے ایک لفظی علامت بھی گیند کے لئے وضع کر لی ہو۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ان دو قسم کی ذہنیتوں میں اساسی فرق نمودار ہوتا ہے۔ ابن آدم تصورات شروع کرتا ہے، بہ الفاظِ دیگر ایک خیالی گیند جس میں اصلی گیند کی سب ہندسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں پوری حد تک وسعت ہوتی ہے اور اسے تجریدی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔ وہ اسے صرف وہ خاص صفات منسوب کرتا ہے جو اس کی شکل کو متعین کرتی ہیں اور ان وصفوں کو حذف کر دیتا ہے جو اس کے مادے میں پائے جاتے ہیں یعنی رنگ، سختی، وزن، لچک کیونکہ یہ صفات دوسرے اجسام میں بھی پائی جاتی ہیں جو اس سے شکل میں مختلف ہیں۔ وہ ایک اور نام بھی تجویز کرتا ہے جس میں مادی صفات نمایاں نہیں ہوتیں

یعنی کُرہ - اور پھر اس نئے شئے کو اچھی طرح "ذہن نشین کرنے" کے لیے
وہ ایک غیر مرئی عنصر ایجاد کرتا ہے جس میں نہ ابعاد ہوتی ہیں نہ کمیّت
مادّہ، جو نہ موجود ہے، نہ کبھی موجود تھا اور نہ کبھی موجود ہو گا اور جو باوجود
ان سب باتوں کے بالکل لازمی ہیں تاکہ وہ کرے کی تعریف مکمل کر سکے
جس کا کسی دوسرے طریق پر تصوّر اس کے لئے ناقابلِ فہم ہے اور یہ
اجنبی "عنصر" مرکز" ہے -

"مرکز" کا خصوصی انسانی تخیل ایک تجریدی تصور ہے -

یہ وہ مرحلہ ہے جہاں ہمیں وہ غار صاف نظر آتا ہے جو حیوانی
ذہانت اور انسانی عقل کے درمیان حائل ہو کر تدریجی تغیر کو محتاجِ
تصدیق بنا دیتا ہے - ابنِ آدم میں خیالی دُنیا تخلیق کر لینے کی قابلیت پیدا
ہو گئی ہے اور اس کے لئے اسے اپنے ماحول یا تجربے سے عناصر مہیّا کرنے
کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ عناصر اسے اپنی ذات ہی میں مل جاتے
ہیں - اب یہ مسئلہ منفعتی مطابقت ماحول کا نہیں رہتا بلکہ ایک کلیتاً
جدید ذہنی تخلیق کا مسئلہ بن جاتا ہے جس میں مادّی حقیقت محض ایک
حیلہ ہی رہ جاتی ہے حواس سے قابلِ ادراک مظاہر، قابلِ امتیاز کائنات
سے پرے ابنِ آدم ایک اور خیالی دُنیا ایجاد کر لیتا ہے جو اس کے
غور و فکر کی اہلیت اور تجربے کی تشریح و تعبیر کے لئے لابدی بن جاتی ہے

اور اسی کی بدولت پھر وہ اول الذکر دُنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ جس طرح وہ آگ، رعد، برق کی سرحد کے پرے خوفناک زندہ ہستیوں کی تخلیق کرتا ہے، جس طرح شکار میں کامیابی کے لئے وہ "جادو" کی اختراع کرتا ہے بعینہٖ ویسے ہی وہ تصوّرات کا طلسم کھڑا کرتا ہے اور بالآخر اس کائنات کو جسے اس کے دماغ نے جنم دیا ہے اس کائنات کے مقابلہ میں جس میں حیوانات کا ارتقار عمل پذیر ہوا ہے، زیادہ اصلیت منسوب کرتا ہے۔ یہ شدّت کے ساتھ انسانی کائنات ہے، خالص تصوّرات، اخلاقیات، روحانی تصورات، اور جمالی تصوّرات کی کائنات ہے۔ ربّانی منشا کے مطابق وجود میں آکر اور خالقِ مطلق کی طرف سے ضمیر اور آزادی کا عطیہ حاصل کرکے، عملِ ارتقا کو آگے بڑھانے کی کچھ ذمہ داری کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اُٹھانے کے قابل ہوگیا ہے اور اپنے ذرائع کے حدود کے اندر اسے اپنے خالق کی ریس کرکے خود ایک غیر مادی دُنیا کی تخلیق کرنے کی قوت ہے۔ ایسی دُنیا جو حیوانات کے لئے ممنوع ہے مگر انسان کی ساری دلچسپیاں اور ساری کوششیں اب اسی دنیا میں صرف ہونا چاہئیں۔

جو لوگ کہ اپنی اجدادی رجحانات کے اسیر ہیں اور یہ سمجھ نہیں سکتے یا سمجھنا نہیں چاہتے کہ ان کا مقدّر کتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز

ہے وہ بلا ریب بد نصیب ہیں۔

ہم کو علم ہے کہ ہمارے اس نظریئے پر مندرجہ ذیل اعتراضات کیئے جائیں گے: غیر مہذب وحشی اقوام کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ بہت سی انسانی ہستیاں ہیں جو وحشیانہ یا نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتی ہیں جیسے جنوبی افریقہ کے جنگلی بونے، اسٹریلیا کے اصلی باشندے، فیوجی وغیرہ جو شاذ و نادر ہی تجریدی تصوّرات سے باخبر ہیں لیکن باوجود اس کے بنی نوعِ انسان ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ نوع انسانی کے نوّے فی صد افراد ایسے ہیں جو تجریدی تصوّرات کا بہت ہی کم استعمال کرتے ہیں مگر پھر بھی اچھے خاصے انسان ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں

یہ درست ہے، تاہم، اگرچہ انہوں نے ذہنی ترقی نہیں کی، پھر بھی ہمارے قدیم اجداد کی طرح انہوں نے دیوی دیوتا تخلیق کر لئے ہیں اور غیر مہذب رسمیں اور رسمیں بھی اختراع کر لی ہیں۔ لیکن جب ہم تہذیب و تمدّن کی ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو کیا فیوجی ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں؟ جب ہم ارتقا کا ذکر کرتے ہیں تو کیا ہم جامد شکلوں کا اس سے زیادہ کچھ مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کو ترقی یافتہ جانداروں کے سلسلے میں ان کا صحیح درجہ یا مقام تجویز کردیں؟ جب ہم کسی قوم کے فنی اور ثقافتی حاصلات کو بیان کرتے ہیں اور جب ہم دنیا کی تہذیب کو

ارفع کرنے میں کسی قوم کے کارہائے نمایاں کی یاد دلاتے ہیں تو کیا ہم بے ہنگم اور غیر بار آور اقوامی اژدحاموں پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ملک کے کروڑوں انسانوں میں سے ہم ان چند نایاب افراد کا انتخاب کر لیتے ہیں جنہوں نے عالمگیر ترقی میں کچھ اضافہ کیا ہے، جو اپنی صلاحیت اور فطری ذہانت کی بدولت اپنے ہم عصروں پر فوقیت لے گئے ہیں اور انسانیت کی صف اول اور تہذیب کے قراول میں اپنا مقام قایم کیا ہے۔ یہی قلیل جماعت انسانوں کی ہے جو درخور اعتنا ہے۔ بقیہ افراد انسانی تو ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان سے فیضان حاصل کرتے ہیں اور ان کو ہماری توجہ کا اتنا ہی استحقاق ہے جس قدر یہ اول الذکر گروہ کے نقوشِ پا پر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہم نوعِ انسانی کو ایک زندہ اژدحام، جو عمل تبدل میں سے گزر رہا ہے، تصور کر کے اپنے غور و فکر اور مطالعے کا موضوع بناتے ہیں۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ اژدحامی تبدل صرف افراد ہی کی بدولت ممکن ہے اور یہ افراد، بے مثل اور یکتا نہیں، تو ان کا وجود ملکی تعداد میں کہیں کہیں ملتا ہے اور ان کے ہم عصر جن کے حصے میں وہی عطئے کم آئے ہوتے ہیں، صرف اس خام مواد پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں سے بالآخر اور تبدل نوعی کرنے والے افراد مہیّا ہوتا ہیں یا ان کا یہ کام سمجھنا چاہیئے

کہ چند زیادہ ترقی یافتہ دماغوں کے کارہائے نمایاں کو جمع کریں اور روایت کے ذریعے اگلی نسلوں کو منتقل کریں۔ یہ استثنائی دماغ ضیا باری اور شعاع فگنی کے مرکز ہیں جن سے لہریں اٹھ اٹھ کر پھیلیں گے جیسے پانی میں پتھر پھینکنے سے ہلکورے اٹھکر پھیلنا شروع کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص دُنیا کے کسی حصّے میں بھی جنم پاسکتے ہیں۔ امریکہ ہو، ایشیا ہو، یا یورپ اور معاشرے کی قسم کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ ہستیاں نہ چینی ہوتی ہیں، نہ امریکن، نہ انگریز اور نہ ہندو۔ بلکہ یہ انسان ہوتے ہیں۔

جب کسی قوم کے چند اشخاص کوئی انسانی شرف و امتیاز حاصل کرتے ہیں تو ہم عادتاً اس فضیلت کی اس قوم کو داد پیش کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دَور میں ہیں جس میں "سیاسی وجود" (حکومتیں اور سلطنتیں) باوجود اپنی غیرحقیقی ماہیت کے ابھی تک ایک سچ مچ کی ہستی رکھتی ہیں اور یہی ہمارے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ بعینہٖ ایک پورا دارالعلوم اپنے کسی میرمیدان کھلاڑی کے طرۂ امتیاز میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ قوم اور درسگاہ ان شاندار کارناموں سے، جو ان کے اوسط درجے کے ارکان کے بس کا روگ نہیں، افتخارِ عظیم حاصل کرتی ہیں اور یہی امر ان گروہوں کی رسمی ہمجنسی کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ ہم اس رائے کا اعادہ کرتے ہیں

کہ حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا انحصار افراد کی نہایت قلیل تعداد پر ہوتا ہے
اور یہ ترقی جو ابن آدم کے ذریعے ارتقار کی صعودی رفتار ترقی کی نمائندہ
ہے قوموں کی حد بندیوں سے مافوق ہے۔ اسی طرح درخت کی جڑ،
جس کے انتہائی نوک پر خلیوں کا ہلاکت خیز سرگرمی سے سترا ہوا ایک
چھوٹا سا دستہ رہبری کر رہا ہوتا ہے، زمین میں نفوذ کرتی چلی جاتی
ہے۔ یہ نوک نازک اور کمزور، ڈورے کی طرح باریک ہوتی ہے لیکن
اسی کے پیچھے پیچھے، تیزی سے تنومند ہوتی ہوئی جڑ، جو ابھی انگلی کے
برابر موٹی تھی، کلائی اور بازو کے برابر موٹی ہو جاتی ہے، آنکھیں میچ کر
اس راستے پر چلی جاتی ہے جو نازک سفید بال کی سی نوک اس کے لئے
زمین کے اندر تیار کرتی جاتی ہے۔ پودے کا پورا درخت اسی رس کو
کھا کر نشوونما پاتا ہے جو یہ نازک چھوٹی چھوٹی جڑیں زمین سے اس کے
لئے بہم پہنچاتی ہیں۔

انتہائی تخلیقی اور اختراعی قوت یا غیر معمولی ذہانت کے ظہور اور
نشوونما کے مواقع ایک اعلےٰ درجے کے مہذب ملک میں زیادہ ہیں
کیونکہ ان کا ماحول ذہن کی نشوونما کے لئے زیادہ موزوں ہے اور یہیں
وہ جلد ترقی کر لیتا ہے۔ پسماندہ قوموں میں، جن کے دماغوں کو وہ ذہنی
خمیر میسر نہیں آتا، جو درجہ اول کے شہروں یا دارالعلومی شہروں میں

عام ہوتا ہے، مقابلتاً غیرمعمولی ذہانت کا ظہور کم ہوتا ہے۔ بڑے شہروں اور دارالعلوموں میں روایت زیادہ مالا مال ہوتی ہے اور اطلاعات اور فیضان کے سرچشمے بے حد۔

تاہم ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ وہ عالم جو آج نہایت طباع اور متبحر تصوّر کئے جاتے ہیں وہی وہ افراد ہوں گے جو ارتقا کے نقطۂ نظر سے مستقبل میں کوئی پائدار نقش قدم چھوڑ جائیں گے۔ کیوں کہ ہم تو انہیں معیاروں سے کسی شخص کی اعلیٰ ذہانت یا عظمت کا فیصلہ کریں گے جو ہماری تہذیب یا ثقافت کی آج واقعی حالت ہے۔ ہمارے لئے کوئی مطلق فیصلہ دینا تو ناممکن ہے۔ ہزار یا دو ہزار برس بعد جو شخص ہمارے دور کا رجل عظیم متصور ہوگا اغلب ہے کہ آج موجود ہو یا گزشتہ کل موجود رہا ہو۔ ممکن ہے ہم برلب سڑک اس کے پاس سے گزرے ہوں، ممکن ہے ہم اسے جانتے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے وہ بالکل ہی غیرمعروف ہو۔ ہمارے پاس اس شخص کو پہچان لینے کا کوئی ذریعہ نہیں خواہ اس وجہ سے کہ ہم بہت ذہین ہیں اور خواہ اس وجہ سے کہ کافی ذہین نہیں۔ ذہانت کی کثرت، جو کسی ارشمیدس یا ڈیکارٹ کو جنم دیتی ہے، دماغ کے مقابلتاً زیادہ لطیف خواص کو بے ہوشی کی نیند سلا دیتی ہے۔ کیونکہ یہ خواص عقلی نہیں ہوتے اور

عقل میں اتنی قوت ہے نہیں کہ وہ واقعات کے بلا واسطہ علم کے بغیر کچھ کر سکے ۔ وجدان عقل سے زیادہ میدانِ عمل کی گتھیوں کو سلجھا لیتا ہے اور سائنس یا فلسفے کی بہ نسبت خالص وجدانی مذہبی اعتقاد زیادہ کارگر انسانی بیرم ہے ۔ عمل یقینِ کلی کا پیرو ہے علم کا نہیں ۔

انسانی غور و فکر کی تاریخ ہزاروں ثبوت اس امر کے مہیا کرتی ہے کہ وقت پر ہم انسانوں کی صحیح اقدار معلوم نہ کر سکے مگر ان کی جن سرگرمیوں پر بسا اوقات دنیا کے تہ و بالا کرنے والے حادثات نے پردہ ڈال دیا، انہیں سرگرمیوں کی صدائے بازگشت بہت بعد میں جا کر سنائی دی ۔ کوئی شخص یہ پیش بینی نہیں کر سکتا کہ آج جو لوگ رجال عظیم متصور ہوتے ہیں کل ان کے پیچھے چھوڑے ہوئے نقوش پا کتنے شاندار یا دیرپا ہوں گے ۔

قدیم روما کے طبقۂ اُمرا، فلسفی اور ذی فہم اشخاص ۳۳ء میں اگر یہ سن پاتے تو ہنستے کہ ایک غیر معروف یہودی، جس کے جرم کی ایک دُور کی نو آبادی کے رومی ناظم کی عدالت میں سماعت ہو رہی تھی، اور حاکم نے سیاسی اُلجھاؤ سے بچنے کے لئے اس یہودی کو اپنی مرضی کے خلاف

اژدحام کے حوالے کر دیا تھا، آگے چل کر قیصرِ روم سے کہیں زیادہ ناموری حاصل کرے گا اور مغرب کی تاریخ پر چھا جائے گا اور خالص انسانیت کی علامت سمجھا جائے گا۔

......

(۱۴)

توہمات۔ ابتدا اور نشو و نما

توہمات، مذہب کی تلاش میں ابنِ آدم کا پہلا بے ڈھنگا قدم، متصوّر ہو سکتے ہیں اور اس نقطۂ خیال سے وہ تھوڑی بہت عزت کے مستحق ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کی اساس توہمات پر ہے بلکہ محض یہ کہنا ہے کہ ارتقار کے نقطۂ نظر سے توہمات کا جنم اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ حیوانی فہم میں ایک عمیق تغیر ظہور پذیر ہوا۔ یہ ایک ایسی ہی تمہیدی منزل تھی جیسے تھیلی میں بچوں کو پالنے والے کنگرو خالص ذوات الثدی کے تمہیدی منزل تھے اور جیسے کہ بے حد قدیم جانداروں کا روشنی سے متاثر ہونے والا چلدی مقام مستقبل کی آنکھ کے افعار کا حامل خیال کیا جا سکتا ہے۔

آئیے ہم اس انسانی صورت والی ہستی کا تصوّر کریں جس کے پاس نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ روایات۔ جو نہایت خونخوار درندوں کے پہلو بہ پہلو غاروں میں سکونت پذیر ہے۔ اس کا طرزِ زندگی درندوں

کی طرزِ زندگی سے بہت ملتا جلتا ہی تھا۔ دونوں کو ایک سی ہی مشکلات
کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دونوں کو زندہ رہنے کے لئے خوراک کی ضرورت
تھی جس کے لئے شکار مارنے کی ضرورت تھی۔ اضافی کمزوری اور تو جیز
قوتِ خیال کے اشارے پر اس نے بھدّے اوزار، پتھر، اور ڈنڈے
بتدریج تیار کرنے شروع کیئے۔ اسے اپنے تحفظ کا خیال کرنا لازمی
تھا۔ صبح سے شام تک وہ چوکس رہتا تھا۔ لیکن دوسرے حیوانوں
کے برعکس اس کے دماغ کے پرزے کام کرنے لگے اور وہ اختراع
کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے ہتھیار دن بدن زیادہ کارگر ہوتے
گئے۔ اپنی جسمانی کمتری کا تدارک کرنے کے لئے اس نے اپنے ہتھیاروں
کو لگاتار ترقی دی۔ بجائے اس کے وہ اپنے آپ کو قدرتی احوال
کے حوالے کر دیتا، اس کے ناکمل فہم نے قدرتی اعمال مطابقت کی
جگہ ان خارجی صنعتوں کو لا کھڑا کیا جن کا خیال اس کے دماغ نے سمجھایا
اور جن کی تکمیل اس کے ہاتھوں نے کی۔ قدرت کے مہیا کردہ ہتھیاروں
کے خواص کو اس نے سمجھا کیا۔ بعد سے ڈنڈے کی صورت بدلی
اور اس کی بجائے اس نے ہلکا، زیادہ مضبوط، اور زیادہ کارگر پتھر
کا کلہاڑا ایجاد کر لیا۔ نوک دار چٹان کو ہوشمندی کے ساتھ سوٹے
کے سرے پر، اپنے مارے ہوئے جانوروں کی کھال میں سے کٹے ہوئے

تسموں کے ذریعے، مضبوط باندھ کر، اس نے نیزہ بنا لیا جو بعد میں پھینک کر مارنے والی برچھی میں بدل گیا۔ جب وہ زیادہ کارگر اور مہلک اسلحہ سے مسلح ہوگیا تو ابن آدم کی زندگی نسبتاً زیادہ آزاد ہوگئی آفتوں کے خطرے کم ہوگئے۔ ابھی وہ دن تو دور تھا کہ اسے ضروری فرصت میسر ہو یا وہ اپنے اسلحہ کی آرائش میں لگے لیکن اس راہ پر وہ چل نکلا تھا۔ چقماقی آوازوں کی تدریجی ترقی اس امر کو ثابت کرتی ہے۔

ابھی اور خطرات اس کے سر پر آفت ڈھائے ہوئے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا مقابلہ کیسے کرے ان کی دہشت چھائی رہتی تھی۔ یہ خطرات شہابوں، رعد و برق، پہاڑوں کی آتش فشانیوں اور پگھلے ہوئے لاوے کی ندیوں کی صورت میں آتے تھے۔ انسان کے آگ کو اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرنے کے آغاز پر اکثر خیالات آرائی کی گئی ہے کیونکہ گمان غالب یہ ہے کہ لکڑی کے ٹکڑوں کو باہم رگڑ کر آگ پیدا کرنے کے طریقے کی دریافت آگ کے اول استعمال میں آنے سے بہت بعد کی ہے۔ یہ امر ناقابل تصور نہیں کہ انسان نے لاوے کی ندیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش اپنے معمولی اسلحہ سے کی ہو اور اسے آتش فشاں اژدہا سمجھ کر اس پر اپنا ڈنڈا اور کلہاڑا دے مارا ہو اور لکڑی کے دستے میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بجلی سے جل اٹھنے والے

درختوں کی ٹہنیاں اپنے لئے آگ مہیا کرنے کے لئے نوچی ہوں۔ اس کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا ہوگا کہ اس خطرناک عنصر کو اگر اپنی غار میں محفوظ کر لیا جائے تو ضرورت کے وقت دشمنوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے مفید شے ہے۔ سب جنگلی جانور آگ سے ڈرتے ہیں۔ دشمن پر قابو نہ سہی اس نئے خوفناک بنیادی "عنصر" یعنی شعلے پر قابو پاکر جو اسکی توجہ سے زندہ بھی رہ سکتا تھا اور اس کی غفلت سے بجھ بھی جاتا تھا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ آگ کے لئے اس کے دل میں ایک دہشت آمیز تعظیم و تکریم بھی پیدا ہو۔

اس امر کی بدولت کہ یہ دہشت اس کی نفسیاتی انفعالیت کی حدود سے متجاوز نہ ہو سکی۔ ابتدائی انسان نے قطعی طور پر اپنے اور حیوان کے درمیان تفرق کر لیا۔ دماغ چونکہ صرف اسی کو عطا ہوا تھا وہ اس کی مدد سے دہشت کے جذبے پر سبقت لے گیا۔ آگ پر قابو حاصل کرنے کے بعد اس نے اس کے سرچشمے کو ایجاد کر لیا جو اس کے تجربے کی حدود سے باہر صرف مافوق الفطرت ہی کوئی شی ہو سکتی تھی اور اس نے اس سرچشمے کو ایک واقعی شخصیت کی صورت بھی دے دی۔ اس نے ایک نئی ہستی کی تخلیق کی، فرضی، طاقت ور، جس کے ساتھ اس نے تمام انسانی جذبات، غصہ، نفرت، حسد بھی منسوب کر دیئے۔

شاید یہی پہلا دیوتا تھا۔ غیر شعوری سعی کی بدولت وہ ایک ہی جست میں اپنے خالق کے قریب پہونچ گیا اور اپنے خدا داد ملکہ اور اس حیرت انگیز شرارے کی نظر کرم سے وہ اس قابل ہو گیا کہ کل کائنات کے خالق کے ساتھ ارتقاء میں شریک کار بن سکے۔ ابن آدم نے خود اس طرح ایک غیر حقیقی مگر ایک مہیب من گھڑت مخلوق پیدا کر لی۔ جب ہم اس واقعے پر غور کرتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ سچ ہے کہ میسٹوڈن[1] اور چیتے کی طرز زندگی اور انسان کی طرز زندگی میں کوئی معتدبہ فرق نہ تھا تو ہم اس غیر متوقع خلیج کے وجود میں آنے سے بے حد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو انسان اور حیوان کے درمیان حائل ہو گئی اور جو اس وقت کے بعد سے دن بدن گہری ہوتی چلی گئی۔ اس نظریے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانے کے لئے، کہ انسانی فہم سوائے جبلت کی توسیع کے اور کچھ نہیں، ہر کوشش جو کی گئی ہے اسے ناقابل عبور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور موجودہ واقفیت کی مدد سے دیانتداری کے ساتھ ان مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم کو یہ کہنے میں مطلق اس کا اندیشہ نہیں کہ ہمارے بیان

---

[1] ایک ہاتھی کی صورت کا جانور جو اب معدوم ہو گیا ہے۔ (مترجم)

ــــــــ کے متعلق غلط فہمی ہوگی۔ اب تک ناظر کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ ہم عبوری اقدام کی حقیقت سے کبھی انکار نہ کریں گے کیونکہ ان کے بغیر عملِ ارتقاء ناقابلِ فہم بن جاتا ہے۔ ہم نے جانداروں کی شکلوں کی تدریجی اصلاح اور ان کی سیرتوں کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن ہم نے موجودہ علم میں چند ایسے خلا بھی ظاہر کئے ہیں جن پر پُل باندھنا ممکن نہیں اور جن کی وجہ سے کچھ تعداد مظاہرِ فطرت کی ایسی ہے جن کو علت و معلول کے رشتے میں باہم مربوط کرنا ناممکن ہے۔ بدنی ساخت، عضویاتی وظائف اور نفسیاتی سرگرمی کے درمیان جو روابط ہیں ان کے متعلق ہمارا علم اتنا قلیل ہے کہ اس کی اساس پر ہم بعض اوقات جدید حیاتیاتی خواص یا وظائف کی علمی توجیہ نہیں کر سکتے۔ بلاشک، بطور مفروضے کے، یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جبلت اور حیوانی فہم ابتدائی منزلیں تھیں جو بالآخر ترقی کر کے انسانی ذکاوت بن گئیں۔ لیکن ہم کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ حیوانی فہم، مثال کے طور پر ذوات الثدی کا فہم، جبلت ہی کی بلا واسطہ شاخ ہے۔ یا یہ کہ انسانی ذہن کی تجریدی اور اخلاقی قوتیں ان دونوں میں سے کسی کے آبا کے لابدی حاصل ہیں یا ان دونوں کے اتحاد کا ثمر ہیں۔ ممکن ہے کہ جبلت اور حیوانی فہم آزاد ارتقائی تجربوں کا

نتیجہ رہے ہوں (حشروں کی حیرت انگیز اور قطعاً ممیز جبلت اسی نظریہ کو تقویت دیتی ہے) اور دونوں میں باہمی کوئی تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو بہرکیف ہمارے پاس کوئی ایک ثبوت بھی اس امر کا نہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی انسانی دماغ کی تمام عامل قوتوں کی سادہ شکل ہے۔ ہم کو یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جب کبھی بھی ہمیں کسی زندہ ہستی کے اسلافی رشتوں کو قایم کرنا ہوتا ہے تو ہم کو بہت سی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آسٹریلیا کے غیر مہذب قبائل اور بونے انسان ہیں مگر ان کی ذہانت نے کوئی ترقی نہیں کی۔ انکے سرچشمے کا ہم کو علم نہیں اور اسی طرح ہمیں سفید رنگ انسان کے ماخذ کا بھی پتہ نہیں جو نہ تو NEAN DERTHAL انسان کا خلف ہے اور نہ ہی CRO-MAGNON انسان کا۔ دماغ کے مخصوص خواص پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں ارتقاء کے پورے دورانِ عمل میں ایسے خواص کے یکبارگی ظہور کا سامنا ہو جاتا ہے جن کی علم معد و میات کے نقطۂ نظر سے کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ ہم صرف اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام باقی اعتبار سے تدریجی ارتقاء ہوتا رہا۔ چونکہ انواع کی بے انتہا تعداد بیچ میں سے معدوم ہو چکی ہے اس لئے انسان کے سلسلۂ نسب کو بالتفصیل مرتب کرنا ناممکن ہے

اور اس کی ذہانت کی مخصوص سیرتوں کے نقش پا کا کھوج لگا کر، پہلی نوع تک پہونچنا تو بے حد فرضی اور قابل اعتراض ہے۔

کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو جبلت ہمیشہ ہمارے ذہن میں ایک میکانیکی افادیت کا گمان پیدا کرتی ہے جو ہمیں فہم کے تصوّر کے متضاد معلوم ہوتا ہے۔ جبلتیں مقید کرتی ہیں۔ فہم آزادی بخشتا ہے۔ ہم ایک ایسی مکمل جبلت کا تصوّر باندھ سکتے ہیں جو موثرات کے عین مطابق ہے، لیکن ایک مکمل جبلت کے لئے اب آگے ترقی کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بعینہٖ ایسے ہی جیسے کسی ایسے جسم نامی کو جس نے ماحول کے ساتھ تعاون حاصل کر لیا ہے عمل ارتقاء کے جاری رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے برعکس ہم تصوّرات کی ترقی کی کوئی انتہا تصوّر نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ہم کوئی حدود تصوّر کریں بھی تو وہ ہماری موجودہ ذہنیت کی قائم کردہ ہونگی۔

اپنی کائنات پر دسترس حاصل کرنے اور اس کو سمجھنے کے لئے انسان کی پہلی کوشش کے لئے یہ امر ناگزیر تھا کہ وہ اسے جاہلی عقائد اور اشیاء پرستی کی صورت دے۔ اس کی جہالت بے اندازہ تھی اور وہ چاروں طرف سے نہ صرف ایسے خطرات سے گھرا ہوا تھا جن کو وہ اپنی قوت سے تسخیر کر سکتا تھا بلکہ ایسے بھی تھے جو ناقابلِ تسخیر تھے لیکن

ایک تخلیقی تصوّر اور تجریدی تخیل کی قابلیت اسے درکار رہتی جن کی بدولت وہ خالص خوف سے، جو از خود رفتہ اور بے دست و پا کر دیتا ہے، نکل کر ایک خیالی ہستی کا اختراع کرے جو ان خطرات کی موجد اور بانی سمجھی جائے یعنی وہ معلول سے علّت کی طرف جا کر علت کو شخصیت دے سکے۔ ایسے ہی کسی ظہور کی بابت کسی نہایت ترقی یافتہ حیوانی ذہنیت میں تلاش تخیل حاصل ہے۔ مردوں کی پرستش رسومات اور صنعت کارانہ تخلیقیں جو بعد میں ہوئیں یا ساتھ ہی نمودار ہوئیں اس نقطۂ نظر کی تصدیق کرتی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت کی رسوم کے سرچشمے کی توضیح ہوسکتی ہے اور یہ سرچشمہ طلوع انسانیت کے وقت میں ہی مل جاتا ہے۔ چونکہ انسان عناصر اور شہابوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اس نے ان سے مصالحت کرنے کی سعی کی۔ مذاہب نے ہزاروں برس تک اس مصالحتی سعی کو خونی قربانیوں کی شکل میں قایم رکھا۔ ایسی قربانیاں کچھ زیادہ برس نہیں گذرے کہ مختلف ممالک میں پائی جاتی تھیں ان نفرت انگیز قربانیوں کے خلاف، جو ہمیں ماضی بعید سے ورثے میں ملی تھیں، منظم جنگ نرم دل عیسائی مذہب کے فروغ کے بعد سے یعنی تقریبًا دو ہزار برس پہلے سے شروع ہوئی لیکن ابھی

تک اسے پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اس طرح پر توہمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو آغاز کا تعمیری اور جوہری طور پر جبدا پہلو یعنی انسانی روح کے جدید رجحان کی تجسیم کی پہلی بھدی کوشش جسے آگے چل کر مذہب کی صورت اختیار کرنا تھی، اور دوسرا تنزلی پہلو جس کی بدولت انسانی نسل کے ایک گروہ کے غیر مرتقی اور پسماندہ عناصر کا اس وقت بھی اپنی قدیم اور اکثر نفرت انگیز رسومات پر قائم رہنا جب کہ موجودہ تہذیب اور تمدن ان کے پیچھے سے نکل آئے ہیں اور ان پرانی جبلی تحریکوں کو جن کی اساس دہشت پر تھی روحانی شکل دے چکی ہیں۔ اپنے وجود سے ایک بنیادی ترقی کا آغاز کرنے کے بعد تو ہمات کا بعد کے زمانوں میں نمایاں ہوتے رہنا ایک خطرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

نفسیاتی عالم میں یہ مظہر ان مظاہر فطرت کے مشابہ ہے جو حیاتیاتی ارتقاء میں بھی اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اور اس سے ہمارے دعوے کو تقویت پہنچتی ہے۔ ناظر کو یاد ہوگا کہ بعض حالتوں میں (صفحہ او باب ۲) مطابقت ماحول کا عمل قانون ارتقاء کے متضاد تھا۔ ایسی دو نوعوں میں جن میں سے ایک نے مطابقت ماحول

حاصل کر لی لیکن وہ ارتقائی شاخ پر مشتمل نہ تھی اور دوسری وہ شاخ جو ارتقائی تھی مگر آنی طور پر مطابقت ماحول میں پیچھے رہ گئی۔ لاکھوں برس تک جنگ جاری رہ سکتی ہے یعنی جتنی مدت تک کہ موثرات اول الذکر نوع کے موافق رہیں گے اور جس دن بھی کسی ماحولی طبعی تغیر نے اس کو مار لیا یہ اپنی جگہ موخرالذکر نوع کے حوالے کر کے رخصت ہو جائے گی۔ اس کی ایک اغلب اور دلنشین مثال ارضی دور ثانی کے رینگنے والے جانداروں اور ابتدائی ذوات الثدی کی ہے جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی غیر معلوم مگر مشترکہ خاندان سے نکلے تھے لیکن آگے ان کے ارتقاء کی راہیں الگ ہو گئیں۔ ابتدائے کار میں ڈنوساروں کو فوقیت حاصل تھی جس کا ثبوت ان کی دیو ہیکل صورتیں ہیں لیکن تقریباً ڈیڑھ کروڑ برس بعد ارضی دور ثانی کے اختتام کے قریب، جب موسموں کا آغاز ہوا، تو جن حیاتیاتی خواص نے رینگنے والے جانوروں کی امداد کی تھی وہ بے اثر اور نقصان دہ ہو گئے اور ذوات الثدی کی ارتقائی شاخ نے، جس کے لئے حالات اب سازگار رہے، ان خلاف فیشن عجیب الخلقت حیوانوں کے خلاف جنگ کر کے کامیابی حاصل کی۔ ایک تو خشک موسم گرما اور شدید موسم سرما

کے شکار ہو کر ڈنوسار جان دے بیٹھے اور کچھ تباہی ان کے انڈوں
پر آئی۔ موسموں نے جو ضعف ان میں پیدا کر دیا تھا اس کی وجہ
سے وہ ان بے شمار چھوٹے چھوٹے جانداروں کا جو اپنی سمور کی
وجہ سے موسم کی گرمی سردی سے محفوظ تھے، اور جو ان کے نرم چھلکوں
والے انڈے کھا جایا کرتے تھے، مقابلہ نہ کر سکے اور یوں ان کی نسل
صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ یہ نا مساوی جنگ مدتوں چلی لیکن بالآخر
ذوات الثدی اس میں کامیاب ہوئے۔ یہ بہتر خواص کے حامل تھے
اور سلسلۂ ارتقا کو آگے چلانے کے زیادہ اہل تھے۔

توہمات کا وجود پہلے پہل تو ایک ذہنی ردِ عمل کے ظہور کے
طور پر ہوا، جو نقطۂ آغاز بننے کے لئے اساسی طور پر اہم تھا گیا ہستان
میں جس طرح آگ اوپر کی سطح پر تو بڑی تیزی سے پھیلتی ہے لیکن
جیسے جیسے وہ پھیلتی جاتی ہے بدہیئت ہوتی جاتی ہے ویسے ہی انسان
بھی جتنا کم مرتقی ہوتا ہے اتنا ہی وہ مہیب طرزوں کی نشوونما کرتا ہے۔
قدیم ترین انسانوں میں ضرور اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہوگی
جن کی نفسیات بہت ہی خام ہوتی ہونگی تاہم چند تبدل نوعی
کرنے والے افراد نے اپنے آپ کو اکثریت سے علیحدہ کر لیا ہوگا اور
ہمیشگی کے ساتھ انحراف کرنے والی سمت میں اپنی ارتقاء کو چلا کر

خالص مذہبی تفکر حاصل کر لیا ہوگا۔ کچھ مدت کے بعد اس مرتقی گروہ اور اس پسماندہ جم غفیر میں جدو جہد کا آغاز ہوا جس نے ترقی کی راہ چھوڑ دی تھی۔ اب اول الذکر گروہ کو اکثریت کی نا معلوم تعداد کی طاقت اور مکروہ توہمات سے جو صدیوں میں بدتر حالت پر پہنچکر خطرناک ہوگئی تھیں، بہت ڈر لگتا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان دونوں جماعتوں کا ماخذ ایک ہی تھا دونوں کے خیالات ایک سے نہ ہوسکے۔ جم غفیر کی توہمات پر درندوں کی جبلتوں کا غلبہ تھا اور توہمات اور جبلتوں نے متحد ہو کر اشیا پرستی کے خونخوار مظالم کو جنم دیا۔ برگزیدہ گروہ نے، یعنی مرتقی شاخ نے، مذہبی جذبات کو جنم دیا لیکن ایسی زبان میں جو جم غفیر کے لئے نا قابلِ فہم تھی۔ عقلی اور روحانی اوزار جاہلی تشدّد کے خلاف بے کار رہیں۔

صدیوں سے ہمیشہ مذاہب کو توہمات کے خلاف جنگ کرنا پڑ رہی ہے یہ ایک ایسا دشمن ہے جو اس وجہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ انسانی ذہن سے اس کی علیحدگی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی ہر قسم کے توہمات کی اشاعت صداقت یا عقلی عقائد کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ہو رہی ہے کیونکہ غیر مرتقی ذہن ابھی تک اکثریت پر مشتمل ہیں۔ یہ موہوم خیال کہ عقلی تفکر نے وسیع

اشاعت حاصل کرلی ہے اکثر اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ عقلی تفکر خود ایک قسم کے توہمات میں مبدل ہوگیا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بنی نوع انسان میں سائنس کی عظمت بھی ایک توہمات ہی کی قسم ہے۔ مذاہب کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ ذی فہم لوگوں اور عوام دونوں پر اپنا اثر قایم کریں لیکن ان کی زیادہ مشغولیت اسی پر مبذول رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کو مذہب سے وابستہ کریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا جنہیں توہمات مستحکم اور پیوست تھیں۔ دشمن کی قوت اتنی تھی کہ بہت سی صورتوں میں کلیسے اس پر مجبور ہوگئے کہ گو نو مریدوں کی سب توہمات پر تو صاد نہ کریں۔ مگر کم از کم اتنی روا داری تو برتیں کہ ان کی بعض ہلکی توہمات کو قبول کرلیں اور ان کی صورت بدل کر عوام کے جبری رجحانات کی رہبری اس طرح کریں اور ان کو ایسے راستوں پر ڈال دیں جو کم مضرت رساں ہوں۔ کیتھولک مذہب نے، جس کا جنم بحیرۂ روم کے ساحلوں پر ہوا جہاں قوتِ تخیل ولولہ انگیز ہے، بعض توہماتی اعمال کو قبول کرلیا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ ایک قادر مطلق مگر رسائی سے باہر خدا کی پرستش کے مقابلہ میں ایک انسانی دیوتا، قابلِ تصور خدا کی پرستش کے دلوں میں قایم

عقیدے کے بہت سے ثبوت اس پتھر کی مورت کے انگوٹھے میں عیاں ہیں جسے عبادت گذاروں اور سائل پرستاروں نے اپنے ہونٹوں سے چوم چوم کر گھس ڈالا ہے۔

جن مشکلات کا کلیساؤں کو مقابلہ کرنا پڑا ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں عیسائیت کے ابتدائی زمانے پر نگاہ ڈالنا مفید مطلب ہوگا۔ بحیرۂ روم کا پورا "تاس اعلیٰ درجے کی ثقافتی ترقی کا حامل تھا۔ بلند پایہ تمدن وہاں پھلے پھولے اور مٹ گئے۔ لیکن کلیتًا ان کے اثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کی اقتصادی اور فوجی طاقت باقی نہیں رہی تھی اور ان کے بڑے بڑے فن کار، فلسفی، اور دستکار، جو ہمیشہ دورِ اقبال ہی میں پھلتے پھولتے ہیں، شاہی خاندانوں اور حکومتوں کے اقتدار کے ختم ہوتے ہی زوال میں آگئے تاہم بعض روایات جو اساسی انسانی ضروریات، اعتقاد رکھنے اور پوجا کرنے کی ضرورت، مذہبی حس وغیرہ کی حامل ہیں وہ عوام میں گہرا نفوذ کرچکی تھیں اور جڑ پکڑ چکی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر عوام کا "مذہبی داغی وہم" RELIGIONS COMPLEX جس کا ظہور اکثر و بیشتر توہمات اور اصنام پرستی ہی میں نمودار ہوتا ہے" تمام پرانی دیوتاؤں کو، ان کے ماخذوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اپنا لیا تھا

ان کو مزین اور ملتف کرکے اپنے ذوق اور عادات کے مطابق ڈھال لیا تھا اور ان کو مضبوطی سے باہم پیوست کرکے اتنا ٹھوس بُت بنا لیا تھا کہ اگرچہ سلطنتیں خاک میں مل گئیں مگر یہ توہمات کا بُت عوام کی عام گرویدگی کے سہارے ہر نئی تحریک کا مدِمقابل بن گیا۔

کسی ملک کی آبادی کا بہت ہی کم حصّہ، یقیناً ایک فی صدی سے بھی کم، فن، غور و فکر، ثقافت، صنعت اور ہر اس شے میں جو ہماری نظر میں کسی تہذیب کو شرف و امتیاز بخشتی ہے، کوئی نمایاں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارے زمانے کے مقابلے میں عیسوی دور سے پہلے کے لوگوں پر یہ رائے اور بھی صادق آتی ہے۔ انسانی ترقی کے خارجی مظہروں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے زیادہ عرصہ درکار نہیں ہوتا کیونکہ وہ افراد کی ذاتی اہلیتوں، انفرادی صلاحیتوں آنی موثرات کے نتائج ہوتے ہیں اور انسان کے غائر ارثی، شماریاتی رجحانات کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ہر نومولود ارثی طور پر توہمات کا جرثومہ ساتھ لاتا ہے اور ان بچوں کی تعداد جو ورثے میں اپنے ساتھ تخلیقی قوت، یا اعلےٰ ذہانت کی نعمت لاتے ہیں بہت شاذ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مذہبی جذبے کا عام معنوں میں، اور اپنی قدیم توہماتی شکل میں، سرچشمہ اتنا ہی

قدیم ہے جتنا کہ ضمیر کا۔ کوئی انقلابِ عظیم، خواہ اس کا منبع انسانی ہو یا مادی، ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا بلکہ اُلٹا اس میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ناگہانی واقعات، المیئے، تدریجی انحطاط، جو کسی شاندار تہذیب کے گنے چُنے چند صد اشخاص پر اثر انداز ہو جاتے ہیں، اس تہذیب کے لئے مہلک ثابت ہو جاتے ہیں لیکن کروڑوں انسانوں کے جدّی رجحانات پر اتنے ہی غیر موثر ثابت ہوتے ہیں جتنا ان کی عضویاتی ضروریات پر۔ اور قوم تو اسی کثرت کا نام ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ توہمات ہی، جو روایات کے ذریعہ منتقل ہوتی ہیں اور ارتقار کا انسانی اوزار ہیں، ترقی کی راہ میں آڑ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پھر آج ایک بار اس حیرت انگیز مظہر کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ ارتقار کے ایک عنصر کو وقت نے ایک سدِ راہ میں مبدل کر دیا ہے جس کا مقابلہ نئے عناصر کی مدد سے کرنا ضروری ہے۔ یہی وہ دوامی قانون ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ جد و جہد کا اصرار کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے۔

اس زمانہ میں جب عیسائی مذہب نے جنم لیا، مذاہب ابنِ آدم سے کچھ زیادہ مطالبہ نہیں کرتے تھے اور کوئی شخص بھی خواہ وہ ملحد ہی کیوں نہ ہو وہ جیمز کی دی ہوئی مندرجہ ذیل سادہ مگر شاندار

مذہب کی تعریف پر اعتراض وارد نہیں کرسکتا (بنیا عہدنامہ جیمز کا عام خط باب اول آیت ۲۷)

"تمہارے خدا اور باپ کے نزدیک خالص اور بے عیب دین داری یہ ہے کہ یتیم اور بیوہ عورتوں کی مصیبت کے وقت خبر گیری کی جائے اور اپنے آپ کو دُنیا کی طمع سے بے داغ رکھے۔"[1]

افسوس ہے کہ دُنیا ابھی ایسی تعلیم کے لئے تیار نہیں اور کلیساؤں کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ ایک بے مثل روایت کے محافظوں کی حیثیت سے، اور اپنی ذمہ داری کے احساس کی بدولت، ان کا پہلا فرض یہی تھا کہ صبر و تحمل سے کام لیں اور اس روایت کو زندہ رکھیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی قیمت پر بھی کام چلائیں اور یہ قیمت اتنی گراں تھی کہ بعض اوقات وہ اس پر اس قیمت کو

---

[1] (از مترجم) اس سے زیادہ مکمل نقشہ قرآن پاک نے ان آیات میں پیش فرمایا ہے" لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ (باقی اگلے صفحہ پر)

ادا کر کے، سمجھوتہ کر لینے میں مدتوں شامل رہے لیکن ہوا یہی کہ جدی خرافات کے ناقابل مزاحمت سیلاب میں وہ بہہ گئے اور مصالحت کر لی۔

حضرت عیسٰے علیہ السلام کی بعثت عین وقت پر ہوئی۔ کیونکہ ابن آدم کو اس کی ضرورت تھی کہ کوئی انسانیت کا حد درجے مکمل نمونہ جس میں پورا ایثار و قربانی کا جذبہ ہو آئے اور انسانوں کے اندر روح پھونکے تاکہ ان میں اپنے آپ کو سدھارنے کا ولولہ پیدا ہو اور وہ یہ تمنا کریں کہ کسی نہ کبھی دن وہ اس کی مانند بن سکیں گے۔ لیکن وہ چنگاری جس کا نام یسوع تھا اس عظیم سوختنی ڈھیر کے، جس کو صرف آگ ہی پاک کر سکتی تھی، ایک نہایت ہی خفیف حصے میں آگ سلگا سکا۔ اور جو دنیا کو روشن اسی دن کر سکے گی جب وہ پوری طرح بھڑک اٹھیگی۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) بعہدھم اذا عٰھدوا والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون ۵ (سورہ بقر آیت ۱۷۷)

تمہارا مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا کوئی بڑی نیکی نہیں ہے کامل مومن وہ ہے جو اللہ، روز آخرت، ملائکہ، آسمانی صحیفوں اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اللہ کی محبت کی وجہ سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور نیز غلاموں کی آزادی کیلئے اپنا مال خرچ کرے نماز کو قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب کوئی عہد کریں تو اسکو پورا کریں تنگی بیماری اور جنگ میں صبر سے کام لیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے قول کے سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

ابتدائے کار میں اُن کے حواریوں کے لئے یہ لازمی تھا کہ ایندھن کے خشک ہونے تک وہ کمزور شعلے کو قایم اور محفوظ رکھیں۔ اُن کی تعلیم اتنی سادہ مگر اتنی غامض تھی کہ وہ ایسی دُنیا والوں کو متاثر نہ کرسکی جن کو آج دو ہزار سال بعد بھی ان کی رنگین تصویریں دکھلانے کی کی ضرورت ہے۔ ابھی تک اس دُنیا کا طفلی کی حالت سے نکلنے کا زمانہ دور ہے۔ ابھی وہ مصوّر کتابوں سے دل بہلانے کی منزل پر ہے۔ کیا کوئی کلیسا کو الزام دے سکتا ہے کہ وہ کبھی کبھی کسی اور افسانے کی مورتیں مستعار لے کر اپنے افسانے میں شامل کر لیتا ہے؟

تمام قصص و روایات کا، خواہ وہ انسان کے زمانہ جاہلیت سے متعلق ہوں یا مذہب سے، سرچشمہ وہی اُمنگ ہے جو اسے اس غیر مادی دُنیا کی طرف لے جانا چاہتی ہے جس میں نیکیاں اور بدیاں دونوں بڑھا چڑھا کر اور علامتی طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان قصص و روایات نے اپنی متنوع صورتیں، ماحول سے، آب و ہوا سے، اور ان خواص سے مستعار لیں جو وقتی موثرات نے اس کے تخیل پر عائد کیں۔ کئی ہزار برس کے دوران میں ان میں تبدیلیاں کی گئیں، ان کو سنوارا گیا، یا ان کو اور بدہیئت بنا دیا گیا۔ اس یکتا اُمنگ کا نقش پا جس نے ان روایات کو جنم دیا بغیر کسی زحمت کے چار دانگ عالم کے

کل مذاہب میں مل سکتا ہے۔ ارباب فکر کی یک جدی روحانی قرابت اسی یکتا آہنگ کے اندر مضمر ہے۔ بعض اوقات یہ قرابت بعید معلوم ہوتی ہے لیکن مذاہب کو چاہیئے کہ ابتدائی حقیقت کی یکسانگی کو جو صدیوں کے متوالی اضافوں کے نیچے دم توڑ رہی ہے، نکالیں اور اس کی تصدیق کریں۔ مذاہب کی وحدت اس چیز میں تلاش کرنا چاہیئے جو ربانی ہے یعنی دنیائے انسانیت میں عالمگیر ہے اور اس شئے میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے جو انسان نے عقائد میں داخل کردی ہے۔

(۱۳)

مذہب۔ حقیقی مذہب قلب انسانی میں ہے۔

جیک لنڈن (JACK LONDON) کے ممتاز ناول میں جو کیفیت "کتے" کی دکھائی گئی ہے وہی کیفیت ابنِ آدم کی ہے "ایک طرف وحشی پن اس کو دعوت دے رہا ہے" اور "دوسری طرف انسانیت دعوت دے رہی ہے" اور وہ عالم کشمکش و پیچ میں ہے۔ کتا اگر پہلی دعوت کو قبول کرلے تو وہ صرف ایک جذباتی غلامی کو خیرباد کہیگا اور اپنی جدی جبلتوں کی زیادہ قوی دعوت کو قبول کرلے گا۔ آہیں نہ اس کا کوئی ہبوط ہے اور نہ کوئی دغا۔ کیونکہ اس کا ارتقاء منقطع ہوچکا ہے۔ اس کے مقدر میں تو کتا ہونا ہی ہے یعنی ایک ایسا حیوان جو انسان کے ساتھ پرجوشی کے ساتھ مانوس ہوجاتا ہے اور اپنے دیوتا (یعنی انسان۔مترجم) کے لئے انتہائی محبت اور وفاداری کے ثبوت پیش کرنے کے قابل ہے۔

جب انسان تامل میں پڑتا ہے کیونکہ اسے اپنے جسم کی دعوت صاف، سادہ، اور فطری معلوم ہوتی ہے تو وہ آسانی سے اپنے آپ کو یقین دے لیتا ہے کہ کوئی فعل جو ان صفات سے متصف ہو بد ی نہیں ہو سکتا۔ بعض مادی عقائد نے ان مبتدیانہ دلائل کو تسلیم کیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ یہ اندازِ فکر تو انسان کو پھر اسی غلامی کی طرف لیجا رہا ہے جس سے وہ بتدریج آزادی حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ دوسری سبیل (یعنی انسانیت کی دعوت۔ از مترجم) اس کو غیر ضروری طور پر کٹھن معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسے غیر انسانی سمجھتا ہے، حالانکہ وہ ہی اس کے لئے بہت زیادہ انسانی ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کیوں وہ ایسے داعیئے کی خاطر، جو مذہب سے باہر، نہ تو صاف، اور سادہ ہے اور نہ فطری، اپنے "فطری" رجحانات اور خواہشات سے دست بردار ہو جائے۔ اگر وہ یقین سے محروم ہے یا انسانی عظمت کے جبلی جذبے کی دولت اس کے پاس نہیں تو وہ زیادہ دیر تک و پنج میں نہیں رہتا۔ وہ پھر قوتِ اختیار کو بھی خیر باد کہہ دیتا ہے، وہ مہرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، وہ اپنی جبلتوں کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، وہ ہوا و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے اور عملِ ارتقا سے اپنے آپ کو خارج کر لیتا ہے۔ اگر خیر و شر کا احساس اس کے پاس ہے اور

وہ دانستہ شر کو اختیار کرتا ہے تو وہ انسانیت سے دغا بازی کرتا ہے
بلا ریب ہم ارتقا کے موجودہ مرحلے میں جتنی بھی سخت گیری
سے کام لیں وہ حق بجانب ہے۔ ہم ایسے تبدلات کے آغاز پر ہیں
جو ایک اعلےٰ انسانی نسل کے جنم پر منتج ہوں گے اور جس کے حصول
کے لئے صدیوں کی لگاتار کوشش کی ضرورت ہوگی۔ ہم کو یہ حقیقت
فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ انسان کامل کا تصور از قبیل خرافات نہیں
وہ یسوع مسیح کی شخصیت میں وجود میں آچکا ہے۔ اور بھی ایسی مکمل
ہستیاں ہو گذری ہیں، بعض رسول اور شہدا۔ لیکن ان کی تعداد
انسانوں کی لا انتہا تعداد کے مقابلے میں بے انتہا کم رہی ہے اور
اصلاح اس جم غفیر کی مطلوب ہے۔ یاد ہوگا کہ ہم نے ایسے کامل
انسانوں کو "عبوری صورتوں" سے تشبیہ دی تھی جو لاکھوں برس قبل
وجود میں آکر ایسی مستحکم نوع کے پیش از وقت ورود کی منادی کرتی
ہیں جس کے مقدر میں کرۂ ارض پر چھا جانا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ گو
روایات کی مرحمت سے عمل ارتقا کی طوالت بہت کچھ کم ہو گئی ہے
اب بھی مدتوں یہ عمل چلے گا اور اس مستقبل کے عرصے کو کم کرنے کے
لئے انفرادی امداد کی ضرورت ہے جو اپنے ہمعصروں کو بہتر بنانے
میں صرف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم سب اپنے آپ کو مبلغ خیال کریں اور

تبلیغ کے فریضے کو ادا کریں تو یہ آخری ارتقائی تبدیل اور بھی جلد نمودار ہو سکے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ منزل مقصود اور چشمہ بقا سامنے آ گئے۔

آئندہ صدیوں کے دوران میں جو سعی کی جائے گی اس سے انسان بتدریج ان اعلےٰ مسرتوں کی قدر کرنے کے قابل ہوتا جائیگا جو خالص انسانی صلاحیتوں سے حاصل ہونگی یہاں تک کہ وہ دن بھی آ جائے گا کہ اسے اپنی موجودہ مسرتوں سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔

نفسانی خواہشات سے ہماری وابستگی، جو ہمارے حیوانی منبع کی یاد تازہ کرتی ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی ہم انسانی ارتقا کے نقطۂ آغاز پر کھڑے ہیں۔ یہ امر کہ ہم میں سے بعض انسانوں نے عضویاتی غلامی کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اس کا پتہ دیتا ہے کہ ہمارے اندر کوئی اور چیز وجود میں آ گئی ہے۔ بلند مرتبہ آزادی کا وجود، جو انسان کے لئے مخصوص ہے اور جو اسے اس کی روحانی مقدر پر قدرت بخشتا ہے، صریحاً اس کی غلامی کی زنجیریں توڑ کر نکل بھاگنے کے ارادے سے ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ خواہش کسی اور جاندار کے دل میں اب تک موجزن نہیں ہوئی۔ یہ امر

اس کے مقدر کے وجود اور حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ ابن آدم اس سخت گیر طبعیاتی کیمیاوی جبریت کے حکم کی اب تعمیل نہیں کرتا جو اس کے درجے کو گھٹا کر اسے ایک غیر ذمہ دار نا قابلِ امتیاز ایسے ذرے کا مقام دینا چاہتی ہے جس کی انفرادی حیثیت ایک چیونٹی یا جرثومہ سے زیادہ نہیں۔

اگر انسان نے اس حق کا استعمال نہ کیا جو اسے بخشا گیا ہے، اگر اس نے اپنے فریضے کی اہمیت کو نہ سمجھا تو وہ اپنے سابق بھائیوں کی طرح اندھا دھند اپنی نوع کی افزائش ہی میں لگا رہے گا۔ اس میں اور اس کے اسلاف میں صرف صوریاتی خواص کا ہی فرق ہے اور جو مشکل کام اس کے ذمّے ہے وہ صرف آدھا ہی ختم ہوا ہے۔ ابھی اس کو صحیح ابن آدم کہلانے کا حق حاصل نہیں ہوا۔ ابھی تو اس کا وجود شماریاتی اعتبار سے ہے۔ جب تک اسے اپنی سعی کی قدر کا یقین پیدا نہ ہوگا وہ ایک غیر مرتقی عنصر ہی رہے گا۔

یہ سعی کی قدر کا تصوّر کوئی نئی شے نہیں۔ یہ عیسائی مذہب میں ہم کو ملتا ہے۔ مذہبی روح ہمارے اندر ہے۔ یہ روح مذاہب سے پہلے ہم میں نمایاں ہوگئی تھی۔ اب مذاہب اور عارفانِ مذاہب

کا کام اس پر مشتمل ہے کہ وہ اس روح کو بیدار کریں، اسکی رہنمائی کریں اور اس کو پختہ تر کریں۔ یہ متصوفانہ اُمنگ جوہری طور پر خاصۂ انسانی ہے۔ یہ اُمنگ ہماری روح کی تہہ میں خوابیدہ ہے اور اس واقعہ یا مناسب انسان کی منتظر ہے جو اینزائیم[1] (ENZYME) کی طرح عمل کرکے اس کو خالص تصوّف راسخ اعتقاد میں متبدل کر دے۔ اس سے اس شکل کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کیوں ایک رسالت کا جھوٹا دعویدار اور جھوٹے عقیدے بھی عوام میں بجلی کی رَو پیدا کر سکتے ہیں اور ان میں اتنی ہی پرجوش عقیدت، اتنی ہی جواں مردی اور اتنی ہی جاں نثاری ابھار سکتے ہیں جتنے سچے پیغمبر۔

ایک سچّے خدا کے نبی اور ایک کاذب نبی میں امتیاز کرنا کس طرح ممکن ہے؟ اس کا معیار یہی ہے جو ہم نے پیش کیا ہے کاذب نبی ایسی عقائد کی تبلیغ کرے گا جو عمل ارتقار کے خلاف ہوں گے، یا اس کو نظر انداز کرتے ہوں گے۔ ایسے عقائد جو انسانی عظمت اور آزادی

---

[1] (از مترجم) ENZYME ایسے نامی مادّوں کو کہتے ہیں جو پیچیدہ طور پر ایسے ردِعمل اجسام میں پیدا کر دیں جو ان کے بغیر ممکن نہ ہوں۔ جیسے مثلاً تخمیر۔

کی قدر کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے۔ ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ فرد کے لئے بلا لحاظ علت ستی ہی اصل شے ہے۔ ہم ترقی تو اسی چیز کی بدولت کر سکتے ہیں جو ہمارے اندر ہے۔ عجیب عجیب قسم کے مذاہب نے ایسے مذہب جن پر کامیاب تنقید ہو سکتی ہے، بلکہ اشیاء پرستی کے قائلوں نے بھی، ایسے ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جنہوں نے ان عقائد کے لئے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ ان شہیدانِ وفا نے ایسے مذہب کے لئے جان دی جو سب انسانوں میں مشترک ہے اور اگر ان کے باطنی جوش و خروش سے[1] پیچھے شیوں نے فائدہ نہیں اٹھایا یا ان کی رہنمائی نہیں کی تو اس میں اُن کا کیا قصور۔ ان سب نے اپنی جانیں اسی نصب العین کی خاطر قربان کیں جن کی جڑیں ان کے قلوب کے اعماق میں تھیں یعنی خدا کے لئے۔ وہی واحد ذات جو ان کی اور ہماری خالق ہے۔ اسی وجہ سے ہر مذہبی رسم کا، خواہ وہ کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہم کو معلوم ہو، احترام کرنا چاہئے۔ یہ احترام اس رسم کا نہیں ہوگا بلکہ اس خلوص کا ہوگا جو رسم کو ادا کرنے والوں

---

[1] لفظ (ENTHUSIASM) ہم نے بالقصد منتخب کیا ہے یونانی میں EN (IN) اور THEO (GOD) : یعنی الفاظ دیگر اندرونی خدا ۔۔۔ (مصنف) ہم نے اس کا ترجمہ باطنی جوش و خروش کیا ہے (مترجم)

کے دلوں میں ہے۔ مذہب تو فقط ایک بہانہ ہے جو انسان کو اپنے اندر اُس عالمگیر جذبے کی نشو و نما کرنے کے قابل بناتا ہے جو اُسے حیوان سے ممیز کر کے اپنے خالق کے قریب لاتا ہے گو بسا اوقات یہ جذبہ گڈمڈ اور غیر واضح ہوتا ہے۔ ہر مذہب اور ہر معبد و مندر سے بے تعلق ہو کر بھی مذہبی روح کا اس دنیا میں وجود رہا ہے یعنی ایمان لانے کی خواہش، بے قید پرستش کا ولولہ، پورے احترام کے ساتھ کسی چوکھٹ پہ عجز و نیاز کے ساتھ سر جھکانے کی تمنا[1]، ایک قابلِ تصور مگر غیر دسترس پذیر مطمحِ نظر کے قریب سے اپنی قدر افزائی کی اُمنگ، اسی مذہبی روح کے کرشمے ہیں۔ اسی اُمنگ کا سرچشمہ ربانی ہے کیونکہ یہ عالمگیر ہے اور سب انسانوں میں یکساں ہے۔ اس کے برعکس مذاہب، عقیدے اذعانی اصول، لاتعداد اور متنوع اکثر غیر روا دار، انسانوں کے ذہن کی پیداوار ہیں اور انسانی مُہر کا نقش نمایاں ہے۔

ایک رئیس کلیسا، ڈاکٹر ولیم ٹمپل، کینٹر بری کے اسقف اعظم انگلستان کے سب سے اونچے پادری نے یہ امر تحریر کر کے جرأت

---

[1] (از مترجم) بندگی کیشم تمیز کعبہ و دیرم کجاست — دیدہ ام ہر جا درے، پیشانی مجروح سے کردہ ام

(مترجم)

سے کام لیا ہے ؛ "یہ خیال کرنا کہ خدا کو صرف، یا زیادہ حد تک تعلق خاطر مذہب ہی سے ہے بہت بڑی غلطی ہے"۔

مذاہب صورت ہیں، مسلک کے مادی جذبات ہیں، اور علامات کی انسانی تاویلات ہیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ خدا کی ہستی پر، نیکیوں پر اور اخلاقی ضابطوں پر سب متفق ہیں۔ صفائے باطن، نیکی اعمال، اعتقاد ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جن کا تسلّط ہونا چاہیئے۔ لہٰذا کسی ایسے عقیدے پر، جو مادّی غیر متیقن احوال سے خلاصی حاصل کر لیتا ہے اور ایک فوق الفطرت نصب العین کی طرف اپنی بے لوث سعی کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے، حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ انسانوں کو اس بات کی تلقین کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنے داخلی مدرکات کی نشو ونما، باطن کی پاکیزگی، اپنی اصلاح کرنا، اور اس مکمل نصب العین کے قریب پہنچنا جس سے مراد مسیح علیہ السلام ہیں[1] زیادہ اہم چیزیں ہیں۔ بقیہ سب چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں

---

[1] (از مترجم) کاش مصنف کی نگاہِ تحقیق رحمۃ اللعالمین کے اسوۂ حسنہ تک بھی پہونچ سکتی جس نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی "لا تثریب علیکم الیوم" کا مژدہ جاں فزا سنایا۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک تو مسیح علیہ السلام کو بھی قرآن پاک نے وجیہاً فی الدنیا والآخرۃ و من المقربین فرمایا ہے اور وہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہمارا مذہب کچھ بھی ہو ہم سب کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی وادی کے قعر میں کھڑے ہوں اور سامنے والے پہاڑ کی درخشندہ برف آگیں چوٹی پہ چڑھ جانے پر تلے ہوں جو سب میں سربرآوردہ ہے۔ ہم سب کی نگاہ ایک ہی مطمح نظر پر لگی ہوئی ہے اور اس پر ہم سب کا اتحاد ہے کہ ایک ہی قلۂ کوہ پر پہونچنا ہے۔ البتہ بدنصیبی سے راستے کے انتخاب میں اختلاف ہے۔ ہادی آگے بڑھتے ہیں اور ہم ان کی پیروی کرتے ہیں۔ کچھ ایک راستے پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ دوسرے راستوں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ سب کا ایمان یہ ہے کہ ان کا منتخب کردہ طریق بہترین ہے۔ اپنے اپنے راستوں پہ چل کر ہم ایک ہی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ لیکن جب یہ مختلف جماعتیں جو علیحدہ علیحدہ نقاط آغاز سے چلی تھیں، اب بجائے مقصد کے حصول پر متحد ہو جانے کے، ان کی سعی یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قائل کریں کہ صراطِ مستقیم کی دریافت انہیں کا حصہ ہے اور بعض اوقات ایک دوسرے کو سب وشتم کرنے اور ایک دوسرے پر پتھر پھینکنے پر اتر آتے ہیں۔ تاہم ان کو یقین ہے کہ اگر انہوں نے اپنی چڑھائی جاری رکھی

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) ایک کامل انسان ہیں۔ حدیث نبیؐ انا اولی الناس بعیسٰی ابن مریم فی الدنیا والآخرہ۔

تو وہ قلہ کوہ پر سب ضرور پہونچیں گے اور طریق سفر کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔

اگرچہ خارجی موثرات کے زیر اثر آب و ہوا کے اختلافات کے زیر عمل، خطہ بود و باش، قومیت اور روایات کی مطابقت میں مذاہب کا اپنی شکلوں میں باہم اختلاف ہے لیکن کل مذاہب ایک ہی جیسے آفاق گیر ضابطے کے تحت میں آراستہ و پیراستہ نظر آتے ہیں جس کا سرچشمہ ماورائے فطرت ہے اور ان کا وجود ایک ہی علت پر مشتمل ہے باہمی ناروادارئ اور تعصب کم فہمی کا ثبوت ہیں۔ صاحب بصیرت انسان ایک معقول اساس کو تلاش کرتا ہے لیکن جم غفیر جذبات ہی سے مطمئن ہو جاتا ہے اور جبلی طور پر ان اشخاص کی طرف اپنا رخ کر لیتا ہے جن کے متعلق اس کو یہ اعتبار پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ رہنمائی کرنے کے اہل ہیں بعینہٖ ایسے ہی جیسے ایک ریوڑ چرواہے کی رہنمائی کی پیروی کرتا ہے۔ اگر یہ سمت خراب یا مضر نکل آئی تو ریوڑ کی مصیبت ہے۔ جم غفیر کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ اہم شئے پیروی کرنا نہیں بلکہ انفرادی سعی ہے اور رہنماؤں کے لئے یہ ذہن نشین کرنا لابدی ہے کہ افراد کو ذاتی سعی پر دسترس حاصل کرانا ان کا فرض ہے۔

وہ لوگ جو اپنے ایمان کی پرورش کے لئے اپنے قلب سے ضروری
عناصر بہم پہنچاتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے دستور العمل پیدا کرتے ہیں
وہ خوش نصیب ہیں۔ ان کو اس کتاب کی ضرورت نہیں اور یہ ان کے
لئے لکھی بھی نہیں گئی۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی عقلی اعلا
(العقل) ان کے جذباتی اور مذہبی نفوس سے ہم آہنگ نہیں۔ اس
وجہ سے وہ غیر مطمئن اور محزون ہیں یہ کتاب انہیں کے نام معنون ہے۔
بہت سے ذہین اشخاص عالم بے چارگی میں گرفتار رہیں۔ انکے
قلوب مشوش اور بے جواب سوالات سے معمور ہیں۔ ان میں یا تو اتنی
جرأت ہی نہیں رہی کہ وہ ان سوالات کی وضاحت چاہیں یا وہ
ان لوگوں سے مشورہ کرتے ہیں، جو اگرچہ نااہل ہوتے ہیں، لیکن اپنی
اخلاقی سیرت یا محض اپنی پیشہ ورانہ دیانت کی وجہ سے ان کے قلوب
میں اعتبار پیدا کر لیتے ہیں۔ اور موخر الذکر لوگ اپنی نوبت پر بے فائدہ
اپنے اندر جوابات تلاش کرتے ہیں اور پھر سب یا تقریباً سب، ان
بچوں کی طرح جو رات کی تاریکی میں جنگل میں راستہ بھٹک گئے ہوں
اور جبلی طور پر ہر جانب اس امید میں ہاتھ پھیلا رہے ہوں کہ کوئی
مددگار ہاتھ پکڑ لے، رنج و غم سے معمور زندگیاں بسر کرتے چلے جاتے ہیں
سائنس کی عظمت و اقتدار سے مرعوب یا مغرور، اور غیر شعور لوگوں نے

اس دعوئے باطل کی آڑ لے کر کہ جس روحانی نور نے زمانہ ماضی میں انسانوں کی رہنمائی کی تھی وہ غیر حقیقی تھا، شمع حقیقی کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے، مبہم علامات پر حاوی غیر شفاف پردے نگاہوں کے سامنے کھڑے کر دئے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ سائنس کے کمالات ایک انسانی سمت کی تعیین کر رہے ہیں جو اہمیت کی حامل ہے اور یہ کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رہا اس شمع ہدایت کا معاملہ وہ ان کے حیطۂ عمل سے ماوراشے ہے۔ مطلق جبری عقیدے اور سلسلہ علّت و معلول کے ماہر (اگرچہ علت و معلول کا عقیدہ بعد کی علمی ترقی سے بہت کچھ محدود ہو گیا ہے) بغیر کسی ثبوت کے ایسی علّت کے منکر ہیں جو معرضِ بحث میں نہ آسکے۔ کیوں کہ سائنس دانوں کی یہ چھوٹی سی جماعت، جزوی علم کے خمار میں، تکبّر آمیز طریقے پر یہ رائے رکھتی ہے کہ ہر وہ خیال جو عقل کی دسترس میں نہ آسکے وہ نظر انداز کر دینا چاہیئے اور ان کا فتوے یہ ہے کہ سب بنی نوع انسان کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اس کا تو ان کو کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا ہوگا کہ جس سائنس پر وہ ایمان لائے ہیں اس کی جلد ہی مکمّل کایا پلٹ ہو جائے گی۔

وہ الجبری ضابطے اور مساوات جو سائنس دانوں کیلئے اطمینان بخش

ہیں عوام کے نزدیک وہ بے معنی ہیں۔ کوئی ریاضیاتی تصوّف، خواہ وہ غیر متنازع فیہ ہو، کبھی نوع انسانی کے قلوب کو متاثر نہیں کر سکتا بعینہ ایسے ہی جیسے کسی نقاشی کا کیمیاوی تجزیہ وہ جمالیاتی اثر پیدا کرنے کے نااہل ہے جو نقاشی کا مقصود بالذات ہے۔ کیفیات کے عالم اور کمیات کے عالم کے درمیان ایک خلیج حائل ہے جس کا پاٹنا سائنس کے بس کا روگ نہیں۔

کسی مافوق الفطرت نصب العین کے تصور کے علاوہ، اور مسلمہ امر ہے کہ اس تصوّر کو کامل پُرخلوص اور دیانت دار اشخاص کی خاصی تعداد قبول نہیں کرتی، نظریۂ افادیت کے اعتبار سے (PRAGMATIC ALLY) بھی اس مسئلے کا ایک رُخ محتاج توجہ ہے۔ وہ ہے ان لوگوں کی خوشی اور اطمینانِ قلب جن کے جذباتی ردِعمل عقلی انفعالیتوں سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی پُرامید تسلیم و رضا جو جسمانی عارضوں میں مبتلا ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی تعداد اکثریت پر مشتمل ہے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جب تک کہ عقلی طرزِ فکر کسی کامیاب تعمیری منصوبے کے ذریعے روحانی تصوّرات کی جگہ نہیں لے لیتی اور جب تک کہ مادی اندازِ فکر ایک ذوقی معاملہ ہے کسی انسان کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ ان مسائل کو پس پشت ڈال دے۔

سائنس کے اندازِ فکر کے علاوہ، جو معدودے چند اشخاص کو ہی زیب دیتا ہے اور زمانے بھر کے بعض مشاہیر علمائے سائنس نے خدا کی ہستی کو تسلیم کیا ہے، اور مذہبی اور روحانی اندازِ فکر کے علاوہ جس کی جڑیں ابنِ آدم کی عمیق تمناؤں میں گڑی ہوئی ہیں، ایک ہی اور معمولی اور گمراہ کن راستہ باقی ہے، جو افسوسناک طریقے پر حسن و جمال سے محروم ہے، یعنی معمولی فہم و فراست کا راستہ (COMMONSENSE)۔ محمولی

افسوس صد افسوس کہ معمولی ذہانت، اس عملِ ارتقاء کی جس میں ابنِ آدم الجھا ہوا ہے، نوعیت کو بدلنے (CATALYZE)[1] یا اس کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ علاوہ بریں حسِ مشترک کبھی عملِ ارتقا کا آلۂ کار رہی بھی نہیں۔ یہ ایک عملی، ذاتی اغراض کے حصول میں امداد دینے والا اندازہ ہے جس کی انسانی ترقی کے لئے کوئی قدر نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ بسا اوقات علمی تجسس میں ہمیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتی بلکہ چونکہ اس کی اساس اکثر و بیشتر تجربی واقعات اور سطحی انسانی شعور پر ہوتی ہے یہ بھی انہیں کمزوریوں سے ملوث ہوتی ہے جو ان عناصر

---

[1] از مترجم: CATALYSIS علمِ کیمیا میں ایسے عامل مادے کو کہتے ہیں جو اپنی حالت بدستور قائم رکھتے ہوئے کسی مرکب کے کیمیائی عمل کے تغیرات میں مدد کرے۔

میں پائی جاتی ہیں جو اس کی اساس کا کام دے رہے ہیں۔ اس میں تجربے سے الگ ذاتی طور پر کسی ترقی کی گنجائش نہیں۔ اور یہ خوش نصیبی کی بات ہے کیونکہ اگر حس مشترک آفاق گیر ہوتی تو ابن آدم کے روحانی نشو و نما کا خاتمہ ہو گیا ہوتا اور عمل ارتقا رک گیا ہوتا۔ یہ بلا شک ہمیں اپنی اصلاح کرنے، کسی نصب العین کے لیے سعی کرنے، اور ہر اس طریقے پر کوئی فعل کرنے سے مانع ہوتی جو فعل ہمارے آنی فائدے کے خلاف ہوتا، اور قسمت آزمانے کا تو کبھی موقع ہی نہ دیتی۔ کسی جوانمردی کے کام کی تو یہ کبھی پشت پناہی نہ کرتی اور اگر اسے پورا پورا موقع میسر آتا تو نیکیوں کو پھلنے پھولنے کا شاید ہی کبھی موقع نصیب آتا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باری تعالے نے اس کے وقوع کے امکان کا خاص خیال رکھا اور بڑی کفایت شعاری کے ساتھ اسے بنی نوع انسانی میں بانٹا۔ حس مشترک کی تھوڑی سی مقدار کالملح فی الطعام ضروری ہے لیکن اس کا فقدان اس کی کثرت سے زیادہ بار آور ہے۔

چونکہ ہر شخص کی فرداً فرداً رہنمائی کرنا اور مدد کرنا ناممکن ہے، اس لیے ہم رہنما تیار کرنے پر مجبور ہیں اور چونکہ ذہنی صلاحیتیں یکساں طور پر تقسیم نہیں ہوئیں، ہمیں انسانوں کی ضمیروں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دو مختلف منصوبے تیار کرنا چاہئیں۔ پہلے منصوبے کی اساس تو

سائنٹیفک امور کی قابلِ اعتماد تاویلات اور جو نصب العین کہ مقصود نظر ہے اس کے متعلق صحیح اطلاعات پر ہونی چاہیئے اور دوسرے منصوبے کی بنیاد انسانی نفسیات اور جذباتی تصورات کی وزنیت کے علم پر رکھی جانی چاہیئے۔ پہلے منصوبے کو تو اساتذہ کو تیار کرنے کے لئے کام میں لانا چاہیئے جن پر آئندہ نسلوں کی ذہنی سمت متعین کرنے کی ذمہ داری ہو گی۔ دوسرا منصوبہ جو ذہنی کم اور جذباتی زیادہ ہے اس کام کا ہے کہ اس کی مدد سے اساتذہ عوام کے قلبی اعماق تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

مذاہب نے اس امتیاز کو بہت مدت ہوئی قایم کر دیا تھا۔ انہوں نے عوام کے لئے عام فہم اعتقادی تعلیم وضع کی جو ان مخفی اصولوں سے مختلف تھی جو خاص مریدوں کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ تاہم چونکہ ان کا کائنات کے متعلق علم بے انتہا سرسری تھا ان کے تصورات کی بہت بڑی تعداد کلیتًا باطل تھی اور چونکہ ان کی دیو بانیاں وہم و خیال کی وضع کردہ تھیں اس لئے وہ ان کے سہارے کوئی متجانس اعتقادی اصول وضع نہ کر سکے اور انہیں چالبازیوں سے کام لینا پڑا۔ آج حالات بدل گئے ہیں۔ ہم ایک ایسی ہم آہنگ کائنات کا تصوّر کر سکتے ہیں جس کے ضوابط ہمارے وجدانی اور مذہبی امنگوں کو سہارا

اور تقویت دیتے ہیں اور کبھی ان کی تغلیط نہیں کرتے۔ اس لئے ہم اپنے مخاطبین کی ذہنی تیاری کی حالت کے مناسب اپنی تعلیمات کو ڈھال سکتے ہیں۔ صداقت کی حقیقت تو ایک ہی ہے لیکن ذہنیتیں متنوع ہیں اور ایک ہی امر جو بعض کے لئے واضح ہو دوسروں کے لئے مبہم یا ناقابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ سائنس کی عظیم اور تیز رفتار ترقی، اور اس کے روز افزوں اقتدار نے جو مشکل مسائل پیدا کر دیئے ہیں مذاہب ہمیشہ ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ بعض مذاہب کا ردِ عمل تو ایسی صورتوں میں یہ ہے کہ وہ مطلق اذعانی عقائد اور کٹر تاویلوں کی مورچہ بندیوں کے پیچھے پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ آگے مرتقی ہونے سے انکار کر دیا ہے اور جمود کی ایسی خود رائی اختیار کر لی ہے جو ہمیشہ قایم نہیں رہ سکتی۔ کچھ ایسے ہیں جو، اعلیٰ قسم کے رہبروں کے فقدان کے باعث اور اس زعم باطل کے ماتحت، کہ کہیں وہ عوام پر اپنا اثر نہ کھو بیٹھیں، اس استبدادیت کو جو اخلاقی عالم میں ضروری ہے، مصالحت کے بھینٹ چڑھانے کی غلطی کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ انہیں اس سمت میں اپنے عملِ ارتقاء کو نہیں لے جانا چاہیئے تھا لوگوں نے یہ دھوکا نہ کھایا اور بعض کلیساؤں کے اقتدار کو سخت دھکا لگا۔

اگر لوگوں کو یہ باور کرا دیا جائے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی جنگ نہیں تو بنی آدم سخت سے سخت پابندیوں کو قبول کرنے پر تیار ہو جائینگے یعنی جب ان کے ذہنی اور عقلی نفس کا ان کے جذباتی اور وجدانی نفس کا باہم تصادم نہ ہوگا۔ جب تک تعلیم نے ابنِ آدم پر ہر چیز کو سمجھ لینے کی مثالط وہ ضرورت عائد نہیں کی تھی عقل اور جذبہ میں کبھی مصالحت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن آج جبکہ انسانوں کی کثیر تعداد اس صداقت کو تسلیم کرنے سے۔ انکار کردیتی ہے جو انکی سمجھ میں نہیں آتی، انہیں اس امر پر توجہ دینے کی ضرورت ہے آج یہ دعویٰ کہ روحانی اور ربانی صداقتیں سختی کے ساتھ عقلی دلائل کی گرفت سے باہر ہیں اور ان کی بصیرت بلا واسطہ ہونی چاہیئے کسی کو اپنی صحت کا یقین نہ دلا سکے گا۔ بعض ممالک میں تو پانچ اور پندرہ سال کی درمیانی عمروں کے نازک زمانے میں ہی سکولوں میں اس اعتقاد کے لئے زمین تیار کر دی جاتی ہے۔ ایسے طالب علم کے لئے جسے فطرت کی طرف سے تنقیدی حس عطا ہوئی ہے، اور فطرتاً مذہبی رجحانات اس میں نہیں، ایک معقول توجیہ اور "قابلِ قبول دینی اصولوں کا سوال و جواب نامہ (ACCEPTABLECATECHISM) مہیا کرنا ضروری ہے اور سب

زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ اسے باور کرایا جائے کہ سائنس کی مہات اور مذہب کے درمیان کوئی تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً اس کے لئے ماہرانِ تعلیم اور علمائے سائنس ہیں اتحادِ عمل کی ضرورت ہے۔

بعض لاادری جن کے دل میں خود بخود اخلاقی قدریں پیدا ہوگئی ہیں یہ دعوے کرتے ہیں کہ جب صدری مسئلہ یہ ہے کہ اخلاقی ضوابط کی تعظیم کی جائے تو اگر ہم عملاً ان پر عملدرآمد کرانے میں کامیاب ہوسکیں تو مذاہب کو بیچ میں ڈالنے کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اندازِ فکر نفسیات سے ناواقفیت کا پتہ دیتا ہے کیونکہ انسان کو جب تک قواعد کے سرچشمے کا علم نہ ہوگا وہ ہمیشہ قواعد کے جواز پر اعتراض کرے گا، علاوہ بریں اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلے کو مطلقاً سمجھے ہی نہیں کیونکہ جانِ سخن تو یہ ہے کہ انسان کی داخلی اصلاح ہو اور اس کا اندازِ فکر اخلاقی ہو۔ مطمح نظر یہ نہیں کہ انسان کو اخلاقیات کی علامات کی مشق کرائی جائے۔ جب تک کہ کسی فرد کا کردار اس کی عمیق داخلی اصلاح کا نمائندہ نہیں بن جاتا اس کا اخلاق مصنوعی، رسمی، اور آنی قیود کا مجموعہ ہی بنا رہتا ہے جن کو پہلا اشتعالِ طبعی ہی تہ و بالا کر کے

رکھ دیتا ہے۔ اگر اخلاقی ضوابط کو من مانے طریق سے عائد کیا جائے تو ان کی عملی قدر خواہ کچھ بھی ہو، وہ کبھی کامیابی کے ساتھ ان وحشیانہ محرکات کا مقابلہ نہ کرسکیں گے جو عالم انسانی کو اپنی ماضی سے ورثے میں ملے ہیں۔

جن فہمیدہ اور مہذب انسانوں کو یہ اطمینان نصیب ہے کہ مذہبی اعتبار سے واجبی طور پر انہیں جمعیت خاطر حاصل ہے اور دوسرے کم خوش بخت اور ہر طرح پر پست لوگوں کی مذہبی حالت سے انہیں کوئی سروکار نہیں ان کی مثال اس کسرتی شخص کی سی ہے جو دوڑ کے میدان میں چھ فٹ سے کم اونچائی کی رکاوٹیں پسند نہیں کرتا کیونکہ اس کو یہ گھمنڈ ہے کہ وہ ان کو بآسانی پھلانگ سکتا ہے۔ اس خوش نصیب نیکوکار بزرگ کو اس امر کا احساس نہیں کہ اس کی استثنائی حالت ایسی ہی ہے جیسے کسی بین الاقوامی میر میدان کی اور اس کا اخلاقی توازن، اس کی صحت، اسکی تفکرات سے نجات، ایسی نعمتیں ہیں جن کے سامنے ہر مشکل آسان ہے۔ اسکو اس کا علم نہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کا وجود عجوبہ ہے اور نہ ہی وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ذمے وہی فرض ہے جو مذاہب کے ذمے ہے اور اگر اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی گئی تو

عالم انسانیت جلد ہی رو بہ تنزل ہو جائے گا۔ انسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے جس کا عمل اغلباً اب صوریاتی سطح پر رک چکا ہے، اس شخص کا فرض یہ ہے کہ اپنی مثال پیش کرکے اخلاقی نصب العینوں کی اشاعت اور ممکن ہو تو ان کی اصلاح اور وضاحت میں امداد دے کر ارتقا کو بڑھائے۔ یہ کام صرف وہ اور اس جیسے اور لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھے سے اُتار کر کلیتاً ان لوگوں پر ڈال دے جن کے ذمے نظمی اعتبار سے بچوں کی تعلیم و تربیت، اور نوجوانوں کے قلوب و دماغ کی تشکیل کا شاندار وظیفہ ہے۔ اساتذہ کے سپرد تو یہ کام ہے کہ جیسا ان کو سکھایا گیا ہے، ویسے ہی روایات کو وہ آگے منتقل کردیں۔ سوائے چند حیرت انگیز اور قابلِ تعریف استثنائی مثالوں کے، اساتذہ تو یہ کر سکتے ہیں کہ اکثر بغیر اچھی طرح سمجھے اور اپنائے ہوئے ان معیاری عناصر کو جو ہماری اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی صحیح صورت کے مناسب حال ہوں اپنے طور پر آراستہ و پیراستہ کرکے پیش کردیں۔ بدنصیبی سے اکثر معاشرے ثقافتی اور علمی ترقیوں کی فرسودہ اور متروک تعلیم کے پیدا کردہ نمونوں کے مظہر ہوتے ہیں اور بعض ممالک میں تو اساتذہ کے ناقابلِ تسخیر جمود کی وجہ سے صدیوں تک

مسلمہ غلط اطلاعات بھی منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کا اندازہ اس کے عملی کارناموں سے کیا جاتا ہے اور اس حکیمانہ اندازِ فکر سے نہیں کیا جاتا جو اس کا ماحصل ہے مگر زیادہ اہم اول الذکر کے مقابلے میں موخرالذکر بات ہے۔ اور سائنس کا مطمح نظر یہی ہے یا ہونا چاہیئے۔

جو خرابیاں اس کے مشاہدے میں آئیں ان کی اصلاح اور آئندہ کے لئے ان کے سدباب کرنے کے ذرائع کی تلاش کا مشکل کام تعلیم یافتہ، اخلاق سے آراستہ، مرتقی ابنِ آدم ہی کے ذمے ہے خواہ اس کا اپنا حصول معاش کا پیشہ کچھ بھی ہو۔ اگر اس نے یہ نہ کیا تو اس کے اپنے پیشے کے کارنامے عمل ارتقار کی امداد کیئے بغیر جلدی طاقِ نسیاں کے سپرد ہوجائیں گے۔ اور ہم اس سے مطالبہ کتنی چیز کا کر رہے ہیں؟ واقعتاً بہت ہی کم۔ یہی کہ اگر اس میں اہلیت ہے تو وہ اپنے نتائجِ فکر اور معتقدات کو تقریر اور تحریر کے ذریعے شائع کرے! جب کوئی غلط تعلیم اس کو نظر پڑے تو اس کی تردید کرنے کے لئے مستعد ہوجائے۔ ضمیر کی نشوونما کے لئے جو آزادی لابدی ہے اس کی محافظت کرے اور جن لوگوں کا طرزِ عمل ریاکارانہ اور شرانگیز ہو ان کو طشت

اذہام کرے۔ اگر تحریر کا ملکہ اس میں نہیں تو وہ خوب غور کرے اور اس طریقے کو ڈھونڈ نکالے جس سے وہ ان اخلاقی خوبیوں کو جو اس کی روح رواں ہیں دوسروں میں پھونک سکتا ہے۔ انسانی عظمت کے تصوّر اور اس کے عائد کردہ فرائض کی اشاعت اپنے حلقۂ اثر میں فرض سمجھے۔ اگر خدا کی ہستی پر اسے یقین ہے تو اس کا اعلان کرے اور اس کے لئے اپنے دلائل پیش کرے۔ اگر وہ مذہب کا قائل نہیں تو خلوص کے ساتھ اس امر پر غور کرے کہ مذہب کی جگہ کس عقیدے کو دی جا سکتی ہے۔

انفرادی طور پر ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا وجود ناگزیر ہو اس پر بھی کوئی ہم میں سے بے فائدہ نہیں[1] اور ہماری فائدہ مندی کا انحصار ہماری قوتِ ارادی پر ہے۔ اگر کلیتاً خراب ہو جانے کا امکان بعض اوقات سہل ہے تو کلیتاً اچھا ہونے کا امکان اکثر بہت مشکل ہے۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پرخلوص کوشش ہی صرف بار آور ہوتی ہے[2] وہی لوگ جن کی روحیں

---

[1] (از مترجم) "ربنا ما خلقت ھذا باطلاً" کا اعلان ہو رہا ہے۔

[2] ر ر "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

ان کے جسموں میں سے مکمل ہو کر نکلی ہیں۔ نفسانی خواہشات اور ایمان کے درمیان کشمکش کی حقیقت کو وہی لوگ سمجھے ہیں جن کے اپنے اندر وہ جاری رہی ہے اور جنہوں نے اپنے جسم کے مادی رجحانات کو تسخیر کیا ہے وہی مرتقی گروہ کے نمائندے ہیں اور وہی آنے والی اعلےٰ نسل کے ہراول ہیں۔

(۱۴)

تصوّر ذات باریِ تعالےٰ اور قدرت کاملہ

خدائے برتر کو آنکھوں سے دیکھنے کی سعی کرنا ایک حیرت انگیز طفلانہ خیال ہے ہمارے لئے تو ایک برقئیے کا تصوّر بھی ممکن نہیں خالقِ مطلق کے تصوّر کا کیا ذکر۔ اس پر حالت یہ ہے کہ بہت سے لوگ خدا کو اس لئے نہیں مانتے کہ وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ وہ یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ ہماری یہ معذوری، بذات خود خدا کی عدم ہستی کا کوئی ثبوت نہیں درآنحالیکہ برقئیے کے وجود کو وہ تسلیم کرتے ہیں۔ ہم تو آج کل اس بات کے عادی ہیں کہ شعبدہ بازی کرکے ایسی ہستیاں تسلیم کرلیں جن کو ہم ان کے اثرات کی وجہ سے جانتے ہیں۔ یہ وجود ذرے، برقئیے، مرکزیے، معتدلے وغیرہ ہیں۔ انفرادی صورت میں ان کا تصوّر قطعاً ناممکن ہے اور وہ علمائے طبیعات جو سائنس کی اس شاخ کے

خصوصی ماہر ہیں ان کے آنکھ سے دیکھنے کی ہر کوشش کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس سے کسی شخص کے دل میں خلجان نہیں پیدا ہوتا اور ان کے وجود پر ایک لمحے کے لئے بھی شک نہیں گزرتا کیونکہ ماہرین طبیعات، جن کی بات کا ہمارے دلوں میں اتنا ہی اعتبار ہے جتنا ماضی میں پروہتوں اور پادریوں کا تھا، ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان ذرّات کو تسلیم کئے بغیر ہماری مادی اشیا، وہ قوائے فطرت جن کا ہم استعمال کرتے ہیں، بہ الفاظ دیگر ہماری تمام غیر نامی کائنات، بے ربط اور ناقابل فہم بن جاتی ہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جس عالم میں یہ ذرّات حرکت کرتے ہیں اس میں زمان و مکان کی وہ قدر نہیں جو ہماری دنیا میں ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ایک برقیہ سہ ابعادی مکان میں حرکت کرتا ہے (جیسے ہمارا مکان) لیکن دس برقیوں کو تیس ابعاد والے مکان کی ضرورت ہوتی ہے (تین ابعاد فی برقیہ) اور یہ صورت قطعاً غیر متصوّر ہے۔ ہر چند کہ یہ عناصر فہم کی گرفت میں نہ آنے والے اور حیرت انگیز ہیں ان کی واقعیت کو ہم بے چون وچرا مان لیتے ہیں اور اب وہ ہماری جانی پہچانی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

لاادری اور ملحد کے دل میں اس امر سے ذرّہ برابر بھی خلجان

پیدا نہیں ہوتا کہ خدا کے مفروضے کے بغیر ساری نامی ذی حیات کائنات ناقابلِ فہم بن جاتی ہے۔ بعض ایسے طبیعی عناصر پر ان کا یقین، جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں، ان کے غیر عقلی عقیدے کا بین نشان ہے لیکن اس کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ بعض تو ان میں سے خالی خولی الفاظ کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس امر کا ثبوت مجھے ایک خط سے ملا جو میری ایک تصنیف کی اشاعت کے بعد ملا اور جس میں کہ کاتب خط نے مجھے اس بات پر بہت کچھ ملامت کی کہ میں نے لفظ "خدا" کو لفظ "ضد اتفاق" کی جگہ رکھ دیا ہے، جو اس کے نزدیک بالکل تسلی بخش تھا اور لفظ "خدا" کو لغت سے خارج کرکے متروکات میں شامل کر دینا چاہیے"۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لفظ "ضد اتفاق" ایک تربیت یافتہ سائنٹفک فہم کے لیے قطعاً تسلی بخش نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو تسلیم کر لینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تمام عقلی تار و پود جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ اساسی طور پر مہمل ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مصنوعی ضوابط کا ایک مجموعہ ہے جو محض اتفاقی خوش بختی سے ہم کو بعض مظاہر کی پیش بینی کرنے کے قابل کر دیتا ہے۔ یہ تو انسان کے ماورا ہی کوئی ہستی ہو سکتی ہے جو ایسے تصور کو تسلی بخش سمجھے جو اس کے نظریے کے سارے کارناموں

کو ملیامیٹ کردے۔ بلا شک، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، موجودہ سائنس کی اساس بالآخر شماریاتی تصورات، اور احصائے احتمالات پر ہے۔ بہ ضوابطہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ ہماری کائنات کے تعمیری عناصر کی ابتدائی تقسیم بالکل بے ترتیب تھی۔ اگر ہم "ضد اتفاق" کے امکان کو اس کائنات کے ایک حصے کے لئے تسلیم کریں (ذی حیات عالم جو قوت فکر پر منتج ہوئی ہے) تو جب تک ہم یہ نہ مانیں کہ "حیات" مختلف ضابطوں کے تحت ہیں چلتی ہے، ساری عمارت دھم سے نیچے آپڑتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی صورت بھی ہو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ذی حیات اور مرتفی مظاہر کو متعین کرنے والا موثر، ہمارے طبعی کائنات کے لئے اجنبی، غیر عقلی ہے۔

اس موثر کو نام کوئی بھی دے لیں اس سے فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت بدستور باقی رہتی ہے۔ علمائے سائنس کے تصورات نے جب تک ایک معین ہم آہنگ نظام کی صورت اختیار نہیں کی تھی اس وقت تک ایک "فریب کار" کا نظری تصور پیدا ہو گیا تھا لیکن ابھی اس نے اپنی جبری صورت حاصل نہیں کی تھی اور مشہور ماہر طبیعات میکسویل کی ریاضیاتی تصانیف کے نتائج کی وجہ سے "میکسویل کا بھوت" کہلاتا تھا۔ بعدازاں ایڈنگٹن نے اس کو بپتسمہ دے کر اسکا

نام "ضد اتفاق" رکھا۔ آج حیات اور ارتقار کے مطالعے نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ اس کا عمل منطقیانہ طور پر مطلوب ہے اور یہ ہمیشہ صریحاً ایک "متنوع" صعودی سمت میں نمودار ہو کر بالآخر انسان کی قوتِ فکر اور ضمیر پر منتج ہوا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس علت کو، جو ہمارے ذہنی مشاغل اور تصورات میں خلفشار پیدا کرتی ہے، وہی نام کیوں نہ دیا جائے جو زمانۂ قدیم سے لوگوں نے ان سب علل کو دیا جو ان کی دسترس سے باہر رہے۔ وہ علل جو موثر تھے مگر انسانی فہم ان کی وضاحت سے قاصر تھی۔

مذکورۂ بالا خط میں جو اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زمانہ وسطیٰ کی ناروا داری کی عادت نے اپنا فریق تو بدل لیا ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔ یہ امر باعث تشکر و امتنان ہے کہ خط نگار کا علمی مقام اتنا مستند نہیں کہ وہ عقلیت کے نام پر اپنے ہم عصروں کو اپنے طفلانہ اعتقاد کا یقین دلا سکے۔ ہم آخر میں یہ بھی عرض کر دیں کہ بعض "آزاد خیال" لوگوں کا آزادی کا تصوّر تحیر خیز طریقے پر کمزوں سے ملتا جلتا ہے۔

خدا کے تصوّر کو تجسّمی صورت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ خدا کے کام یعنی نظامِ فطرت کے متعلق غور و فکر کیا جائے اور

اس کی ہستی کی حقیقت کا ثبوت ہم کو اس سعی میں مل جائے جو ہم اس کے تصوّر قایم کرنے میں صرف کرتے ہیں کیونکہ یہ سعی داخلی ہے اور اس میں کوئی مادی علت شامل نہیں مگر اس حقیقت کا ثبوت اس سعی کے کسی مادی نتیجہ میں پالینا ناممکن ہے کیونکہ اس سعی کا نتیجہ تو لازماً حسّی ماخذ کی بگڑی ہوئی یادوں کو ہی کم و بیش کام میں لاکر صرف انسان کی بنائی ہوئی عمارت ہی ہوگی، ہم اس آخری بیان کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

نفسیاتی سرگرمی اپنے آپ کو دو طرح پر ظاہر کرتی ہے ایک تو ان داخلی انفعالوں کے ذریعے جو ارثی خواص اور ماحول کے پیدا کردہ تاثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں؛ دوسرے ان نفسانی واقعات کے ذریعے جن کے سرچشمے کو بلا واسطہ یا بالواسطہ خارجی علتوں سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی قسم جبلت، فہم (بہ استثنا تجریدی فہم) اور جذبات پر مشتمل ہے۔ تجریدی تصورات، اخلاقی تصورات (فرض اور خیر و شر کا تصور) اور روحانی تصورات (خدا کا تصور، کسی ماورائے فطرت نصب العین کی امنگ) دوسری قسم میں شامل ہیں۔

پہلی قسم میں وہ سب بندھن شامل ہیں جو ہمیں اپنے مادی کائنات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور بحیثیت مجموعی ذی حیات

دنیا کے جتنے انواع ہیں ان میں سے ایک نوع ہماری بھی ان کی وجہ سے قائم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اجسام نامی اور جامد مادے میں جو رابطے باہمی ہیں ان میں سے اکثر کے متعلق ہمارا علم محدود ہے یا وہ روابط کلیتاً نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں لیکن یہ قرین قیاس ہے کہ کسی دن کوئی نہایت ذی فہم انسان ان کو دریافت کرلے۔ لیکن اس صورت میں بھی کائنات کے ہمارے قائم کردہ نمونے میں جو تضاد وہ داخل کرتے ہیں وہ بعض اوقات محض ہماری لاعلمی یا ہمارے ذہن کی کمزوری سے منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ وہ غالبًا جامد مادے کے ضوابط اور ذی حیات مادے کے ضوابط کے درمیان آنی اور خیالی آویزش کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ہم ان ضوابط کا ذکر کر چکے ہیں (حرکیات کا دوسرا ضابطہ اور زندہ ہستیوں کے تشاکلات میں افزونی) مختصراً یہ وہ آویزشیں ہیں جو ہمارے تصورات کی یک رنگی پر تو اثر انداز ہیں لیکن خود واقعات کی روش پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس دوسری قسم ذی حیات ہستیوں کے ممیز خواص (PSYCHISM) کو جنم دینے والے ان تمام عناصر

لہ اگلے صفحہ پر دیکھو۔

پر مشتمل ہے جن کا اظہار ان علامات میں ہوتا ہے جن کو ہم نے "بے فائدہ اشارات" سے موسوم کیا تھا اور بلا واسطہ ہمیں ہمارے حیاتی کائنات کے ساتھ مربوط نہیں کرتے بلکہ اس پر فائق معلوم ہوتے ہیں اور اس امر کی سعی کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ مادی کائنات کے ماورا کوئی بنیاد دریافت کرکے اس پر ایک خیالی کائنات تعمیر کریں جو پہلی کائنات پر ایسی ہی حکمرانی کرے جیسے روحانی ارتقا کسی شاہکار کی تخلیق پر کرتی ہے۔ یہ قسم تجریدی تصوّرات، ریاضیاتی تصوّرات، ہندسی تصورات سے ایک نئے عالم کو تشکیل دیتی ہے نیز جمالیاتی تصوّرات، اخلاقی اور روحانی تصوّرات کی مدد سے ایک نئی دُنیا پیدا کرلیتی ہے۔ پہلی قسم کے تحت میں ہم نے جن خیالی آویزشوں کا ذکر کیا ہے وہی تجریدی تصورات کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن اخلاقی تصورات ہماری انا (ایغو) اور اس کے مادی پشتے یعنی انسانی جسم کے درمیان ایک حقیقی تضاد کو داخل کرتے ہیں۔ ہمارا جسم تو ہمیں حیات کی اس

(بسلسلہ صفحۂ گزشتہ) از مترجم:- PSYCHISM حیات کے علم کا یہ نظریہ کہ زندہ مادے میں بعض ایسے خواص ہیں جو بے جان مادے میں غیر معروف ہیں۔

عظیم ارتقائی موج رواں کا ایک اہم جزو بنا تا ہے جو بتدریج سمٹ کر انسانی نسل پر آ پہونچی، لیکن ہمارے اخلاقی اور روحانی تصورات ہمارا رشتہ اس مکمل ہستی کے ساتھ مربوط کرتے ہیں جس کی طرف آغاز کار ہی سے عمل ارتقار کا رجحان رہا ہے۔
ایک طرف تو ہمارا رشتہ ان تمام ہستیوں کے ساتھ اٹکا ہوا ہے جو ہم سے پہلے ہو گذری ہیں اور اس ارث کا بوجھ ہر پہلو سے ہمارے کندھوں پر ہے۔ دوسری طرف ہم ایک ایسی نسل کے اجداد ہیں جو ہم سے بے انتہا افضل ہوگی اور جو ہم سے اپنا رشتہ توڑنے کی اسی طرح سعی کرے گی جیسے مرغی کا بچہ انڈے کے خول کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اس قید خانے سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف ہم ماضی کے اسیر ہیں اور دوسری طرف مستقبل کے موعود۔ لہٰذا اس آخری صورت میں ہم ایک مختلف قسم کی نفسیاتی سرگرمی سے بحث کر رہے ہیں کیونکہ یہ نہ صرف ہمارے تخیل کی یک رنگی پر اثر انداز ہے بلکہ یہ ٹھیک اس اوزار پر مشتمل ہے جسکے ذریعہ مستقبل کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہ صرف ہمارے افعال پر ہی حکمرانی نہیں کرتی۔ ارتقار کی سمت متعین کرتی ہے اور ہمارے دور کے اخلاف کی قطعی سیرتیں

تیار کرتی ہے۔

صرف پہلی قسم ہی جو ہمارے سب تجربات اور تمام حسیاتی تاثرات پر حاوی ہے، اپنے خارجی منبع کی وجہ سے ہم میں یہ اہلیت پیدا کرتی ہے کہ ہم کسی کی تصویر "قایم کرسکیں۔ یہ تصویر" ان یادوں کی بدولت جو حواس کی بالخصوص بینائی کے حس کی انفعالیتوں سے مستعار لی جاتی ہیں، ہمیشہ متجسم ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہر لمسی یا سمعی حس، بالعموم اپنے جلو میں ایک بصری مجسمہ بھی لاتی ہے جو اس کے ساتھ مستلزم رہا تھا یا جس کو کہ وہ تمثیلاً سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر تصویر ماحول سے یا زیادہ صحت سے یہ کہنا چاہیئے کہ ان حسیاتی یادوں سے جو ماحول سے ماخوذ ہیں، مستعار لی جاتی ہے۔ یاد ہوگا کہ (صفحہ ۴) ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو اطلاعات حواس ہم کو مہیّا کرتے ہیں وہ نامکمل اور اضافی ہوتی ہیں اور ہمارے حقیقی کائنات کے صرف بہت چھوٹے سے حصے کے متعلق ہوتی ہیں۔

دوسری قسم، جو حادثات اور تاثرات پر مشتمل نہیں ہوتی، بلکہ ان کے باہمی روابط، تجریدی تصوّرات، اور اخلاقی تصورات پر مشتمل ہوتی ہے، بلا واسطہ تصویر قایم کرنے میں مدد نہیں دیتی،

لیکن کبھی کبھی پہلی قسم کے مواد (حسیاتی یادوں) کی شرکت کی بدولت بالواسطہ ایک ذہنی تصوّر پیش کر دیتی ہے۔

لہٰذا خدا کی کوئی تصویر لازمی طور پر پہلی ہی قسم سے مستعار لی جاتی ہے یعنی ان عضویاتی انفعالیتوں سے جو ہمارے اور فطرت کے اتصال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ تمثیل یا تصویر نہ صرف مشتبہ بلکہ یقیناً باطل ہوتی ہے۔

علاوہ بریں خدا کا تخیل ایک خالص تصوّر ہے جیسے قوت یا توانائی کا تصوّر اور اسے تمثیلی یا تصویری نقشے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کا امکان ہے۔ یہ یا تو خود بخود ادراک کے ذریعے الفاظ کے لباس سے عاری، عقل کے علی الرغم نمودار ہو جاتا ہے اور اس کا نام الہام یا وحی ہے! یا پھر عقلی طور پر یہ تصوّر وہ تضاد قایم کرتے ہیں جو سائنس کے پیش کردہ ہم آہنگ مگر آزمائشی نمونہ کائنات اور معروضی حقیقت، جس نے کہ اس نمونے کی تعمیر کو ممکن بنایا تھا، کے درمیان ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ گزشتہ ابواب میں ان تضادوں کو ہم نے نمایاں کیا ہے۔

ان تضادوں کو یا تو سائنس ہی کی طرف منسوب کیا جاسکتا

ہے جس کا کسی وقت ہماری لاعلمی میں، فطرت پر انطباق ختم ہو گیا (اگر یہ صورت ہے تو قصور سائنس کا ہے اور اس کی یک رنگی کا وجود اب باقی نہیں رہا اور اس کا اعتمادی اثر اب زائل ہو چکا ہے) یا یہ تضاد خود فطرت کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں جو ایسی رنگا رنگی نمایاں کرتی رہتی ہے کہ ہمارا یک رنگ ذہنی نمونہ کائنات اس کی توجیہ سے قاصر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آخری سبب سے پہلا خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

بلا ریب! جب سائنس یہ اعلان کرتی ہے کہ کل مظاہر فطرت کو کارنو کلاسیس (CARNOT-CLAUSIUS) ضابطے[1] کے مطابق عمل پذیر ہونا چاہیے اور ہم کو ایسے مظاہر فطرت ملتے ہیں جو اس ضابطے کی تعمیل کرتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تو ہم کو اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ جو سائنس زیر غور ہے وہ سب مظاہر کی توجیہ نہیں کر سکتی اور یہ نتیجہ اس کی عالمگیری کو محدود کر دیتا ہے۔ اس کا پتہ طبعی ارتقا سے چلتا ہے جس کا سلسلہ اس سمت میں جاری ہے جو سائنس نے ممنوع ٹھیرائی ہے یعنی روز افزوں غیر احتمالی حالتوں

---

[1] (از مترجم) اس ضابطے کا مجمل باب ۴ کے ابتدا ہی میں بتا دیا گیا ہے۔

کی سمت میں۔ اس سے لہذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سائنس عالمگیر نہیں ہے اور اس کا عمل دخل بے جان مادے کی کائنات ہی میں ہے۔ اگر جامد مادے کی حدود تک ہمارا اعتقاد سائنس پر باقی ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ ہو تو سائنس کی ناکامی کی صرف ایک ہی توجیہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ فطرت جیسا ہم نے یقین کر لیا تھا یک رنگ نہیں اور غیر نامی مادے اور حیات کے درمیان تسلسل کا کوئی حل ہے جس کو ہماری موجودہ سائنس واضح نہیں کر سکتی۔ اس لئے بحیثیت مجموعی سائنس پر ہمیں الزام نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس لئے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہر غیر ذی روح چیز کے بارے میں اس کی قدر اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہاں جس کائناتی نمونے کو ہم نے تعمیر کرنے کی سعی کی تھی اس میں حیات ٹھیک نہیں بیٹھتی۔

اگر ہم انسانی استدلال اور ذہن پر اپنا بیباک اعتماد قائم رکھیں تو ہم ان تضاد کو اپنی وقتی عدم واقفیت کی طرف منسوب کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں "کہ مستقبل قریب یا بعید میں نئے واقعات اور نئی تاویلوں کی بدولت ہم ان اطلاق کے" تاریک گوشوں پر روشنی ڈال سکیں گے جو ابھی حقیقت کی پوری واقفیت نہ ہونے

کی وجہ سے ہمارے لئے تضاد کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔
سائنس واحد ہے اور کائنات کا کوئی گوشہ اس پر بند نہیں" لیکن ہمارا یہ کہنا کسی عقلی یا سائنٹیفک تفکر کا نتیجہ نہیں۔ یہ صرف ایک تمنا کا اظہار ہے جس کی اساس اس جذباتی اعتماد پر ہے جو سائنس کے متعلق ہم نے قایم کر لیا ہے۔ مزید برآں ہم اس امر کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ جب یہ تضاد، جیسا کہ ہماری اوپر دی ہوئی مثال سے ظاہر ہے، جزیات سے متعلق نہیں، بلکہ اساسی تصوّرات تو اس مجموعے سے متعلق ہیں جن پر ہماری سائنس کی بنیادیں قائم ہیں، تو ہم سائنس کی اس ساری عمارت کو متزلزل کر دیتے ہیں جس کی سند پر ہم نے دین کو رَد کیا ہے اور ویسی ہی ایک ناقابلِ توجیہ تجربیدی ذہانت پر، غیر عقلی اعتقاد رکھتے ہوئے ہم بھی مجبوراً سائنس کی ناکامی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ امر توقع کے مطابق اور معقول ہے کہ جن کو کلیسا کی زبان میں، "تائید ایزدی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کو نہ صرف ایسی ہی منطقی آویزشوں کی بدولت خدا کا تصوّر نصیب ہوا بلکہ مندرجہ ذیل تضاد کی وجہ سے بھی، ایسے لاتعداد امور کا وجود ہمارے مشاہدہ میں آتا ہے جن کا رجحان کروڑوں برس تک کسی نوع کی بقا کے

ضامن رہنے کا رہاہے، اور پھر یکایک ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے رجحان منصۂ شہود پر آ گئے جن کا رُخ بالکل مخالف سمت میں تھا "ابتک تمہارا کارِ منصبی صرف یہ تھا کہ زندہ رہو اور افزائش نسل کرو، تم قتل کرسکتے تھے، خوراک یا زوج چرا سکتے تھے، اور جبلتوں کے احکام کی تکمیل کرنے کے بعد، جو تمہارے اندر اس لئے رکھی گئی تھیں کہ کثرت سے افزائش نسل کرسکو، آرام سے سو جاؤ۔ اب آج کے بعد تمہیں ان جبلتوں سے جنگ کرنا ہوگی، تمہیں قتل نہیں کرنا ہوگا، چوری نہیں کرنا ہوگی، ہوا و ہوس سے بچنا ہوگا۔ آرام کی نیند تم صرف جبھی سو سکوگے جب نفس پر قابو پا لوگے۔ اگر تم سے یہ کہا جائے کہ جو نصب العین تمہارے سامنے ہے اس پر اعتقاد نہ رکھو تو تم کو سختیاں برداشت کرنے اور جان دینے کے لئے آمادہ رہنا پڑے گا وہی جان جسے کل تک تم ہر قیمت پر محفوظ رکھنے کے لئے مجبور تھے۔ زندہ رہنا، کھانا پینا، جنگ و جدل کرنا، اور افزائش نسل کرنا اب تمہارے مقدم مقاصد نہیں ہیں۔ کسی بلند نصب العین کی خاطر موت، بھوک، غلامی، عصمت تک کی قربانیاں دینا زیادہ شریفانہ مقاصد ہیں۔ اور تم کو اشرف المخلوق ہونا ہے یہ نئی ہستی ہے جو تمہارے اندر نمودار ہوئی ہے اور اسی کو تمہیں

اپنا آقا تسلیم کرنا ہوگا خواہ وہ تمہاری خواہشات کو کچل ہی کیوں نہ دے"[1] افسوس! کہ یہ نئی روح ابھی سب قلوب میں پیدا نہیں ہوئی اور اگر ہوئی ہے تو ابھی کمزور و ناتواں ہے۔ جب تک کہ اسکا تصور واضح نہ ہوگا اور قلوب اس کی خواہش نہ کریں گے یہ ترقی نہ کرے گی اور نہ پھلے پھولے گی۔

دور رس غائیت کے مفروضے کے مطابق ابن آدم کو چاہیئے کہ اپنا ارتقار روحانیت کی طرف جاری رکھے۔ اسے حیوانی اقضایو[2] سے، اور ان خام تصورات سے، جو اسے اپنے حقیقی اجداد سے ورثے میں ملے ہیں اور جو ان ابتدائی آویزشوں کے باقیات السیئات ہیں جو اُن کی نامکمل ضمیر اور طبعی اُفتاد میں جاری رہیں، آزادی حاصل کرنا چاہیئے۔ ابھی تک ابن آدم اس مجبوری دَور کی محکم گیر[ا] دوں

---

[1] (از مترجم) مصنف نے اس عبارت کو واوین کے اندر رکھا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتباس ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ کہاں سے لی گئی ہے ممکن ہے یہ مصنف کی اپنی ہو اور اس کو اہمیت دینے کے لئے واوین میں رکھ دیا ہو۔

کے نیچے دبا ہوا ہے کہ جب انسان جبلتوں اور شہابیوں کے خلاف غیر مساوی جدوجہد کر رہا تھا، جب وہ ایسی نئی دُنیا کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کی بجائے کوشش کر رہا تھا جس میں ایسے رجحانات، اُمنگیں، اور خواہشات نمودار ہوگئی تھیں جن کا وہ عادی نہ تھا۔

اب اس کی ساری کوششیں اسی جدوجہد پر مبذول ہونا چاہئیں اور عظمتِ انسانی کے تازہ حاصل کردہ احساس سے ہی اپنے اعلئے مقدّر کے لئے ضروری قوت اور ثبوت حاصل کرنا چاہئے۔

جب خدا کی قدرت کاملہ کے تصور کی تعبیر غلط ہو جائے تو وہ تصوّر خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تصوّر کا صحیح اثر زائل ہو جاتا ہے اور ہم ایک جبری عقیدہ قضا و قدر کی طرف چل نکلتے ہیں اور یہ اس عقیدے کے خلاف ہے جو قانون ارتقا ہمارے اندر پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کا خدا کا تصوّر انسان کو ایک لاشخصی زندہ مشین بنا دیتا ہے جو حشروں سے کچھ ہی زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ مسلمانوں کو غور و فکر پر اتنی بے اعتباری ہے کہ لازمی اور کڑی عباداتی ریاضتیں خدا رسی کے لئے تجویز کر کے قوتِ فکر کو ناممکن بنا دیا ہے۔ نہیں تو اس انداز عبادات سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ جس ذات مطلق کے احکام کی بجا آوری کا ان کو دعویٰ ہے اُس ذات کے متعلق ان کے دل میں نازیبا غلط فہمی ہے۔ یہ تو اس دَور کی یاد تازہ کرتی ہے جب خوف کا دلوں میں دَور دورہ تھا اور جہالت کی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ وہ عبوری دور جو اوہام سے مملو تھا، جب نہایت پاکیزہ مقاصد بھی حد درجے کی سفاکانہ جبلتوں میں اُلجھے ہوئے تھے، جب ابنِ آدم کا اپنے متعلق اور جدید ظاہر شدہ روحانی عالم کے متعلق اندازِ فکر اسی طرح حیلہ بازی، شک، اور بے اطمینانی کا تھا جیسے اس کے قدیم آباؤ اجداد کا مادی کائنات میں آنکھ سے اوجھل علل کے متعلق جب اس کا اعتقادی یقین ابھی نہ تو خون ریز قربانیوں سے آزاد ہوا تھا اور نہ ہی اس کو ربانی غیظ وغضب کے جادوائی خوف سے نجات ملی تھی، جب کہ محبت اور انسانی ہمدردی کا عقیدہ اپنے قدیم پنجرے کی تیلیوں کو توڑنے کی سعی میں اپنے بازو توڑ رہا تھا، اور اس کی عقل، جسے بے شمار مخالف قسم کی مذہبی رسوم نے بے دست و پا کر دیا تھا، اس کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھی، ایک بے سلیقہ کورانہ ہاتھ پیر مارنے کا دور جب انسان اپنی آخری زنجیریں توڑنے کی کوشش میں ہر پھر کر ذہنی ظلمت میں اپنی ہی بڑھی ہوئی جبلتوں سے

الجھنا تھا جو ہشت نیش صدفے کی طرح اسے لپٹی ہوئی تھیں اور اس کی کوششوں کو مفلوج کر رہی تھیں[1]۔

پچھلے باب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ خالق کائنات نے جب ابن آدم کو قوت اختیار عطا فرمائی تو اپنی قدرت کاملہ کے کچھ حصے سے بھی دست بردار ہو گیا۔ کتاب پیدائش کے دوسرے باب کے مفہوم، اور خود ہمارے مفروضے کے

---

[1] (از مترجم) جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے! اس پیراگراف کو پڑھ کر معاً جو خیال ناظر کے دل میں پیدا ہوگا وہ یہ ہے کہ جن ارثی اوہام، تعصبات، اور جذبات کا ذکر مصنف نے بار بار کیا ہے اور جن سے ابن آدم کا چھٹکارا پانا بہت مشکل بتایا ہے ایسی ہی عیسائیت کی قدیم اسلام دشمنی کے "ہشت نیش صدفے" نے مصنف کو محقق سے ایک مشنری بنا دیا ہے۔ بہیں عقل و دانش بباید گریست۔ چونکہ مصنف نے اسلام کے تصور الوہیت پر براہ راست کوئی اعتراض وارد نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے تصور پر کیا ہے اس لیے حسن ظن سے کام لے کر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ مصنف قرآن پاک کی تعلیمات سے بے خبر ہیں اور ان کی اس رائے کے ماخذ یا تو کسی عیسائی کی کتاب ہے یا کسی مسلمان گروہ یا قبیلے کے اعمال۔ اگر وہ اسلام کی دعوت سے واقف ہوتے تو غالباً ان کو ایسی رائے قائم کرنے میں حجاب ہوتا۔ قرآن پاک سارا نہ سہی اگر وہ صرف سورۂ فاتحہ ہی سے واقف ہوتے تو اسلامی تصورات الوہیت کو فقید المثال سمجھتے۔ وہ

(اگلے صفحہ پر)

مطابق ابنِ آدم ایک حقیقی آزادی کا مالک ہے جو اسے خالق کائنات نے اپنی منشائے تخلیق کے تحت اسے بخشی ہے اور یہی نوعِ انسان میں یہی قوت، انتخاب اصلح، کے لئے آلہ ہے۔ اب اسے

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) دیکھئے کہ دن میں متعدد مرتبہ ایک مسلمان اس سورۃ کو پڑھتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی عبادت ہی نامقبول ہے اور خود "قرآن پاک" نے اس کو ایک وقیع مرتبہ عطا فرمایا ہے اور مسلمان اس سورۃ کو پورے "قرآن پاک" کا ماحصل سمجھتا ہے۔ اس میں خدائے برتر و تعالےٰ کو ثنائے جمیل پیش کرنے کے بعد اس کو "رب العالمین" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ "رب" اس ہستی کو کہتے ہیں جو بتدریج اپنی مخلوق کو ادنیٰ حالت سے اعلےٰ حالت پر پہنچانے کے لئے جملہ ضروری سامان مہیا کرے۔ پھر رب کہہ کر اس کا تعلق صرف اپنی ذات سے قائم نہیں کرتا اور نہ ہی صرف اس کرہ ارض اور اس کی جملہ مخلوق سے بلکہ "عالمین" کا لفظ رب کے ساتھ شامل کرکے وہ پوری کائنات ارضی و سماوی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور یوں اس بات کا تصور باندھتا ہے کہ جس خالق نے کائنات کی تخلیق کی ہے اس نے جملہ مخلوقاتِ کائنات کی ربوبیت کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔ گویا اس ایک تصور نے پورے قانون ارتقاء کو جو نہ صرف کرۂ ارضی پر جاری ہے بلکہ ساری کائنات میں جاری ہے اپنے گھیرے میں لے لیا پھر اس کی رحمت عام اور رحمت خاص کا اعتراف کرکے اس کو عدالت کا ذکر کیا ہے اور پھر "ایاک نعبد" "وایاک نستعین" کہہ کر شرک اور استعانت غیر کی ساری راہیں بند کر دی ہیں۔ اسلام کی دعوت کا صحیح مقام

آگے عمل بقائے اصلح کے حقدار سب سے زیادہ طاقت ور، سب سے زیادہ چابک دست، اور سب سے زیادہ مضبوط جثّے والے حیوان نہیں بلکہ یہ حق ان بہترین افراد کا ہے جو اخلاقاً سب سے زیادہ مرتقی ہیں۔ اس جدید فضیلت کا ظہور اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ابن آدم کو اپنے صراط کے انتخاب میں آزادی ہو۔ اس لیے یہی وہ صریح حدبندی

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) ذہن میں قایم کرنے کے لیے ان چند آیات پر غور فرمایئے جو نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتی ہیں:۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۳۵:۲۵)

اور دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا کا کوئی رسول تنبیہ کے لیے نہ بھیجا گیا ہو۔

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳:۷)

اے پیغمبر! تم اس کے سوا اور کیا ہو کہ (بدعملیوں کے نتائج) سے لوگوں کو متنبہ کرو۔ اور دُنیا کی ہر قوم میں ایسے ہدایت کرنے والے گذرے ہیں۔

پھر سب نبیوں اور رسولوں پر جو صحیفے وہ لائے ان پر ایمان لانے کا حکم صادر فرمایا:۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا

اے پیغمبر! کہدیجے ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر، جو کچھ اس نے ہم پر، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل فرمایا،

جو خالقِ کائنات نے خود اپنی مرضی سے اپنی قدرتِ کاملہ پر عائد کی ہے تاکہ اپنی پسندیدہ نوع کو آزاد قوتِ ارادہ دے کر اپنی آخری آزمائش

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ)

أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ (۳ : ۸۴)

اس پر ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دُنیا کے سب نبیوں کو پروردگار کی طرف سے ملا اس پر ہمارا ایمان ہے ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے الگ نہیں کرتے (یعنی ایک کو مانیں دوسرے کو نہ مانیں) اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور یوں چاہتے ہیں کہ (کفر و ایمان کے درمیان) نیا راستہ پکڑ لیں تو یقین کرو یہی لوگ ہیں جن کے کفر میں کوئی شبہ

میں اس کا اندازہ کرے۔ موہبت ربانی سے ضمیر کی دولت پاکر ابنِ آدم
کو ایسی آزادی ملی ہے جس کا اسے اپنے آپ کو اہل ثابت کرنا ہے کیونکہ

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ
يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ط وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۵

(۱۴۹ : ۴)

نہیں اور کافروں کے لئے رسوائی کا عذاب
ہمارے پاس تیار ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور
اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور کسی
رسول کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا تو
بلاشبہ یہی لوگ ہیں جن کو عنقریب اللہ
اجر عطا فرمائے گا اور اللہ تو بڑا ہی بخشنے والا
مہربان ہے۔

پھر قرآن پاک نے متعدد ارشادات میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ ہر
رسول اور ہادی خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی مبعوث ہوا ہو ایک ہی دین اور ایک
ہم تعلیم لے کر آیا تھا۔ اور وہ دین تھا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ
مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ

اے پیغمبر! ان اہل کتاب سے کہیئے کہ
تم جو ہماری مخالفت کرتے ہو تو بتلاؤ ہمارا
اس کے سوا کیا جرم ہے کہ ہم اس پر جو ہم پر

اس میں ناکامی کی سزا بہیمیت کی طرف ارتجاع ہے۔
خدا کی قدرتِ کاملہ کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ ابنِ آدم

بسلسلۂ صفحۂ گزشتہ:۔

أَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ٥ (٥:٥٩)

نازل ہوا ہے اور اس پر جو پہلے نازل ہوا ایمان رکھتے ہیں اور تم میں زیادہ لوگ ایسے ہیں جو گمراہ ہیں۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (١٩:٣٦)

یاد رکھو کہ اللہ میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے پس تم اسی کی بندگی کرو یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا

اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! جب تک تورات اور انجیل اور اُن تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں حقیقت قائم نہ کرو اُس [illegible] تک دین میں سے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں اور اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے اوپر جو کچھ نازل ہوا ہے

جو سمندری کیڑوں کی نسل سے نمودار ہوا ہے، آج اس بلند مقام پر جلوہ فرما ہے کہ وہ مستقبل میں پیدا ہونے والی مکمل انسانی

بسلسلہ صفحہ گذشتہ :-

وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥

(۶۹-۶۸:۵)

تم دیکھو گے) کہ اس کی وجہ سے ان کی سرکشی اور انکار اور بھی بڑھ جائے گا۔ تو جن لوگوں نے انکار حق کیا ہے ان کی حالت پر بے کار غم نہ کھاؤ۔ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں، جو نصاریٰ ہیں (یہ ہوں یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی ٹھیک ہوئے تو اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غمگینی۔

ان آیات سے اور اسی مفہوم کی بہت سی آیات ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب اور نبیوں سے کوئی مختلف دعوت نہیں لایا تھا اور سب رسولوں کی دعوت مشترکہ یہی تھی کہ خدائے واحد پر، اس کے رسولوں اور ان کے لائے صحیفوں پر ایمان لایا جائے۔ یوم آخرت پر یقین ہو اور اعمال صالح ہوں۔ اس تعلیم سے جو سیٹ

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہستی کا تصوّر کر سکتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس کے اخلاف میں ظاہر ہو۔ مسیح علیہ السّلام کی زندگی اس کا ثبوت ہے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

قلب اور حقیقت فہمی کی تلقین مسلمان کو ہوئی ہے وہ اُن اُمتوں کو کہاں نصیب ہے جو بزعم خود خدائے عالم اور اس کی نعمتوں کو واحد اپنا حق سمجھتے ہیں۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

لَیْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ ۝ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ۭ وَاُولٰىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ۝

(۳ : ۱۱۳ - ۱۱۵)

یہ بات نہیں کہ سب اہل کتاب ایک ہی طرح کے ہوں۔ انہیں اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اصل دین پر قایم ہیں۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں بُرائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے راستے پر تیز رفتار ہیں اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک لوگوں میں سے ہیں تو

کہ یہ خواب نا قابلِ تعبیر نہیں بلکہ ایک دسترس پذیر لمحہ اُجین ہے۔ انسانی عظمت کی بازی لگا کر جو جنگ ضمیر اور جبلتوں میں جاری ہے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ ان کی نیک اعمال کی قدر نہ کی جائے وہ جانتا ہے کہ کون پرہیزگار لوگ ہیں۔

سورۃ انعام میں پچھلے نبیوں کا ذکر فرما کر خود رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے :-

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط (۶: ۹۰)	یہ لوگ وہ ہیں جنہیں اللہ نے راہِ حق دکھائی پس اے پیغمبرؐ تم بھی انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔

پھر اس "تلقین رواداری" پر بھی توجہ فرمائی جائے :-

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ص ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ	اور دیکھو جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں تم ان کو برا بھلا مت کہو کیونکہ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ بھی از راہِ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہینگے۔

وہ اس بات کی شاہد ہے کہ اسی ذریعے سے وہ نصب العین حاصل
کیا جاسکتا ہے۔ قانون ارتقاء کی پوری تاریخ پر اجمالی نظر ڈالنے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶ : ۱۰۸)

(ہم نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے) کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر آخر آنا تو سب کو اللہ ہی کے پاس ہے اور تب ان کو اپنے عملوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

دین کی صحیح حقیقت کو کتنا خوبصورتی سے ارشاد ذیل میں واضح فرمایا ہے :-

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ

اور دیکھو نیکی یہ نہیں کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کر لیا، نیکی کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، تمام آسمانی صحیفوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لایا جائے اپنا مال خدا کی محبت میں رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور مانگنے والوں

سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عمل ارتقاء نے ہماری بلند مرتبت اُمنگوں کو، گو یہ اُمنگیں ابھی سب پر بخوبی واضح نہیں، ایک

بسلسلہ صفحہ گذشتہ :-

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَہْدِہِمْ اِذَا عٰہَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ

(۲ : ۱۷۷)

کو دیا جائے اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کیا جائے نماز قائم کی جائے۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔ قول و قرار میں پختگی ہو، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں ثابت قدم رہا جائے جو ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دین میں سچے ہیں اور پرہیزگار ہیں۔

اب رہا غور و فکر اور حواس و عقل سے کام لینے کا معاملہ تو جتنی کثرت سے قرآن پاک نے اس کی دعوت دی ہے شاید کسی اور مذہب کے صحیفے میں اتنی تاکید کی گئی ہو۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ قرآن خدا کا آخری پیغام اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی۔ انسان نے حواس کی رہبری سے نکل کر عقل کی رہنمائی میں ارتقاء کے مدارج طے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ شاید ہی کوئی سورت قرآن پاک کی ایسی ہو جس میں کائنات کے مختلف گوشے پیش کرتے دعوت فکر نہ دی گئی ہو۔ البتہ قرآن پاک کا طریقہ ہدایت منطقیانہ

حیرت انگیز قابل ادراک مہم کے ساتھ ہم آہنگ طور پر مربوط کرکے' ایک نمایاں قدر و قیمت بخشتی ہے۔

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

اور فلسفیانہ نہیں۔ سیدھا سادہ ہے اور انسان کے وجدان اور عقل کو غور و فکر کی دعوت دے کر اپنی ہستی کا یقین دلاتا ہے۔ عبادت کا مطالبہ کرتا ہے اور شرک کی راہیں مسدود کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۙ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱ : ۲۰-۲۱)

اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں (معرفت) کی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (۱۲ : ۱۰۵)

اور آسمان و زمین میں (معرفت حق) کی کتنی ہی نشانیاں ہیں لیکن لوگ ان پر گذر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ

وہ خالق کائنات جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور

جہاں تک کہ اس کسی قدر بے تعلق اعتراض کا تعلق ہے جو اس شکل میں وارد کیا جاتا ہے کہ "اگر خالق کائنات کو قدرت کاملہ

لسلسلہ صفحہ گذشتہ :-

مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

(۱۰ : ۵)

پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں مقرر فرمائیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب دریافت کرلو بلاشبہ یہ سب کچھ خدا نے پیدا نہیں کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ اس نے ان لوگوں کے لیے جو صاحب علم ہیں اپنی نشانیاں واضح کردی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳ : ۱۸۸)

وہ ارباب دانش جو کسی حال میں خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، یا لیٹے ہوں اور جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت پر غور و فکر کرتے ہیں۔

اللہ اپنی کی نظارے دیکھیے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ دعوت عقل ہے یا عقل کے

حاصل ہے تو اس نے آغاز کار ہی سے ایک مکمل ہستی کیوں نہ پیدا کر دی؟ کیوں یہ آزمائشیں اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

ساتھ بہر آج مسلمان اپنے ادبار کے دور میں غافل سہی لیکن کیا مسلمانوں نے خدا کی کائنات پر غور کر کے سائنس کی تحقیقات۔ علم الافلاک کی تحقیقات اور طب کی تحقیقات اپنے زمانہ اقبال میں نہیں کی تھی اور موجودہ یورپ کو علوم کی درخشاں شمع نہیں دی تھی اور کیا وہ خدا کی نشانیوں پر غور کر کے یہ پکار نہیں اٹھتے تھے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳۰: ۱۹۱)	اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ تو نے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ایک بیکار و عبث سا کام ہو۔

اب آیئے لگے ہاتھوں اسلامی تصورِ الوہیت کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ جب اسلام کی شمع ہدایت دنیا میں نور افشاں ہوئی اس وقت مشہور فلسفے اور مذاہب چینی، ہندوستانی، بدھ، یونانی، مجوسی، صابی، یہودی اور عیسائی تھے، پیشتر اس کے کہ ہم ان سب قوموں کے تصورِ الوہیت پر روشنی ڈالیں ہم خود مصنف کا مقولہ جس سے اس نے اپنی کتاب کی ابتدا کی تھی آپ کو یاد دلاتے ہیں

"انسان کو کائنات کا ادراک دو مختلف راستوں سے حاصل ہوتا ہے"

(باقی اگلے صفحہ پر)

مارنے کا طویل سلسلہ اختیار کیا گیا ہے؟" تو ہم اسے اس کتاب کے صفحہ ۴۵ کی طرف توجہ دلاکر آسانی سے اسکا جواب دے سکتے ہیں۔ ہم نے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ ۱۔

بالکل ممکن ہے کہ بالآخر دونوں طریق سے ایک ہی نتیجہ حاصل ہو۔ پہلا راستہ وحی کا ہے۔ یہ راہ راست ہے لیکن انسان کی کثیر تعداد کے لئے یہ راستہ بند ہے اور عقلی دلائل سے اسکو کوئی واسطہ نہیں۔ خوش نصیب ہے وہ گروہ جس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا راستہ کلیتًا علمی اور عقلی ہے" مسلمان بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور چونکہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا کا کوئی قریہ اور ملک ایسا نہیں جہاں خدا نے کوئی رسول اور ہادی نہ بھیجا ہو اس لئے اس کا دعویٰ ہے کہ سب مذاہب کا اساسی تصور الوہیت ایک ہی ہے اور وہ اسلامی تصور ہی کے قریب قریب ہے۔ مرور زمانہ اور تغیرات عالم نے جو اختلافات اس تصور میں پیدا کئے ہیں وہ انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں جب انکشافات سائنس نے ابنِ آدم کو مرعوب اور مبہوت کرکے مذہبی معاملات سے غافل کر دیا اور قانون ارتقاء سائنس کی دنیا میں نمودار ہوا تو علمائے سائنس اور ان کے پیروکار فلسفیوں نے تصور الوہیت کو بھی ارتقائی مدارج میں دیکھنا شروع کیا اور اشیاء پرستی، اجرام پرستی، اور اصنام پرستی سے خدا کے تصور کے ڈانڈے ملا دیئے اور یہی عقیدہ مصنف کا بھی ہے۔ لیکن ابھی اس خیال کو زیادہ تقویت حاصل

ناظر کو آگاہ کیا تھا کہ اسے تشبیہی دلائل یعنی "جز تو ہے کے نقطۂ نظر"
والے رجحانات سے بچنا چاہیئے اور کائناتی مظاہر کو اپنے مشاہدے

سلسلہ صفحہ گذشتہ:۔

یہ ہونے پائی تھی کہ کھدائیوں کے ذریعے قدیم قوموں کے متعلق معلومات حاصل ہونا
شروع ہو گئیں۔ مصر۔ دجلہ و فرات۔ ٹیکسلا۔ موہنجو دارو۔ اسٹریلیا وغیرہ میں
جب پرانے آثار کھد کر سامنے آئے اور موسو ماتی علم (PANTOLOGY) کی
بنیادیں مضبوط ہونے لگیں تو اب پتہ چلتا ہے کہ قدیم قوموں کا تصور الوہیت توحیدی
تھا اس میں تنزل اور ارتجاع بعد میں پیدا ہوا اور اصنام پرستی آئی۔ اور یہی دعویٰ
قرآن پاک کا ہے اور یہی تعلیم اور سب صحائف آسمانی کی ہے۔ چنانچہ ڈ ۔ بی شمٹ
(W. SCHMIDT) پروفیسر وائنا یونیورسٹی جنہوں نے اس موضوع پر
زمانہ حال کی بہترین کتاب لکھی ہے رقمطراز ہیں:۔

"علم شعوب و قبائلِ انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا
ارتقائی مذہب یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔ مرتب کڑیوں کا وہ
خوشنما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کر دیا تھا
اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور نئے رجحانوں نے اسے اُٹھا کر پھینکا نے پایا ہے"

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے پیمانے پر تحویل کر کے غور و فکر کرنے کی عادت کو ترک کرنا چاہیئے۔
شاہدے کے پیمانے کے مفہوم کو ہم نے اچھی طرح واضح

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

THE ORIGIN AND GROWTH OF

RELIGION BY W. SCHMIDT P. 8.

ماخوذ از ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابوالکلام مرحوم جلد اول ص ۱۲۸

یہی مصنف اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۲۶۲ پر لکھتے ہیں :-

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران وتمدن کے تصور کی "اعلےٰ ترین ہستی" فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نظر تحقیق بھی اس کے لئے کفایت کرے گی نسل انسانی کے قدیم پستہ قد قبائل میں سے اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کے جو حالات روشنی میں آئے ہیں اور کرنائی، کلین، اور جنوبی شرقی آسٹریلیا کے یائین قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کر دیا ہے (صفحہ ۱۰) اور ہم یہ بھی ثابت کر آئے ہیں کہ مشاہدے کے پیمانہ ہی کو مظاہر فطرت کا خالق سمجھنا علمی طور پر جائز ہے۔

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :۔

ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے۔ آر کینک تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے قبائل کے دینی تصورات کی چھان بین نے بھی بالآخر اسی نتیجہ کو نمایاں کیا ہے"

(ترجمان القرآن ص۱۲۸)

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

(۱۰ : ۱۹)

اور ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا پھر وہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور اگر اس بارے میں تمہارے رب نے پہلے سے ایک فیصلہ نہ کر لیا ہوتا تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا اسی دنیا میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ

ابتدا میں تمام گروہ ایک ہی تھے (یعنی ایک ہی دین پر پھر ان میں اختلاف

اب صورت حال یہ ہے کہ ہر طبعی مظہر، سریع الوقوع ہو یا بطیء الوقوع، پیچیدہ ہوتا ہے ۔ یہ ابتدائی مظاہر کے ایک مسلسل سلسلوں

بسلسلہ صفحہ گزشتہ ۴۸ :-

وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (۲ : ۲۱۳)

پیدا ہوئے، تو اللہ نے یکے بعد دیگرے نبیوں کو مبعوث کیا وہ (نیک عملی کے نتائج کی) بشارت دیتے (اور بدعملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے نیز ان کے ساتھ کتاب (یعنی وحی الٰہی سے لکھے جانے والی کتاب تعلیم) نازل کی تاکہ مختلف فیہ باتوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے ۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تصور الوہیت میں ارتقا کو کوئی دخل نہیں ۔ البتہ اس کی صفات میں ارتقا لازمی تھا اور جیسے جیسے ذہنی ترقی ہوئی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اسلام سے پہلے مذاہب اور فلسفوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تجسیم (تشبیہ) اور تنزیہ کے چکر توحید کی تصور میں اُلجھا دیا جاتے رہے ۔ تجسیم (ANTHROPOMORPHISM) ۔ سے مراد خدا کا ایسا تصور ہے جو مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہو ؛ اور تشبیہ (ANTHROPOPHUISM) سے مراد ایسی صفات اس تصور میں داخل کرنا جو مخلوق کی صفات سے مشابہ ہوں ، اور تنزیہ سے مراد یہ ہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے تواتر کا نتیجہ ہوتا ہے اور مشاہد یعنی انسان کے نقطۂ نظر سے اسکی کیفیت کا انحصار اس شرح رفتار پر ہوتا ہے جس سے یہ تواتر وقوع پذیر

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:۔

اس تصور کو کلیتہً تجسیم و تشبیہ سے مبرا رکھا جائے۔ تعدد اشراک یعنی ایک سے زائد ارباباً من دون اللہ (POLYTHEISM) کی پرستش بھی رہی لیکن توحید MONOTHEISM کی طرف میلان غائب نہیں ہوا۔ صفات الٰہی میں قہر و غضب ابتدا میں زیادہ رہا لیکن بالآخر یہ رحمت و جمال میں تبدیل ہوئے۔

قدیم زمانہ میں چینیوں کے ہاں علاوہ آباؤ اجداد پرستی کے کچھ مقامی دیوتا بھی پوجے جاتے تھے۔ لیکن آسمانی رب الارباب کا تصور بھی خواص میں تھا۔ مندروں میں قربانیاں بھی دیوتاؤں اور بزرگان قبیلہ کے نام پر ہوتی تھیں لیکن یہ شفاعت کے لئے وسیلہ سمجھی جاتی تھیں قہر و غضب کے ساتھ ساتھ رحم و کرم بھی تصور میں داخل تھے۔ عوام میں تعدد اشراک کا عقیدہ رائج تھا۔ خواص توحید کی طرف مائل تھے۔ مگر عوام کے عقیدے سے تعرض بھی نہ کرتے تھے۔ (ور بدھ مذہب کے رائج ہونے تک یہی صورت حال رہی۔

ہندوستانی مذہب اور فلسفوں نے بلند درجہ تنزیہ کا حاصل کر لیا تھا لیکن تشبیہ کی ساری صورتوں کی نفی کرتے کرتے تصور الوہیت میں ایک ایسا تعطل پیدا ہو گیا تھا

ہوتا ہے۔ ایک صد درجہ سست رفتار مظہر کا وجود ہی ایسے مشاہد کی نگاہوں سے محجوب رہے گا جس کی عمر اتنی قلیل ہے کہ وہ بیک وقت

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:۔

جو عوام کالانعام کے فہم سے بالاتر تھا اس لئے "اکبر است" یعنی حقیقت یگانہ کو عوام کے قریب لانے کے لئے اوتاروں کے روپ میں ظاہر کرنا پڑا اور پھر وہ سلبی صفات جو تنزیہ کا باعث ہوئی تھیں مثبت صفات بن کر اوتاروں کو ملیں۔ اور شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت نے عوام کو اصنام پرستی ہی میں اُلجھائے رکھا اور یہ بھی اپنی بت پرستی کے جواز کے لئے وہی کفار عرب والی دلیل پیش کرتے رہے ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفا"۔ اللہ اکبر شرک میں توحید کا خیال موجود ہے۔ ایسی ہی بودی دلیل کچھ آج کل کے قبر پرست مسلمان بھی دیتے ہیں۔

حکمائے یونان میں بھی تقریباً یہی صورت حال تھی جو ہندوستان میں انہوں نے غور و فکر سے توحید کے نقطے کو حاصل کر لیا تھا اور اکثر ان میں سے بلند پایہ پاکیزہ زندگیوں کے مالک تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اولمپس کے دیوتا کوئی حقیقت نہیں رکھتے لیکن جو یقین کا درجہ عقل و استدلال سے حاصل کیا جائے وہ عوام میں جاری کیسے ہو۔ چنانچہ عوام اصنام پرست رہے اور خواص خالق کی تنزیہی صورت سے مطمئن بدھ یقیناً بہت بڑے عارف ہوں گے اور برہمنی اصنام پرستی سے انکی

اس مظہر کے آغاز، ارتقا، اور انجام پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر وہ مظہر جو بجائے چند منٹوں یا چند گھنٹوں میں تکمیل پانے کے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

مسلسل جنگ ان کے اعلیٰ توحیدی اعتقاد کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب امر ہے کہ پیروان بدھ مذہب میں خدا اور روح کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن انسانی روح کی عبادت کی تڑپ کیسے تسکین پاتی۔ اس نے بدھ کی تعلیم کے علی الرغم خدا نہ ملا تو بدھ کے اتنے بت اپنی پرستاری کے لئے بنا ڈالے اور ان کی وہ پرستش ہوئی کہ خدا کی پناہ۔

مجوسی مذہب ایران میں نمودار ہوا تھا اور چونکہ ایران کے باشندے آریا نسل سے ہی تھے اس لئے ان کے عقائد میں بھی وہی آریا ورت کے تصورات کارفرما رہے۔ حضرت زرتشت نے اگر آہورا مزد یعنی خدائے واحد کی تعلیم دی اور فرشتوں کے وجود کو احکام خداوندی کی تعمیل کے لئے ضروری قرار دیا لیکن یہ تعلیم بھی زیادہ دن نہ چلی اور قدیم خیالات اُبھر آئے۔ اسلام کے ظہور کے وقت مجوسی مذہب ثنویت کے عقیدہ کی تعلیم دیتا تھا یعنی خیر و شر کے دو مطلق العنان خدا مانے جاتے تھے اور آگ کی پرستش ہوتی تھی۔

صابئی مذہب خود عرب میں رائج تھا اور یہ اجرام سماوی اور فرشتوں کی

دس ہزار برس میں جاکر مکمل ہو ایسے جوان کے لئے جس کی عمر فرض کیجئے پچاس برس ہے کوئی وجود ہی نہ رکھے گا۔" تاہم ابن آدم کیلئے

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

پوجا کرتے تھے" یعنی وہی عوام اصنام پرست تھے مگر خواص توحید کی طرف مائل تھے مگر تصور الوہیت اُلجھا ہوا اور تجسیمی تھا۔ ان کا ذکر قرآن پاک نے اہل کتاب کے ساتھ ساتھ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نیکوکار لوگ بھی تھے۔

جن دو بڑے مذہبوں سے بلا واسطہ اسلام کو سابقہ پڑا وہ یہود اور عیسائیوں کے مذہب تھے۔ اسلام ان مذاہب کے رسولوں سے اور ان کے صحیفوں کو تسلیم ہی نہیں کرتا ہے بلکہ بڑی عظمت سے ان کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں مذہب اپنے پیغمبروں کے لائے ہوئے دین سے دور ہٹ چکے تھے اور آسمانی صحیفوں میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفوں کے مجرم تھے۔ جس کتاب پیدائش کا قابل مصنف نے متعدد بار ذکر کیا ہے اس میں "یہودا" کا تصور ایک نسلی خدا کا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ حضرت یسعیاہ علیہ السلام نے ان کو بعد میں تمام قوموں کے خدائے واحد کی تعلیم دی مگر یہود برابر اپنی قوم کو خدا کی چہیتی قوم اور "یہودا" کو اپنی ہی قوم کا خدا قرار دیتے رہے۔ نیز اس تصور میں قہر و غضب کا نمایاں حصہ ہے۔

بعض صورتوں میں اس کا وجود ہوگا کیونکہ اس کا تجربہ روایات کی
کی بدولت زیادہ مدت پر ممتد ہوگا۔ ماہرانِ سائنس نے یکے بعد دیگرے
کئی صدیوں کے دوران میں مظہر کی درمیانی صورتوں کا احتیاط کے ساتھ

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رحم و محبت کا عنصر تصورِ الوہیت میں شامل فرمایا
لیکن تجسیم و تشبیہ کی بو اس میں ویسی ہی باقی رہی جیسے یہود کے ہاں۔ یہود کے ہاں اگر
خدا اور عبد کا تعلق میاں بیوی کے رشتہ سے ملتا جلتا تھا تو عیسائیت میں باپ بیٹے کا
ہوگیا اور یہ صحائف آسمانی کی تمثیلی بیان کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ عیسائیت کا سابقہ جب
رومیوں کی اصنام پرستی سے پڑا تو اس امتزاج کا نتیجہ "اقانیم ثلاثہ" اور "کفارہ" جیسے مشرکانہ
عقیدے وجود میں آئے اور پھر کھلم کھلا حضرت مسیحؑ اور حضرت مریم علیہا السلام کے
بتوں کی پرستش شروع ہوگئی۔ جب آفتابِ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم طلوع ہوا تو ہر
مذہب میں تصورِ الوہیت کی ایسی ہی صورت بن چکی تھی۔ قرآن پاک نے یہ اعلان کیا:-

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ (۴۲: ۱۱) — اس کے مثل کوئی شے نہیں (کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھیرا سکتے)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ — انسان کی نگاہیں اسے نہیں پاسکتیں

هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ — لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے

جائزہ لے کر اپنے نتائج کو محفوظ کر دیا ہے اور یکے بعد دیگرے یہ تحریری مواد ماہروں کے سامنے رہا ہے ان سب کو بحیثیت مجموعی ایک

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

اَللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۵ (۶ : ۱۰۳)	وہ بڑا ہی باریک بین اور آگاہ ہے۔

تجسم و تشبیہ کا خاتمہ کر دیا لیکن تنزیہ کو تعطل تک نہیں پہونچنے دیا کیونکہ ایسی صورت میں انسانی فطرت کے تقاضے پورے نہ ہوتے اس لئے یہ فرماکر

اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲ : ۱۸۶)	اور جب میرا بندہ تجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اس سے کہیے کہ میں اس سے دور کب ہوں میں تو بالکل اس کے پاس ہوں۔

اپنے اور بندے کے رشتے کو مستحکم فرما دیا ہے اور تصور میں زندگی پیدا کر دی ہے۔ توراۃ میں خدا کا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آنا مذکور ہے جو امکانی صورت نہیں مگر قرآن پاک میں صرف تجلی کا ذکر ہے۔ یہ امر اور غور کے قابل ہے کہ کس صحیح طریقے سے شرک کے راستے آگے کو بند فرمائے ہیں کہ رسول پاک کے عبد ہونے اور خدا کی توحید کا ہر مسلمان روزانہ کلمۂ شہادت پڑھ کر اقرار کرتا رہتا ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ

(باقی اگلے صفحہ پر)

انسان سمجھا جا سکتا ہے جس کو وسیع حافظہ (روایات کی بدولت) ملا ہے اور جو اپنے مشاہدات مجتمع کرتا رہا ہے۔ علم الافلاک اسی طرح پر تعمیر ہوا۔

اس کے برعکس ایک ایسا منظر بھی شاہد کی دسترس سے باہر

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:۔

وَرَسُوْلِهٖ۔ رسول مقبولؐ کے وصال پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعے سے مسلمان واقف ہے کہ حضرت ابوبکر نے برسرِ منبر آ کر یہ فرمایا:۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ۔

(بخاری شریف)

جو کوئی تم میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمد (صلعم) نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا اُس کو جان لینا چاہیئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں۔

اور پھر قرآن پاک کی شہادت پیش فرمائی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ

اور محمد (صلعم) صرف ایک رسول ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہوگا جو آناً فاناً اتنے کم وقت میں وقوع پذیر ہوجائے کہ اس کا بلا واسطہ مشاہدہ اس لمحے تک ممکن نہ ہو جب تک کہ شاہد کے حسّی

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ

(۳ : ۱۴۴)

گزر چکے ہیں پس اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائے گا۔ وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) وہ اللہ کا ہرگز کوئی نقصان نہیں کرسکتا۔

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ

(۶ : ۵۰)

اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہدو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا جاننے والا ہوں نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں فرشتہ ہوں میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ میں اسی بات پر چلتا ہوں جس کی خدا نے مجھ پر وحی کردی ہے۔"

(باقی اگلے صفحہ پر)

اعضا سے زیادہ نازک اور زود حس طریقے مظہر کے واقعات کو قابو میں
لا کر محفوظ کرنے کے لیے اسے میسر نہ آجائیں۔ یا جب تک کہ وہ اس کے وجود
کو ایسے استدلال سے قائم نہ کر سکے جن کی اساس ملتے جلتے واقعات

بسلسلہ صفحہ گزشتہ :-

ان سے پوچھو کہ کیا حقیقت سے اندھا
اور حقیقت کا بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا
تم غور و فکر نہیں کرتے؟

جب اتنے اعلان قرآن کریم کرے تو کیا کوئی راستہ شرک کا باقی رہ جاتا ہے
اور مسلمان بھٹک سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کچھ آیات محکم اور واضح
ہوتی ہیں اور کچھ متشابہات جن کو حل کرنا حواس و عقل کا کام نہیں اور قرآن نے اس کو
واضح کیا ہے اور متشابہات پر جن میں مجملہ اور غیبی امور کے تصور الوہیت اور روح
بھی شامل ہیں اور جو حواس و عقل کے بس میں آنے والی نہیں غور کرنے سے روک دیا
ہے۔ اور ایسی ہی متشابہات سے یہود اور نصاریٰ نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مسلمان کا تصور
الوہیت واضح اور صاف ہے جس کا ایجابی پہلو یہ ہے "ھو اللہ احد" اور سلبی پہلو
"لیس کمثلہ شیٔ" ہے۔

یہ حاشیہ طویل ہو گیا ہے لیکن اسکے سوا مصنف کی غلط خیال رفع ہونا ممکن نہ تھی اس حاشیے میں میں نے مولانا ابوالکلام مرحوم کی ترجمان القرآن جلد اول تفسیر سورۂ فاتحہ سے استفادہ کیا ہے جزاہ اللہ احسن الجزا۔ جن صاحبان کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ اس تفسیر کو دیکھیں نہایت درجہ مفید چیز ہے۔

پر ہو۔ تاب کاری اور برقیاتی علم کی ترقی اسی طریقے سے ہوئی۔ انسانی ارتقا میں روایات نے جو غائر کا یا پلٹ کی ہے اس کی یہ صرف ایک مثال ہے۔ جو رابطہ کہ انسان نے یکے بعد دیگرے نسلوں میں ڈھونڈ نکالا ہے وہ ایک زندہ اور ترقی پذیر رابطہ ہے۔ جو بتدریج مگر مسلسل تغیر پذیر بھی ہے اور ترقی پذیر بھی لیکن اس کی سمت متعین اور پائیدار ہے۔

سائنس ہمیشہ اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ ہمارے حسیاتی نظام کی خامیوں کی تلافی کرے کیونکہ ہمارے حواس کی موزونیت ہمیشہ خارجی مظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی سست رفتار متحرک اشیا اور مستسرع متحرک تصویریں بہت سے ایسے واقعات کا اظہار کرتی ہیں جن سے ہمارے حواس کی کوتاہیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر شخص نے وہ فلمیں دیکھی ہوں گی جن میں پھول کا کھلنا دکھایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا سست رفتار منظر فطرت ہے جو بغیر کسی آلے کی مدد کے انسانی آنکھ کے قابو کی چیز نہیں۔ کھلنے والی پنکھڑی کا لاثانی حسن فلم کے ذریعے ہم پر منکشف ہوا۔ نسیج کے نشوونما کی وضعیت خیاطیت[1] (MITOSIS) (نواۃ کا خلیوں میں انتشار اور

---

[1] (از مترجم) MITOSIS ان تغیرات کے سلسلے کا نام ہے جو خلیہ کے انقسام کے وقت اس کے نواۃ
(باقی اگلے صفحہ پر)

خلیوں کا انقسام) کی میکانکیت، زخم کی اندمالیت[1] (CICATRISATION) کے مراحل سب ایسے سست رفتار عمل ہیں کہ آنکھ ان کو محسوس نہیں کر سکتی مگر دار التجربے میں اسی طریقے پر ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح بہت سے نئے مظاہر فطرت کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مستسرع سنے میٹوگرافی نے (CINEMATOGRAPHY)[2] جس میں ایک ہزار تصویریں فی سیکنڈ اتاری جاتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، ایسے مظاہر کی میکانکیت کا انکشاف کیا ہے جو انسانی آنکھ کے لئے نہایت سریع الوقوع ہے جیسے مثلاً بندوق کی گولی کا کسی لکڑی کے تختے یا دھاتی چادر میں نفوذ کا عمل، مکھی کے پروں کی حرکت، یا بارود کے دھماکے کا عمل۔ ان صورتوں میں مظہر آنی اور فوری ہوتا ہے لیکن متحرک تصویریں لینے والا کیمرہ ان اعمال کا ایک متوالی سلسلے میں تجزیہ کر کے

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) NUCLEUS میں پیدا ہوتے ہیں، خلیہ بار یک ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے جن کو کروموسوم (CHROMOSOM) کہتے ہیں اور یہی ان توارثی خاصیتوں کے حامل ہوتے ہیں جو ماں خلیہ بیٹی خلیہ کو ورثے میں دیتی ہے۔ متوسس یونانی لفظ MITOS سے بنا ہے جس کے معنی رشتے یا خیاط دھاگے کے ہیں۔

[1] (از مترجم) زخم کے اندمال کے وقت جو نسیج بنتی ہے اسے (CICATRISATION) کہتے ہیں۔

[2] (از مترجم) سنے میٹوگرافی متحرک تصویریں بنانے اور دکھانے کا طریقہ۔

ان کو قابلِ مشاہدہ مظاہر بنا دیتا ہے جن کا پہلے ہم کو کوئی علم نہ تھا۔
سائنس سے ناواقف شخص کو اس حقیقت پر دسترس نہیں ہوتی کہ ہمارے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق، ہر مظہر کا وجود اور کیفیت اس کے وقفہ وقوع اور اس کی رفتار کا رہینِ منت ہے۔ مثلاً مادے کے کسی حجم کا احتراق' جیسے بارود کا، ہمارے نقطۂ نگاہ سے 'ظہور بالکل دو مختلف طریقوں پر ہوگا یعنی اگر ایک گھنٹے کے وقفے میں ظاہر ہو تو یہ ایک طریقہ ہوگا اور اگر ایک ثانیے کے دس لاکھویں حصے کے وقفے میں ہو تو یہ دوسرا طریقہ ہوگا۔ اگر ایک گھنٹے میں یہ عمل مکمل ہو تو وہ ایک حسین اور پُرامن نظارہ ہوگا اور اگر ایک ثانیے کے دس لاکھویں حصے میں ختم ہو جائے تو ایک ہیبت ناک دھماکہ ہوگا۔ ایک احتراقی دھماکے اور آگ کے جلنے میں فرق ان کی اپنی اپنی سرعت عمل ہی کا نتیجہ ہے۔
جوہری بم ہیبت ناک اس لئے ہوتا ہے کہ معمولاً سست رفتار تابکاری انتشار بم میں بے انتہا متسرع کر دیا گیا ہے۔ ایک لوہے کا گولہ جو چند گز فی ثانیہ کی رفتار سے گر رہا ہو بہ آسانی ہاتھ سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن وہی گولا اگر ۲۵۰۰ فٹ فی ثانیہ کی رفتار سے گر رہا ہو تو وہ ایک انچ موٹی لوہے کی چادر کو پار کر جائے گا۔
لہٰذا جب ہم ارتقاء جیسے کسی عمل پر غور کریں، جس کی بدولت انسانی

فہم اور ضمیر جیسی نادرہ روزگار عجائبات رونما ہوئے، تو ہمیں،
تیز رفتاری اور سست رفتاری کو کبھی قابل لحاظ نہیں سمجھنا چاہیئے ہماری
زندگی کی روانی، ہماری حسیاتی اور ذہنی میکانکیتوں جو ہمارے دماغ
کی ساخت سے متاثر ہیں، کے لحاظ سے جو واقعہ ہمارے لئے سریع ہوگا
وہی ایک عارضی کیڑے کے لئے جس کی عمر کا دوران چند دن ہے
سست رفتار ہوگا (کیونکہ اس کی عمر میں وہ مکمل نہ ہو سکے گا مترجم)
ایک ایسی خیالی ہستی کے لئے جس کی عمر کا دوران سوا رب سال ہو عمل
ارتقاء تیز رفتار ہوگا۔ خالق کائنات، جس کا وقت کے لحاظ سے تصور
ہی ناممکن ہے، کے لئے یہ عمل کن فیکون کا مترادف ہی ہوگا۔

ہمارے موجودہ سائنٹیفک غور و خوض کے محدود نمونے میں
خدا کی قدرت کا ملہ کو زیر بحث نہیں آنا چاہیئے۔ اگر ہمیں اس میں کوئی
شرم محسوس نہیں ہوتی کہ ہم جو ہر کا تصور کرنے کے بھی نااہل ہیں
جس کو ہم نے اپنی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے قابو میں کر رکھا
ہے تو ہمیں اس میں بھی عار نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے لئے خدا کا تصور
اور بھی ناممکن ہے۔ ریاضی کی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "قوت" کے
تصور کو "کامل قدرتی" کے الفاظ اختراع کر کے اس کو انتہا تک پہنچا دیا
گیا ہے کہ انسان کی دسترس میں آنے والا اب اس کا کوئی معنی ہی

باقی نہیں رہا۔ اب کشمکش کلیتاً داخلی ہے ذہنی ہے۔ ہم ہی نے یہ تصور تخلیق کیا ہے اور ہمارے خارج میں اس کا وجود نہیں۔

جو چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ ارتقا، ضمیر اور انسانی عظمت کا احساس ہیں۔ یہ شرافت انسانی کا احساس اگر عالمگیر ہو جائے تو یہ بنی نوع انسانی کو جہانگیر جنگوں جیسے تباہ کن عظیم طغیانیوں اور انقلابوں سے محفوظ کر دینے کے لئے کافی و وافی ہے۔ اخلاقی تصورات کو بیکار، ذہانت، معبودان باطل، اور جذبات بہیمیت کے تابع کر دینے کا لازمی نتیجہ وہ دہشت ناک اور المناک مصائب عظیمہ ہیں جن کے ہم شکار ہیں۔

بعض اصحاب فہم و ذکا کے نزدیک یہ ایک اور اعتراض وقیع ہے خالق کائنات ایسی زندہ ہستیوں کے وجود کو، جو بظاہر بے سود ہیں اور ابن آدم کے لئے مستقل خطرے کا باعث ہیں، باقی رکھنے کا روادار کیوں ہے؟ امریکہ کے زہریلے ٹیڑھے سانپ، کالا سمی عنکبوت، اینوفیل مچھر جو موسمی بخار کے جراثیم کا حامل ہے، کوڑھ کا بدنما جرثومہ، آتشک کا جرثومہ جو ابن آدم کی تباہی پر تلا ہوا ہے، یہ سب اور بہت سے اور حشرات اور جرثومے خالق کائنات کے اس رحم و کرم کے متضاد ہیں جو ہم اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ایک واضح جواب تو اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ اعتراض اس تصور الوہیت پر محمول ہے جس کی اساس نفسیات انسانی پر ہے یعنی خدا کے تجسیمی تصور پر۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی مشاہدے کے پیمانے پر تو یہ اعتراض جائز ہے لیکن ارتقا کے پیمانے پر اس میں کوئی جان باقی نہیں رہتی جتنا کوئی کام عظیم الشان ہوا تنی ہی جزئیات کی اہمیت اس میں کم ہو جاتی ہے۔ جب ہم ارتقا جیسے کسی عمل کی بے پایانی پر غور کرتے ہیں، جو ہمارے تصور سے ماورا ہے، تو ہم کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اس کے خالق پر ان خامیوں کی وجہ سے اعتراض کریں، جو باوجود اس کے کہ وہ افراد کی ایک قلیل تعداد کے لئے المناک ہیں اکام کی عظمت کی ضو فشانی میں کلیتًا نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ انفرادی مشاہدے کے پیمانے پر یہ ساری طبعی "خامیاں" عمل ارتقاء کے وجود کو روک نہیں سکیں۔ اس کا عمل جاری رہا اور بالآخر اخلاق کے حامل ابنِ آدم پر منتج ہوا۔ ہماری یا نی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عملِ ارتقا کامیاب رہا۔

مگر صحیح جواب اس کا اور ہے۔ جب ہم تخلیق حیات اور ارتقاء کی پختگی کی توجیہہ کرنے کے لئے کسی خارجی عامل کا وسیلہ پکڑنے پر آگئے تھے۔ جب ہمارے ذہنی نمونہ کائنات اور فطرت کے تضادنے ہمیں مجبور

کر دیا تھا کہ ہم "ضد اتفاق" جو جوہری طور پر غیر عقلی چیز ہے کو تسلیم کریں تو ہم اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ ان امور کی ممکن اور منطقی تاویل صرف یہ ہے کہ جو نظریہ خدا کے وجود کا قائل ہے اس کو مان لیں۔ ایک ماہر سائنس کے نزدیک "ضد اتفاق" اور "خدا" کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں۔ جب ہم نے یہ مفروضہ پیش کیا تھا کہ سلسلہ ارتقاء اب آگے ابن آدم اور صرف ابن آدم ہی کے ذریعے چل سکتا ہے تو کائنات اور ارتقا کی وضاحت کرنے کے لئے پھر ایک بار ہم مجبور ہوگئے تھے کہ ہم ایک نہایت درجے بعید الحصول نصب العین یعنی دوررس غائتیت کو تسلیم کریں جو ایک طاقت، ایک ذہانت، ایک مافوق الفطرت ارادہ کو عائد کرتی ہے۔

تاہم ہم نے یہ احتیاط برتی تھی کہ اس طاقت کی صفات کی حدبندی نہ کریں اور یہ طاقت صریحاً مسلمہ تصور خدا کے مطابق ہے۔ لہٰذا ہم نے مقدس نام کا استعمال تو کر لیا تھا مگر ہر ممکن حد تک تجسمی تصور سے پہلو بچایا تھا۔

اس کتاب کی ابتدا میں ہم نے یہ جملہ لکھا تھا "اگرچہ منزلِ مقصود کا تعین کر دیا گیا تھا لیکن اس منزل تک پہونچنے کے ذرائع کا تعین نہیں کیا گیا تھا"۔ یہ امر اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ہم یقینی طور

پر ایک ہی چیز جانتے ہیں یعنی ان ضابطوں اور قاعدوں کو جو مظاہر فطرت پر ایک توالی کی ترتیب عائد کرتے ہیں اور جہاں تک مظاہر کی کمیت کا تعلق ہے وہ ان ضوابط کی پابندی کرتے ہیں۔ ان سب ضوابط کے اوپر ہم کو مجبوراً ایک عمومی ضابطہ تسلیم کرنا پڑا تھا جو ان سب سے بے حد زیادہ ہمہ گیر تھا اور ان سب پر حاوی تھا۔ ابتدا کار ہی سے حیات کا ارتقار اس طرح پر ہوا ہے جیسے اس کے پیش نظر کوئی منزلِ مقصود ہو جہاں تک اسے پہونچنا تھا اور گویا کہ یہ منزلِ مقصود انسانی ضمیر تھی۔ اس مفروضے سے ہم نہ صرف انسان کی اہمیت اور اس کی ارتقار کی سمت ہی سمجھنے کے قابل ہو گئے بلکہ خود ارتقار کے بعض اندرونی امور بھی ہماری سمجھ میں آ گئے جو اس وقت تک مبہم اور کبھی کبھی بے ربط بھی تھے۔

لیکن یہ عمومی ضابطہ اُن حقیقی، معروضی، مخصوص ضابطوں کو بے اثر نہیں کرتا جو پوری طرح ہماری دسترس میں نہیں آتے لیکن جن کا دھندلا سا عکس انسانی فہم نے حیاتی اعضا کی مدد سے بنا لیا تھا۔ یہی انسانی ذہانت اس میں بھی کامیاب ہو گئی کہ ان عکسوں کو باہم کر ربط دے کر صحت کے ساتھ کچھ واقعات کی پیش بینی بھی کر لے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی طبعی ضابطوں اور ان ضابطوں میں، جن کو ہم

سائنس کے نام سے پکارتے ہیں ضرور کچھ تعلق باہمی ہے (ملاحظہ ہو باب۲)
اب اگر ہم یہ امر تسلیم کرلیں کہ کسی قوتِ عظمےٰ نے حقیقی طبعی ضابطے وضع کیے ہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جب ایک مرتبہ ضابطے نافذ ہوگئے تو وہ عمل پیرا ہوں گے، بہ الفاظ دیگر یہ طاقت خود بھی اس سمت کو نہ بدلے گی جس میں مظاہرِ فطرت ان ضابطوں کے ماتحت ظہور پذیر ہوں گے۔ اگر یہ صورتِ حال نہیں تو وہ ضوابط نہ ہوں گے محض ایک تلوّن مزاجی ہوگی۔ جب کسی مظہرِ فطرت کی ابتدا ہوجاتی ہے تو وہ اس لمحے تک بے سوچے سمجھے اس رُخ پر چلتا رہتا ہے جب تک کہ اور ضابطے موثرات ماحول کے بدل جانے پر مداخلت کرکے اپنا عمل شروع نہیں کردیتے۔ یہ امر وضاحت کرتا ہے اس کی کہ کیوں عملِ ارتقا کے دوران میں عجیب الخلقت حیوانی صورتیں نمودار ہوئیں کیسے ناکام "آزمائشیں"، وجود میں آئیں اور "فضول" صورتوں کی حیرت انگیز کثرت کا کیا باعث تھا۔ یہ مخصوص ضابطوں کی کارفرمائی تھی۔ فطرت اور عملِ ارتقا کی ظاہری بے ربطی پر ہماری بدحواسی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم بعض اوقات مخصوص ضابطوں پر ہی متوجہ رہتے ہیں (یا ان کے عکسوں پر) لیکن ان زیادہ عمومی ضابطوں کو نظر انداز کردیتے ہیں جو ان مخصوص ضابطوں

کو مربوط کرتے ہیں اور ان پر چھا جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم چند ضابطے ایسے جانتے ہیں جو بیج کے پھوٹنے یا خلیہ کی نشوونما پر عامل ہیں۔ آب و ہوا، فلاحتی واسطے کے نمکینی ارتکاز، تیزابیت، قلویت کے عمل سے ہم واقف ہیں۔ یہ واقفیت کچھ زیادہ نہیں کیونکہ ہم اس کو قطعًا نظرانداز کر رہے ہیں کہ یہ بیج کس طرح کسی خاص قسم کے پودے کو جنم دے گا جس میں اس اس رنگ اور اس اس شکل کے پھول آئیں گے اور پھر بالآخر بالکل ویسے ہی ان میں بیج بھی پیدا ہونگے۔ ہم انسانی جسم کی واقفیت رکھتے ہیں اور بعض حیاتیاتی ضابطے بھی جانتے ہیں، ہم کو مختلف خلیوں کا بھی علم ہے جن سے یہ جسم بنا ہے، لیکن ہمیں اس کا کچھ پتہ نہیں کہ ایک یکتا خلیہ یعنی انسانی بیضہ سے یہ خلیئے ممیز کیسے ہو جاتے ہیں اور اپنی بے حد خصوصی اوصاف اور مختلف کردار کیسے حاصل کر لیتے ہیں۔ نشوونما کے ضابطے اور ربط دہندہ ضابطے فی الحال ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

فطرت بے ربط نہیں۔ ابن آدم ہی ابھی جاہل ہے۔ حیاتیاتی قاعدے جو اس نے دریافت کر لیئے ہیں اور بہت سے جو ابھی اسکو معلوم نہیں ہوئے سب کا انحصار اور سادہ قاعدوں پر ہے جو ابھی جزوی طور پر معلوم ہوئے ہیں اور جو جامد مادے پر عمل پیرا

ہیں اور نیز ان ضابطوں پر جو ابھی اس کی گرفت میں نہیں آئے۔

ابن آدم کو فطرت کی وحدانی توجیہ معلوم کرنے کی کوشش میں جو مشکلات پیش آرہی ہیں ان کا منبع وہی روز افزوں عمومیت والے ضابطوں کی کثرت، اور درجہ وار ترتیب ہے جو ابھی ہماری سائنس کے اچھی طرح قابو میں نہیں آئے۔

جو مفروضہ ہم نے پیش کیا ہے اس میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جب تک موثرات موافق رہتے ہیں مخصوص ضوابط عمل پیرا رہتے ہیں کیونکہ باوجود اس کے کہ ان کا حلقۂ اثر محدود ہے، وہ ضابطے صحیح ہیں۔ عمل مطابقت ماحول جو ایک مخصوص طریقۂ کار ہے بعض اوقات عمل ارتقار کے مخالف عمل کرتا ہے (صفحہ ۹۱) لیکن اوسطاً وہ عمل ارتقار کے لئے خطرہ نہیں بن جاتا کیونکہ عمل ارتقار ایک زیادہ عومی ضابطے کے تحت چلتا ہے۔ اتفاق کے ابتدائی ضابطے فطرت میں برابر عمل پیرا رہتے ہیں لیکن جو اقعات اتفاقاً وقوع پذیر ہوتے ہیں ان میں ایک اور نامعلوم عمومی ضابطہ بھی کارفرما رہتا ہے جو ایسے واقعات کا انتخاب کرلیتا ہے جو ان کے ان خواص کی وجہ سے جو ہم کو معلوم نہیں ہوسکے اس کی نگاہ میں زیادہ تعمیل حکم کرنے کے اہل ہیں۔ بقیہ واقعات زیادہ تر اتفاقی ضابطوں ہی کے زیر اثر رہتے ہیں۔

اگر اتفاق کی وجہ سے کبھی کبھی آویزشیں (اتار چڑھاؤ) ہوتی ہیں تو اوسطاً وہ کبھی ان واقعات کے ظہور میں مخل نہیں ہوتیں جو زیادہ عمومی ضابطوں کے زیر اثر ہیں۔ یہ کچھ کہنے کے بعد اب ہم اس قابل ہیں کہ اس اعتراض کی توجیہ کر سکیں کہ کیوں وہ انواع جن کو بیکار یا مضرت رساں کہا گیا ہے جئے چلی جا رہی ہیں۔

ارتقا کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ فطرت کے خلاف ابنِ آدم کی جنگ ابھی چل رہی ہے۔ اپنی فراست کی بدولت اس نے اپنے بہت سے دشمنوں کو زیر کر لیا ہے۔ کائنات کی تسخیر دِن بدن ہو رہی ہے اور اس کی ذہانت نے اکتسابی علم کی بدولت اپنے آپ کو نئے مؤثرات کے مطابق پوری طرح ڈھال لیا ہے اور اس طرح اپنی نوع کے بقار کا انتظام کر لیا ہے۔ اگر اپنی ذہانت کو استعمال کر کے انسان سعی کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ اس کی ذہانت آگے نشوونما بھی نہ پاتی۔ لیکن ذہانت کے جنم لینے اور اس کی بڑھتی ہوئی زود حسی کے جو اس کی آئندہ نشوونما میں ممد ہے، باوجود ارتقا کی پہلی میکانکیاں ختم نہیں ہو گئیں مگر چونکہ ان کی منفعت ختم ہو چکی ہے اس لئے وہ اب سدِ راہ ہی کا کام کر رہی ہیں اور انسان کو وقتاً فوقتاً ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم ذہانت جزوی طور پر ان کی روک تھام

کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے اور مستقبل میں اور بھی کامیابی حاصل کرے گی۔ لیکن جو خطرات کہ ابنِ آدم کو فطرت یا ان حیوانی انواع سے (جن کو عملِ ارتقاء نے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا ہے) تھا اس سے زیادہ خوفناک اور مہلک خطرہ اب اسے اپنی ذہنی سرگرمیوں کی توسیع سے ہے جس کی بدولت اپنے لیئے اس نے نئی مصیبتیں پیدا کرلی ہیں۔ امریکہ کے زہریلے سانپوں اور زرد بخار کے ہر سال اتنے افراد شکار نہیں ہوتے تھے جتنے کہ اب صرف نقل وحمل (موٹر گاڑیوں، ریلوں کی پٹریوں، جہازوں، ہوائی جہازوں) کے حادثوں کی بدولت مارے جاتے ہیں اور لڑائیوں میں جان کھونے والوں کی تعداد متعدی امراض سے مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ جوہری بم ممکن ہے کسی دن اور سب حادثات کے دفترِ اعمال پر سبقت لیجائے اب ہم پر واضح ہوگیا ہے کہ اگر اخلاقی قوت اس کی نگراں حال نہ ہو تو انسانی ذہانت خود اپنے خلاف کارفرما ہوکر بنی نوعِ انسان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔ حیوانی ارتقاء میں بھی ایسی ہی گو مگو کی صورت مشاہدے میں آچکی ہے، لیکن انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ابھی تک کوئی قوت رونما نہیں ہوئی۔

انسان کی اخلاقی اور روحانی ارتقاء کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے

مستقبل کے لئے مقدّر یہی ہے کہ یہ ارتقا غالب رہے۔ مگر ابھی ہم اس مرحلے پر نہیں پہونچے اور جسمانی مطابقت کے دَور کا خاتمہ ابھی بہت دور ہے۔

آیئے اب ہم یہ سعی کریں کہ ان واقعات کو جنہیں ہم نے اپنی ارضی کائنات میں ایک پیمانے سے ناپا ہے ان کو دوسری کائنات میں منتقل نہ کریں لیکن اس سے بھی زیادہ یہ کوشش کریں کہ جو واقعات ہمارے تجربے کے ماورا ہیں ان پر انسانی فیصلے عائد کرنے سے پرہیز کریں۔ آیئے اس کارخانۂ قدرت کی لاثانی عظمت کا بحیثیت مجموعی تصوّر کرنے کی سعی کریں جو بڑی شان وشوکت مگر بعض اوقات کائنات کُلی کے مظاہر کے بے رحم سکون کے ساتھ چل رہا ہے۔ ہم یہ توقع کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ ناظر اپنے وجدان سے اور بھی غائر دلائل بہم پہونچا کر ایسے اعتراضات کی بیہودگی اور خطرات کو سمجھ جائے گا جو اس اعتقاد کو کمزور کردینے پر راجع ہیں جسے کمزور کرنے کی بجائے ہر ذی فہم انسان کا فرض ہے کہ اسے اور بھی مستحکم کرے۔

(۱۵)

تعلیم اور درس

عوام کی ترقی اور شادمانی صرف فرد کی نشوونما کے ہی ذریعہ ممکن الحصول ہے اور فرد کی اصلاح کی اساس ایسی بلند اور شریفانہ اخلاقی تربیت پر ہی رکھی جاسکتی ہے جس کو سب آزادی کے ساتھ صرف قبول ہی نہ کریں بلکہ اس کی اہمیت کو سمجھیں بھی۔ اسی لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت ارتقاء کو موجودہ منزل سے آگے بڑھانے میں آلۂ کار متصوّر ہوسکتی ہے۔

بچوں کی تعلیم، جو ہر قوم کی اخلاقی ترقی کے نقطۂ نظر سے نہایت بنیادی اہمیت رکھتی ہے ہمیشہ سیاسی اور معاشرتی انقلابات سے متاثر رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ زمانہ ماضی کے بعض دوروں میں تعلیم آج کے مقابلہ میں زیادہ فائق اور بہتر رہی ہو۔ یہ تو صریحاً ظاہر ہے کہ وہ اتنی عام پہلے کبھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ لیکن سوال کمیت کا نہیں

کیفیت کا ہے ۔ ایک ناقص تعلیم یا ایسی تعلیم جس کی بنا باطل اصولوں پر ہو اگر اپنی عمومیت میں وسیع ہو تو وہ تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہے ۔ عالمگیر ثقافت کا نظریہ تو بہت ہی خوب چیز ہے لیکن جب تک کہ لوگ تربیت کی کیفیت اور ماہیت پر متفق نہ ہوں اور اس کے لیئے مناسب زمین تیار نہ کرلی جائے یہ خیال عاجلانہ ہے ۔ بچوں کو ذہانت کا شائبہ بہم پہنچا دینا اور شُد بُد تعلیم دے دینا بجائے اس کے کہ مضبوط اخلاقی بنیادیں تیار کی جائیں جن پر علم کی عمارت کو کھڑا ہونا ہے ریت پر گھروندے کھڑے کرنے کے مترادف ہے اور یہ علمی مینار جتنا بلند ہو گا اتنا ہی اس کا دھڑام سے نیچے آ پڑنا یقینی ہوگا ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج (مترجم)

لیکن افسوس ہے کہ تعلیم میں یہ طریقۂ کار اکثر و بیشتر زیر عمل ہے ۔ غالباً اس کا موجب وہ شرمناک پراگندہ خیالی ہے جو تعلیم اور درس کے درمیان فرق کے متعلق ناہرین تعلیم کے دلوں میں ہے ۔ تعلیم کے ذمے تو یہ کام ہے کہ وہ بچے کی اخلاقی سیرت کو آراستہ کرے اور اس کو وہ چند اساسی اور غیر تغیر پذیر اصول سکھلا دے

جو دنیا کے سب ممالک میں قابلِ قبول ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ صغیر سنی ہی میں بچے کے دل پر انسانی عظمت کا خیال نقش ہو جائے۔ اس کے برعکس درس کا فریضہ یہ ہے کہ علم و ادب کی ہر اقلیم میں ابنِ آدم کا ذخیرہ معلومات بچے کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ اسے اپنا لے۔ تعلیم اس کے افعال کی رہنمائی کرتی ہے، بنی نوع انسان کے ساتھ اس کے سلوک میں آشتی کی روح پھونکتی ہے اور اسے ضبطِ نفس میں مدد دیتی ہے۔ درس اسے ذہنی سرگرمیوں کے لئے مواد مہیا کرتا ہے اور تہذیب و تمدن کی موجودہ حالت سے اس کو مطلع کرتا ہے۔ تعلیم اسے زندگی کی ناقابل تغیر اساسیں بخشتی ہے۔ درس اسے ماحول کے تغیرات سے مطابقت پیدا کرنے اور ان تغیرات کو ماضی اور مستقبل کے واقعات مربوط کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ماحول تو صرف ماضی ہی میں غیر متغیر ہوتا ہے، حال میں تو وہ لابدی طور پر تبدل پذیر ہوتا ہے۔

ایک اہم تجربی عنصر جس پر اب تک ہم نے کوئی غور نہیں کیا وہ زمان کی نفسیاتی قدر ہے۔ زمان کی صغیر سنی میں جو قدر ہے وہ وہ نہیں ہوتی جو بعد کے سالوں میں ہوتی ہے۔ عضویاتی اور نفسیاتی لحاظ سے بچے کے لئے سال کا وقفہ جوان آدمی کے سال کے وقفے

سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ دس سال کے بچے کا ایک سال بیس سال کے جوان آدمی کے دو سال کے مطابق ہوتا ہے۔ جب بچے کی عمر اور بھی کم ہو تو یہ فرق اور بھی بڑا ہوتا ہے۔ ایک بچے کے تیسرے سال اور ساتویں سال کے درمیانی وقفے کا امتداد ایک جوان آدمی کے پندرہ یا بیس برس کے برابر ہوتا ہے[1] صورت حال یہ ہے کہ اسی عمر میں بچہ وہ ڈھانچہ تیار کر لیتا ہے جس میں اسے اپنی مستقبل کی زندگی کے واقعات کو بٹھانا ہے بالخصوص اپنے اخلاقی ضابطوں کو۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بچہ اپنی صغیر سنی ہی میں معتدبہ ذخیرۂ معلومات کا اکٹھا کر سکتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کے لئے اس امر کو اپنے غور و فکر میں شامل کرنا نہایت ہی مناسب ہے۔

بچے کی اخلاقی تعلیم جوان آدمی کی اخلاقی تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔ یقیناً صغیر سنی میں یہ ضروری ہے کہ بچے کو عیب کی اہمیت اسکے نتائج کے اعتبار سے نہ بتائی جائے۔ بچے کے نزدیک عیب بذاتہٖ

---

[1] (از مصنف) مصنف کی کتاب "حیاتیاتی زمان" میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور ثبوت بہم کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب نیویارک میں میکملن اینڈ کمپنی نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی۔ نیز امریکن فلوسافیکل سوسائٹی فلاڈیلفیا کی ۱۹۳۶ء کی روئداد ملاحظہ ہو۔

ایک بُری شے ہے مطلقاً، اضافی طور پر نہیں کیونکہ عیب پر یہ حکم لگا کر اسے بتا یا گیا ہے کہ یہ سنگین شے ہے۔ عیب کی مجرد ماہیت ہی بچے کو وہ خالص اخلاقی ضبط فراہم کرسکتی ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ پیشتہ فوج جوان آدمیوں کی تعلیم کا معیار بچوں کی تعلیم جیسا نہیں ہو سکتا۔

اگر اس اصول پر کار بند نہ ہوں تو بچے کی اخلاقی تربیت ممکن نہیں کیونکہ نتائج سے اندازہ کرکے دیکھا جائے تو تقریباً ہمیشہ سب عیب قابلِ درگزر ہوسکتے ہیں۔ سیرت تو صرف صغرسنی ہی میں ڈھالی جاسکتی ہے۔

صغیر سنی کی تعلیم کا جب ہم ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مُراد یہ ہوتی ہے کہ تعلیم کی بنیاد پالنے (پنگھوڑا) ہی کے زمانے سے شروع کی جائے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس خیال سے بہت سے والدین، بالخصوص ماؤں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی اور وہ فوراً یہ اعتراض کریںگی کہ ہماری رائے مبالغہ آمیز اور حدِامکان سے باہر ہے۔ ہم ان سے متفق نہیں۔ بچے کے ساتھ جو انہیں محبت ہے اس میں خود غرضی کے اہم غیرشعوری حصے کا انہیں احساس نہیں۔ بچے کا مسکرانا، بچے کی خوشی، ان کے لئے اتنی مسرّت بخش شے ہے کہ وہ اس انضباط کو آغاز ہی میں بچے پر عائد کرنے کی اپنے

اندر ہمت نہیں پاتے جو وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن عائد کرنا پڑے گا۔ لیکن جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا جاتا ہے یہ انضباط مشکل اور تکلیف دہ ہوتا جاتا ہے۔ اگرچہ والدین بچے کے لئے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں، وہ اکثر کمزوری کر جاتے ہیں اور بعد ازاں بچے کی اخلاقی تشکیل خود ان کے لئے اور بچے کے لئے زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہے۔ ہم والدین کے تساہل کا ذکر نہیں کرتے اگرچہ اکثر اس کا بھی اس میں کافی دخل ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بچے کو ذرا چیخ لینے دیا جائے ماں کو اس میں کم مشقت اور اعصابی تکالیف معلوم ہوتی ہے کہ جونہی بچہ رونا شروع کرے وہ اسے گود میں لیکر دودھ پلانا شروع کر دے۔ ماں نے اگر ایک مرتبہ یہ کمزوری دکھائی تو بچہ اس کو بھولتا نہیں اور جلد ہی ماں کے لئے ناقابل برداشت مصیبت بن جاتا ہے۔

والدین اس پر جو اعتراض وارد کریں گے وہ ہمیں پہلے سے معلوم ہے وہ کہیں گے "پالنے ہی میں یا جب وہ ایک یا دو سال کا ہی ہے بچے کے ساتھ ایسی سختی ناممکن ہے۔ اس کی عمر ابھی ایسی نہیں کہ وہ سمجھ سکے۔ ابھی وہ ناسمجھ ہے" یہ ایک فاش غلطی ہے۔ سب سے پہلے تو ہم یہ بتا دیں کہ بچہ جب تین ماہ کا ہی ہوتا ہے تو وہ سیکھنے کے قابل

ہوجاتا ہے۔ سوال سختی کا نہیں بلکہ معاملہ صبر و استقلال کا ہے، اور ضد کا، ماں کو بچے سے زیادہ اڑ جانے کا معاملہ ہے۔ دوسرے بچے کا سمجھنا ضروری بھی نہیں، بلکہ شاید نہ ہی سمجھنا مناسب بھی ہے کیونکہ ٹھیک یہی وہ وقت ہے کہ اس کو ایسی عادات ڈالی جائیں جن کا ایک نہ ایک دن بہرحال اس کے لئے اختیار کرنا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں غیر شعوری طور پر مائیں بعض عادات پالنے ہی میں بچے کو ڈال بھی دیتی ہیں۔ کوئی بچہ نہانا پسند نہیں کرتا، پھر بھی سب مائیں، یا تقریباً سب مائیں، بچوں کو صاف ستھرا رہنا سکھلاتی ہیں، یا کم ازکم اس کی کوشش کرتی ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ صفائی کی عادت برسوں میں جا کر پڑتی ہے۔ وہ بچوں کو منہ میں انگلیاں ڈالنے سے روکتی ہیں، یا روکنا چاہیے۔ جسمانی عادتوں کے متعلق تو وہ یہ کوشش کرتی ہیں مگر زیادہ ضروری اخلاقی عادتوں، جیسے فرماں برداری کو وہ نظرانداز کرجاتی ہیں۔ بچے کی عقل اور قوتِ فیصلہ تو اس وقت کارفرما ہونگی جب وہ اتنی عمر کا ہوجائے کہ ان کا استعمال کرسکے اور جب درس کی عنایت سے اس کو ضروری مواد فراہم ہوجائے یعنی جب وہ تقریباً پندرہ برس کا ہوجائے۔ ہم کو یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس معاشرے میں، جو زیادہ تر

عیسائی معاشرہ ہے، بہتر طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے اور اپنے آپ کو معاشرے کے مطابق ڈھالے نہ کہ معاشرے کو اپنے مطابق۔[1]

ابتدائی تعلیم کو بچے کی سیرت اُس وقت ڈھالنا شروع کرنا چاہیئے جب ابھی کوئی نقش اس کے دماغ پر قایم نہیں ہوا اور وہ ابھی صورت پذیر ہے۔ بیشتر اس کے کہ اس کا عنفوانِ شخصیت اسکی کائنات سے متصادم ہوکر ایسی عادات کی تخلیق کردے جن کو تسخیر کرنا ایک نہ ایک دن ابنِ آدم کے لئے ضروری ہے، یہ تمہیدی تعلیمی کام پورا ہو جانا چاہیئے۔ آغاز کار ہی ہیں، سادہ ہدایتیں، تہذیب جو خصوصی انسانی میراث کی اساس ہے اس کی بہترین مکتسبہ اور منتخبہ بدنمائیاں، روایات، جو دیانت اور خلوص کے ساتھ محفوظ ہیں اور صدیوں ہیں جن کی حوالہ ہوئی ہے، اس کے دل پر ان سب کا نقش ثبت کرنا چاہیئے۔

چھوٹے بچے کا اپنی محدود کائنات کے ساتھ ردعمل جبلی اور حیوانی طرز کا ہوتا ہے اور اس لئے ارتقاء کے نقطۂ نظر سے ارتجاعی

---

[1] (از مترجم) اسلامی معاشرے یعنی پاکستان میں بھی اس پر توجہ کی ضرورت ہے لیکن یہاں شاید معاشرہ بھی اصلاح طلب ہے۔

ہوتا ہے اور روایات کے لئے اس کی روک تھام ضروری ہے۔ اگر اس
ردِعمل کے نشوونما پاکر ایک پائدار ذہنی کیفیت بن جانے سے پہلے
ہی صبر و استقلال کے ساتھ ایک ڈھانچہ عائد کر دیا جائے تو خارجی
دنیا اس نئے نمونے میں ضرور بیٹھ جائے گی اور جب بچے کا ضمیر بیدار
ہوگا تو خود اسے اپنے اندر وہ سادہ زمین کا پارچہ ملجائے گا جس پر
زندگی کے نقش ونگار بہ آسانی اور بغیر کسی مزاحمت کے آراستہ کئے
جاسکیں گے۔ اگر یہ نہ ہوا تو ناگزیر طور پر اجدادی میراث میں جس کے
مطالبات واضح ہوں گے اور انسانی روایات میں جو بچے کی سمجھ سے
بالا ہونگی، جنگ شروع ہوجائے گی۔

والدین کا یاان لوگوں کا جو بچے کی ابتدائی تشکیل کا کام اپنے
ذمے لیتے ہیں، یہ محدود فریضہ ہے کہ وہ چند مطلق اور نہایت
سادہ قواعد زندگی کا استعمال سکھلائیں۔ بچے کو بغیر رد وکد خود بخود تعمیلِ
حکم کرنا ضروری ہے۔ یہ خیال کہ والدین کی نافرمانی کرنا بھی اس کیلئے
ممکن ہے اس کے دل سے نکل جانا چاہیئے۔ اگر ایک مرتبہ بھی بچہ اپنی
ضد منوانے میں کامیاب ہوگیا تو وہ اس کو بھولے گا نہیں اور
بے انتہا استقلال کے ساتھ ہمیشہ ایسا کرنے کی کوشش کرے گا،
اور اس میں والدین پر سبقت لے جائے گا۔ اس کے بعد دوسری

بات بچے کو نرمی مگر مضبوطی کے ساتھ یہ تلقین کرنا چاہیئے کہ غصّے، بے صبری، گریہ و زاری کے خلاف جدوجہد کرکے ضبطِ نفس پر قابو حاصل کرے۔ اس طرح پر بتدریج اور غیر شعوری طور پر والدین کا اقتدار بچے پر طبعی قوت کی طرح عاید ہو جائے گا۔ اس سے اس کی شخصیت کا کوئی نقصان نہ ہو گا کیونکہ یہ معاملہ صرف ایسے قواعد کا ہے جو روز مرہ کی زندگی میں دوسروں کے ساتھ اس کے سلوک کے متعلق ہیں اور اس کے نفسیاتی اور جذباتی خارجی اظہار کا معاملہ ہے۔

جتنی کم عمر کا بچہ ہو گا اتنا ہی حسب دل خواہ نتیجہ حاصل کرنا آسان ہو گا۔ ہدایات اور قواعد اس کے دل پر نقش کالحجر ہو جائینگے۔ اور ماحول سے سابقہ پڑنے پر جو اثرات پیدا ہوں گے وہ فوقی نقوش ہوں گے جو پہلے نقوش کو ہرگز زائل نہ کر سکیں گے۔ مزید براں اگر صحیح اخلاق کے زیادہ پیچیدہ اصول اس وقت عائد کئے گئے جب بچے نے بولنا شروع کر دیا اور کائنات سے اس کی اپنی انفعالیت کا آغاز ہو گیا تو یہ فوقی نقوش ہوں گے اور پہلے نقوش کو کلیتًا زائل کرنے کے ناقابل ہوں گے۔ لہذا تعلیم کی ابتدا مشروط اضطراری افعال[1]

[1] (از مترجم) CONDITIONED REFLEXES وہ اضطراری افعال ہیں جو کسی ہیجان

قائم کرنے سے ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ بعد میں واضح کردی جائے گی جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں یہ عادات شخصیت پر کوئی بھی اثر نہیں ڈالتیں کیونکہ شخصیت ذہنی ماہیت کی شے ہے۔ یہ عادات تو صرف اچھے اطوار والے منضبط بچے بنانے میں امداد کرتی ہیں جو زندگی سے دوچار ہونے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں اور زیادہ کارآمد اور زیادہ دل شاد شہری بن جاتے ہیں۔

جب بچہ باتیں کرنے اور غور کرنے لگ جائے تو اس وقت اس کے دماغ اور حافظ کو کام پر لگانے سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ بچے کے حافظے کی کیفیت حیرت انگیز ہوتی ہے مگر جلدی ہی چیز حافظے سے نکل بھی جاتی ہے۔ اس کے کانوں اور عضو گویائی کو باہم ربط دینے والی قوت عجیب و غریب ہوتی ہے لیکن دس برس کی عمر کے بعد شاذ ونادر ہی باقی رہتی ہے۔ ایک بچہ بغیر کسی کوشش کے دو یا تین زبانیں روانی کے ساتھ بولنا سیکھ سکتا ہے اور لہجہ میں بھی فرق نہیں ہوتا

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ:۔) کے جواب میں خود بخود سرزد ہو جائیں اور اس کا دارومدار فرد کے ویسے ہی ہیجان پیدا کرنے والے موثرات سے سابقہ پڑنے والے ذاتی تجربے پر ہوتا ہے۔ جیسے آنکھ کے قریب کوئی شے آئی اور آنکھ خود بخود بند ہو جاتی ہے۔

لیکن دس برس کے بعد یہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور اس عمر میں بہت کچھ کام کرنے اور کوشش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک برعکس ردعمل ہوتا ہے یعنی طبیعت احتجاج کرتی ہے جو تیجہ کے لئے سنگِ راہ بن جاتا ہے۔ دو یا تین برس کی عمر میں اس احتجاج کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

ہم اس کا بھی ذکر کر چکے ہیں کہ بچے اور جوان کے لئے وقت کی قدر ایک سی نہیں ہوتی۔ لہذا بغیر کوشش کے وہ اس سے بہت زیادہ معلومات اپنا لیتا ہے جتنی کہ وہ دس برس کی عمر میں کرتا۔ بشرطیکہ اُستاد یہ یاد رکھے کہ بچے کی دس منٹ کی توجہ بالغ کے ایک گھنٹے کی گہری حاضر دماغی سے زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بچے کو چھ یا سات سبق فی سبق پانچ منٹ کے حساب سے دن میں دیئے جائیں (جو بڑی عمر کے شخص کے سات سبق فی ہفتہ کے برابر ہوگا جب کہ فی سبق ایک گھنٹے کا وقت دیا جائے) بہ نسبت اس کے کہ اُسے ایک سبق آدھے گھنٹے کا روزانہ دیا جائے کیونکہ اتنے بڑے وقت کے وقفہ میں بچہ عضویاتی طور پر اپنی توجہ قائم رکھنے کے ناقابل ہوتا ہے۔

بچوں کی تربیت کرنے میں دو مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ کہا جائے:

"یہ ممنوع ہے، اگر تم ایسا کروگے تو تم کو سزا ملے گی۔ یہ لازمی ہے اگر تم ایسا نہ کروگے تو سزا پاؤگے، لیکن اگر تم کروگے تو تم کو مٹھائی ملے گی"

یہ طریقۂ کار وہی ہے جو جانوروں کو سدھانے میں مستعمل ہے اور جو مشروط افعال اضطراری تخلیق کردیتا ہے اور جب تک کہ بچہ اپنی شخصیت کو پوری طرح حاصل نہیں کرلیتا، اس طریقے سے بہت اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں یعنی جب تک وہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ طریقہ تربیت یا اس سے کسی قدر کم ناشائستہ طریقہ وہ بے لوچ ڈھانچہ، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، تخلیق کرنے کے لئے، بہت ضروری ہے۔ لیکن بعدازاں تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

دوسرا طریقہ جو مقابلتہً بہت کم مستعمل ہے ذرا بڑی عمر والے بچوں پر برتا جاتا ہے اور مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

"یہ مت کرو، یہ تمہاری شرافت کے خلاف ہے، اگر تم ایسا کروگے تو تمہاری شرافت پر دھبہ آئے گا، برعکس اس کے

یہ چیز اچھی ہے اور اس کے کرنے سے تمہاری قدر و قیمت اپنی نظر میں بڑھے گی۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ دوسروں سے تمہیں کوئی صلہ بھی حاصل ہو لیکن اپنے ضمیر کی طرف سے تم کو زیادہ طمانیت خاطر حاصل ہو گی۔" یہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اعلےٰ قسم کی زرخیز زمین میں ہی بارآور ہو سکتا ہے۔

یہی طریقے بچوں اور ان آدمیوں پر بھی مماثل بندشوں کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں یعنی یہ کہ پہلا طریقہ بھی ایسا ہے، جو اخلاقاً کم نشو و نما یافتہ بالغوں پر جنہوں نے ابھی ارتقا کا اونچا درجہ حاصل نہیں کیا کامیاب ہو سکتا ہے اور دوسرا طریقہ ارتقا کے ہراولوں کے بہترین نمائندوں پر استعمال کرنے سے اعلےٰ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسانوں کی کثیر تعداد ابھی بچپن کی منزل سے نہیں نکلی۔ اس لئے ان کو ابھی بچہ ہی شمار کرنا چاہیے اور یہی بہت سے مذاہب کا زاویۂ نگاہ ہے۔ تاہم ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اوسطاً بنی نوع انسان کو خارجی قواعد کی پابندی کر کے ترقی نہیں کرنا بلکہ ایک غائر داخلی رجحان کے ذریعے بڑھنا ہے اور اس کا دار و مدار ان کی اپنی ذات پر ہے۔ لہٰذا ہمیں کسی ایک نمونے پر سب کو ڈھالنے کی جان توڑ کوشش سے بچنا چاہیئے

اور ان گوں کو دل شکستہ نہ کرنا چاہیے جو غیر معمولی صفات کے حامل ہیں اور "تبدل نوعی کرنے والی شکلوں" کے نمائندے ہیں اور مستقبل کے حالی مظاہر۔ ہمیں تلاش کر کے ایسے لوگوں پر انفرادی توجہ دینا چاہیے۔

مہذب قوموں کی اخلاقی تعلیم میں یہ ایک نازک نقطہ ہے۔

ذکاوت، یا یوں سمجھیے کہ قوتِ استدلال کو لازمی تعلیم کے ذریعے نشو و نما دی جاتی ہے۔ اس طرح افراد کی ایک خاص تعداد جن کو دماغ کی وہبی نعمت حاصل ہے اور جو ترقی کرنے کے اہل ہیں، نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ ذہین لوگ وہ سارے ہتھکنڈے سیکھ لیتے ہیں جو ان تمدنوں کی خصوصیت کے حسب حال ہوتے ہیں اور پھر ان کے دو غیر مساوی تعداد اور اوصاف والے بڑے گروہ بن جاتے ہیں۔ پہلا طبقہ جس کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہوں نے بغیر ہضم کیے ابتدائی یا ثانوی درسی تعلیم کو اپنے اندر بھر لیا ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا معیاری ازدحام ہوتا ہے جو اس خیالِ باطل میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغوں کو استعمال کرنا جانتے ہیں اور اس سے ان میں ایک غرور، و تکبر پیدا ہو جاتا ہے جو بعض اوقات خطرناک

ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں
جنہوں نے درسی تعلیم کو خوب ہضم کرکے اپنا لیا ہوتا ہے اور آگے
ترقی کرکے اس کو اپنے وجدان اور اپنی اعلیٰ ذہانت کا جزو
بنا لیا ہوتا ہے اور اس لئے انسانی معلومات کو ترقی دینے کے زیادہ
اہل ہوتے ہیں۔

عملاً اخلاقی اور مذہبی نقاط نظر سے ان دونوں گروہوں
کے وجود کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہر چیز کچھ اس طرح عمل پیرا
ہوتی ہے جیسے اخلاقی تعلیم ایک فقط مرغوب چیز ہے ایک "زائد
نصاب" ہے جو عادتاً مطلوب ہے لیکن یہ زحمت برداشت کرنے کا
مستحق نہیں کہ اسے طالب علم کی ذہنی "قابلیت کے ساتھ" یا گزشتہ
پچاس برس میں جو انتخابے ہمارے سائنس اور فلسفے میں ہوئے
ہیں، ان کے ساتھ، مطابقت دی جائے۔ مختلف مدارج ثقافت
اور ذکاوت کے ساتھ اسے ہم آہنگ کرنے کا تو کسی کو خواب و
خیال بھی نہیں آتا۔ تمام تعلیمی مرکزوں میں اخلاقی اصولوں کی
ایک بہت ہی قلیل تعداد داخل نصاب ہوتی ہے لیکن وہ پڑھا
لا پرواہی، وبال جان طریقے، عجلت، اور عدم اعتقادی کے ساتھ
جاتے ہیں۔ ہم کو پھر دسہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی زندگی، ماحول اور

رسم و رواج فرد کو ایک کلی اخلاقی سیرت فراہم کر دیں گے جبکہ کسی خاص اساسی ترقی کی تلاش نہیں ہوتی۔

بہت سے مذہبی سکول بجائے مذہب کی غائر انسانی اہمیت پر زور دینے کے زیادہ اصرار تاریخ، مذہبی اعمال، مذہبی رسوم مقررہ عقائد اور بدعتوں کے سکھلانے پر کرتے ہیں۔ واقعتاً ہر عیسائی فرقہ کم و بیش تشدد اور نارواداری کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے کہ وہی بہترین صداقت کا حامل ہے[1] اور بجائے اسکے

---

[1] (از مترجم) قرآن پاک نے چودہ سو برس پہلے اس تشتت کی گمراہی پر تنبیہ کیا تھا ملاحظہ ہو منجملہ از خروارے:-

فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۵۳ : ۲۳)
وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنالئے۔ ہر ٹولی کے پاس جو کچھ پڑ گیا ہے وہ اسی میں مگن ہے۔
یہود و نصاریٰ کا کہنا ہے کہ جنت میں کوئی اور شخص جب تک وہ یہودی یا نصاریٰ نہ ہو نہیں جائے گا یعنی ان کا گروہ بندیوں میں شامل نہ ہو بہشت میں

کہ وہ اس یکتا وحی کی تعلیم پر، جو ان کو متحد کرتی ہے، زور دیں وہ اپنا زور ان اختلافات کی تفصیل پر خرچ کر دیتے ہیں جو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ چند شاذ مستثنیٰ مثالوں کے علاوہ کہیں کوئی اس بات کی کوشش نہیں ہو رہی کہ جو اخلاقی درس صحائف آسمانی دیتے ہیں ان میں جان پیدا کی جائے اور یا ان کو جدید روشنی کے مطابق کیا جائے۔ بعض عیسائی فرقے اس خیال سے سخت برگشتہ بھی ہوتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں تو "جدید روشنی" "شر" کے مترادف ہے۔ یہ خیال کوئی ان کا آج کا نہیں بلکہ جب سے ان کی بنیاد پڑی ان کا یہی خیال رہا ہے۔ ان کو یہ اُمید تو نہیں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ):-

أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(۲: ۱۱۲)

نہیں جا سکتا یہ ان کی امنگیں ہیں۔ ان سے کہدو کہ اگر تم اس زعم باطل میں سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ بلاشبہ نجات کی راہ اُس کے لئے کھلی ہے جس نے خدا کے سامنے سر جھکا دیا اور نیک عمل بھی ہوا تو وہ اپنے خدا سے اپنا اجر پائے گا اور اس کے لئے نہ تو کوئی کھٹکا ہے اور نہ کوئی غمگینی۔

ہوسکتی کہ لوگ پھر سے واپس ماضی بعید کی حالت میں چلے جائیں جس پر وہ خود بھی اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کس عہد کو بہترین سمجھکر انتخاب کریں گے؟ زمانہ حال کے مسائل سے بچ نکلنے کا تو کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں تو صاف دلی سے ان کا سامنا ہی کرنا ہوگا۔

ذہین ہوں یا غبی، پہلے غیر متشکل گروہ سے متعلق ہوں یا دوسری سرگرم اقلیت سے، مدرسے جانے والے بچوں اور طالب علموں کے سامنے ایک ہی قسم کی غذا رکھی جاتی ہے جس کو اکثریت کبھی ہضم نہیں کرسکتی۔ عیسائی اخلاقیات کا بے مثل حسن، اس کی عالمگیری، اس کی ضرورت کو کبھی ان کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا کیونکہ پرانی وضع کے نصاب جوں کے توں ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے۔ دُنیا گزشتہ پچاس برس میں کلیتًا بدل گئی ہے لیکن ابھی تک انکو اس تبدیلی کا باضابطہ علم نہیں ہوا۔

ابن آدم کی پوری ذہنی ثقافت کی بنیادیں آہن بستہ مستحکم اخلاقی تعلیم پر استوار ہونی چاہییں۔ اس کی بجائے ہم پوری اٹکل پچو عمارت تعمیر کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ قائم رہے۔ مگر مقدس صحیفوں میں تو لکھا ہے:

"جہاں بصیرت کا فقدان ہے وہاں قوم تباہ ہوجائیگی"۔

ہم اس حقیقت کو اتنے اُجڈپنے سے پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابنِ آدم ہی کا کام ہے کہ وہ سمجھے اور پیش بینی کرے۔ اس میں اس کی ناکامی، اس کی بربادی کا موجب ہے۔

ہمارے دور کا یہ منظر تحیر انگیز ہے۔ لاتعداد صورتوں میں، اوسط انسان، مذہبی نقطۂ نظرے، روایات، خرافاتی اساطیر معتقدات کا اسیر ہے جو اکثر دلکش، موثر یا دل نشین ہوتی ہیں لیکن اس کی معقول درسیات سے ان کا کبھی بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگ دونوں کی باہم آمیزش کرنے سے خائف ہوں لیکن یہ تو ایک نہ ایک دن ضرور ہونا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اشخاص کے قلوب میں ایک پُر درد اور ایمان سوز آویزش پیدا ہو جاتی ہے۔

جب تک کہ تنقیدی احساس نے، جو سائنس کا سہارا لیکر اُبھرنے والی ذہانت کی مشق کا نتیجہ ہے، نشو و نما نہیں پائی تھی، یہ صورتِ حالات کچھ اہم نہ تھی۔ لیکن آج یہ صورت نہیں ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ تھوڑی بہت ذہنی ترقی جو ہو گئی ہے اسکو نظرانداز کرے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مذہب میں یقین رکھنے والے فلسفیوں اور ماہرانِ سائنس نے بہت ہی کم کوشش اس

امر کو نمایاں کرنے کی کی ہے کہ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے ہماری کائنات کیا بہ لحاظ بے انتہا بڑے اجسام کے اور کیا بہ لحاظ نہایت چھوٹے اجسام کے دن بدن زیادہ حیرت خیز اور زیادہ بے پناہ ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کا آغاز اور اس کا انجام بھی اتنا ہی پر اسرار ہوتا جا رہا ہے۔

ہماری معقولی سائنس، جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں دکھلا چکے ہیں بخت و اتفاق سے الگ ایک علت کا مطالبہ کرتی ہے اور دور رس غائیت کا تخیل عائد کرتی ہے خواہ اسکا اعتراف ایک مخلص مادہ پرست کے لئے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ سائنس تقریباً اسی حد تک جا سکتی ہے، لیکن مذہبی ماہران تعلیم کو بھی اپنی جانب سے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کا تخیل، یا خدا کی قدرت کاملہ کا تصور، اس غیر متشکل گروہ کو، ذی عقل چیدہ گروہ کو اور وسطی افریقہ کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے اب آئندہ ایک ہی طریقہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بنیادی اصول تو سب کے لئے ایک سے ہوں گے لیکن اسلوب بیان، اصولوں کو پختگی کے ساتھ پیش کرنے کا طریقہ طالب علم کی قوت اخذ کے مناسب ہونا چاہیئے۔ ہر طالب علم کے

لئے تعلیم کی روح کا اقتباس کر لینا ضروری ہے۔ ایک ہی قسم کی عبارت ہیں اگر بنیادی اصول' ایک پالی نیشیا کے رہنے والے ایک ثانوی سکول کے طالب علم' اور ایک یونیورسٹی کے جواں سال کے سامنے پیش کیے جائیں تو نتائج ایک سے حاصل نہ ہوں گے۔ ایک ہی سی غذا سب کو دے کر بالکل متضاد اثرات کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں اس طرح پر انفرادی کوشش' جس پر ترقی کا انحصار ہے' پرورش نہیں پا سکتی۔

ایک مرتقی ابنِ آدم کے لئے جو ہمیشہ آگاہی حاصل کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے' اس حیرت انگیز متوازیت کو سمجھ لینا ضروری ہے جو حیاتیاتی ارتقاء اور اخلاقی اور نفسیاتی ارتقا میں پائی جاتی ہے۔ جب وہ جامد مادے' حیات' انسان' پر غور و خوض کرتا ہے تو اسے ان نوامیس فطرت کے ہم آہنگ جاہ و جلال کا احساس ہونا چاہیئے جو ان سب پر حاوی ہیں اور جن پر آج صرف وجدان کو دسترس حاصل ہے۔ اس کو یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی سلسلہ ارتقاء کبھی کسی ناگہانی تبدیل نوعی کی بدولت بلا ارادہ چل بھی نکلا ہے تو یا تو اس کے قیام اور توسیع کے لئے اسی سمت میں اور تبدلات نوعی درکار ہوتے ہیں' جو بخت و اتفاق

کے تخیل کے متبائن امر ہے، یا پھر مطابقت ماحول اور بقائے اصلح کے عناصر کا متفقہ عمل چل نکلے گا جو اوسطاً زیادہ سے زیادہ "غیر امکانی" صورتیں پیدا کرتا جائے گا۔ نفسیاتی عالم میں طبعی مطابقت ماحول اور بقائے اصلح کی جگہ انفرادی کوشش اور قوت اختیار لے لیتے ہیں۔ جدوجہد اب بھی درکار ہوتی ہے لیکن اس کی وضعیت بدل جاتی ہے۔ اب انسان کو خود ہی دونوں جنگیں لڑنا پڑتی ہیں، لڑائی کے دونوں اسلحے اس کے دماغ میں ہوتے ہیں جسم کی محافظت اس کی ذہانت کرتی ہے اور ارتقار کی ضامن اس کی اخلاقی حوصلہ مندی بن جاتی ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اخلاقی سطح پر انسانی ارتقار کی رفتار حیاتیاتی ارتقا سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے کیونکہ روایات نے دوسری میکانیکیوں کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن تعلیم اور درس، روایات کی بنیاد ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں آگے کام ان کی مدد سے چلا کر مستقبل قریب اور مستقبل بعید کو متعین کرنا ہے۔ اور اب چونکہ فی زمانہ مہمات مسائل میں سے فیصلہ کن سوال جو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو حملوں سے بچانا ہے، عیسائی آزاد تمدن، اپنے تصورات اور عقائد کو تباہی سے محفوظ کرنا ہے اس لئے جو مسائل کو جنگجو

قوموں نے پیدا کر دیئے ہیں ان سے نپٹنا ہے۔

کسی ملک کی صنعتی سرگرمیوں کو محدود کر کے' تاکہ ایسا کرنا ممکن ہے' یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ آئندہ کے لئے اس کا رُخ ترقی پذیر اور امن افزا ہو جائے گا۔ یہ مقصد اگر پورا ہو سکتا ہے تو عالمگیر تعلیمی معیار قایم کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ نہایت پسندیدہ بات تو یہ ہے کہ سب ممالک اس پر متفق ہو جائیں کہ ایک بین الاقوامی مجلس ان کے مدرسوں اور دارالعلوموں کے نصابات کی توثیق کرے اور موجودہ تواریخ کی کتابوں کی جگہ ایسی کتابوں کو ملے جن میں پہلی مرتبہ صداقت و اقتباسات کو عظمت نصیب ہو قوموں کی علحدہ علحدہ ذمہ داریاں قایم ہوں یا ذمہ داریوں میں اشتراک ہو۔ اخلاقی اصول اور انسانی شرافت کی اشاعت ہو اور صرف سپاہ سالار اور اس کی فتوحات اور بہادروں کی داستانیں ہی آئندہ زیب اوراق نہ ہوں۔ یہ چیز فخر و مباہات کی قربانی کا مطالبہ کرے گی اور ممکن ہے اس میں ان بہادروں کے ساتھ تھوڑی بہت نا انصافی بھی ہو جائے جنہوں نے اپنے ملکوں کے لئے جانیں قربان کیں لیکن ہمیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس دن نوجوان نسل ایک ہی قسم کی ذہنی غذا' ایک ہی قسم کی تواریخ' اپنائے گی اور ایک ہی طرح

کا اخلاقی دستور اس پر حکمراں ہوگا اُس دن دُنیا کو چین و امن نصیب ہوگا۔ اس سے پہلے نہیں۔

مستقبل کی جنگوں کو روکنے کے خلاف جدوجہد سکولوں میں ہی ہونا ضروری ہے۔ اگر وقت پر یہ کام نہ کر لیا گیا تو آئندہ باہمی آویزشیں قوموں میں ہونگی ان کی ذمہ داری موجودہ حکومتوں پر ہوگی اور یہ مستقبل جس شکل و صورت کے ہوں گے ان کے تصور سے ہی بہادر ترین ابنِ آدم کا پتّہ پانی پانی ہوتا ہے۔

تعلیم ترقی کا آلہ ہے۔ منجملہ انسانی ارتقا کے آلات کے یہ ایک آلہ ہے؛ لیکن بدنصیبی سے اسے ذاتی، قومی، سیاسی اوزار میں تبدیل کر لیا گیا ہے۔ جمیع بنی نوع انسانی کو اس حقیقت سے مطلع ہو جانا چاہیئے کہ مناسب حدود کے اندر قومی اہمیت کو کم کر دینا چاہیئے۔ کیا قومیں کبھی اس خطرے سے عبرت حاصل کریں گی جب کہ ان کا تمدن ابھی بال بال بچا ہے اور یہ بصیرت ان کو حاصل ہوگی کہ ان کی تہذیب و تمدن کی شاندار عظمت سکولوں ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ آمادہ قلوب میں نفرت اور عدم اعتماد کا بیج بونے کے لئے پراپیگنڈا یعنی نشر و اشاعت کا منظم طریقہ بہت ہی کامیاب آلہ ثابت ہوا ہے اور جن آبادیوں

کے دلوں میں پہلے ہی سے باہمی اختلافات ہوں ان کے درمیان حقارت کی خلیج حائل کر دیتے ہیں اسے بہت بڑی قوت حاصل ہے۔ یہ امر قرین عقل ہے کہ اگر یہی طریقے بچوں کے اثر پذیر۔ سرگرم اور غیر مبصر قلوب پر استعمال کیئے جائیں تو نہایت ہیبت ناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ نسلی یا قومی گھمنڈ کو اُبھارنے، جماعتی عزت و فوائد کے متشددانہ خیال کو بروئے کار لانے، اور ایک خونخوار معبود باطل کھڑا کر لینے سے زیادہ آسان کوئی شئ نہیں۔ غلط خیال ہو یا صحیح اس کی نشو و نما کے لئے بچے کا کورا قلب معیاری زرخیز مٹی ہے کیونکہ بچہ ہی پختہ قلوب والے نوجوانوں سے جن کو زیادہ وقت تجربے اور فکر کا مل گیا ہے نہایت پرانے اور حد درجے خطرناک رجحانات انسانی کے قریب تر ہوتا ہے۔ اب تک تو صرف آمروں نے ہی، خواہ وہ اپنا نام کچھ بھی رکھ لیں، اس ابتدائی منشا ہدے سے فائدہ اُٹھایا ہے اور جھوٹ کی قوت کو سمجھا ہے۔ اگر ساری دُنیا کے سکولوں میں صرف حق کی ہی تعلیم دی جاتی تو "مطلق العنان آمریتوں" کا وجود ہی ممکن نہ ہوتا۔ جو نقصان عظیم کہ سکولوں کے ذریعے وجود میں آیا ہے اس کا ازالہ بھی سکولوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

ساری دنیا میں تواریخ ہی کی تعلیم سے زیادہ مجرم ہے۔ چونکہ غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ جنگوں اور مناقشات کے حالات ہر ملک کا مورّخ اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی اپنی قوم تو ہر حال میں حق پر ہوتی ہے اور دُشمن قوم ہر حال میں فساد کی بانی مبانی۔ اور اس میں اِلّا ماشا اللہ تعصب ہی کی جھلک نمایاں رہتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قدرتی بات ہے۔ مانا، لیکن جب تواریخ کی اساس جھوٹ پر ہو، یا واقعات اور تاریخی دستاویزوں میں جوڑ توڑ کرنے پر ہو، تو یہ ایک مستقل خطرہ بن جاتی ہے کیونکہ بچے تو اسے صحیفہ آسمانی سمجھ کر حرزِ جان بنا لیتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو یا تو دوسری قوم کے عناد کا شکار سمجھنے لگ جاتے ہیں یا اپنے آپ کو فوق البشری قوتوں کے حامل۔ پھر وہ بقیہ عمر اس ابتدائی انفعالیت کے اثرات کو کبھی فراموش نہیں کرتے اور یہ ان کی انا اور شخصیت کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے۔

زمانہ حال کی آمریتوں کے وجود میں آنے سے قبل کم و بیش ایسے ہی نمایاں خوفِ اجانب (XENOPHOBIA) کی ہوشیاری کے ساتھ دلوں میں تربیت کی جاتی رہی ہے۔ تمام نصابی کتابوں میں تاریخی واقعات کو حالاتِ ماقبل سے قطع نظر کر کے

حسب دلخواہ طور پر آراستہ کیا جاتا ہے، قطع و برید کرکے پیش کیا جاتا ہے اور جو واقعات اور ان کے زمانے درست بھی ہوں باہمی آویزشوں کے وجوہات اور ذمہ داریاں، کلیتاً مختلف طریقے پر لکھی جاتی ہیں۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی میں ایسے ممالک کو بھی جمعیت خاطر نصیب نہیں جن کے فوائد اور خواہشات امن ہی سے وابستہ ہیں مگر جن میں ایک ہی موضوع بچوں کو اتنی مختلف صورتوں میں تلقین کیا جاتا ہے کہ ان کی شریف طبیعتیں اپنے اعماق قلوب میں اپنے ہمسایوں کے متعلق نفرت و حقارت کے جذبات پالنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے بلکہ بعض دفعہ تو خود اپنے حلیفوں اور اتحادیوں کے خلاف بھی ایسے ہی جذبات ہوتے ہیں، اور چونکہ یہ بیج زیادہ فیاض اور زیادہ شریف دلوں میں بویا گیا ہے اس لئے یہ بغض و کینہ اور بھی زیادہ سرگرم کار رہتا ہے۔

تاریخ کی کتاب ایک زبردست آلہ ہے جس کی اہمیت کو بڑا شیا رہنماؤں نے جلد سمجھ لیا تھا۔ ہم ان لوگوں سے اشتراک عمل کی توقع کیسے کرسکتے ہیں جن کے دماغوں کی ترتیب منظم طور پر متضاد خیالات اور منقطوع الاطراف واقعات سے کی گئی ہو؟ ایسی گمراہی کے ممکن الوقوع نتائج یہی ہوسکتے ہیں کہ ایک طرف تو معاشرے میں طبقاتی آویزشیں

پیدا ہوں اور دوسری طرف قوموں میں باہم جنگیں۔

جس تاریخ کے کچھ مفید معنی ہو سکتے ہیں وہ تو عالمگیر تاریخ ہی ہو سکتی ہے۔ بعض خالص مقامی واقعات کے علاوہ، جن میں عموماً کوئی اہمیت نہیں ہوتی، کسی ملک میں کوئی واقعہ ایسا نہیں رونما ہوتا جو ہمسایہ ملکوں یا دور کے ملکوں میں رونما ہونے والے واقعات سے مربوط نہ ہو۔ ہر قوم کی اقتصادی، سیاسی، اور ذہنی زندگی اسکے ہمسایہ ملکوں سے متاثر ہوتی ہے اس کی تاریخ کے شجر کی جڑیں چاروں طرف پھیلتی ہیں بعض اوقات یہ جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، بعض اوقات ہلکی اور لاتعداد بین الاقوامی آمد و رفت اور رسل و رسائل ہر ملک کو اس پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ لاشعوری طور پر تمام دوسرے ممالک کی سرگرمیوں میں شرکت کرے۔ یہ بات ایک صدی پہلے کے مقابلہ میں آج زیادہ صادق آتی ہے اور مستقبل میں اور بھی نمایاں ہوتی جائے گی۔ وریدوں اور نسوں کا ایک نہ سلجھنے والا جال ایسا ہے جو سب قوموں کو باہم پیوست کر کے ایک مکمل نظام بناتا ہے۔ کسی ایک ملک کی تاریخ کو بے اصول کے ساتھ علیحدہ کر دینا ایسا ہی ہے جیسے ان وریدوں کو کاٹ دیا جائے اور ان کی شکل ایک غیر واضح ٹنڈ کی سی ہو جائے۔ باوجود اس کے تاریخ کی تعلیم کا طریقہ

آج بھی ہے محض چند سادہ متفق علیہ واقعات تو تاریخ میں درج ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کی تاویل ایسے معنوں میں کی جاسکتی ہے جن سے قومی، نسلی، سیاسی، اور دیگر نفرتیں قایم رکھی جاسکتی ہیں۔

عالمگیر تاریخ، اور یہی صرف صداقت کی حامل ہوسکتی ہے، پورے نشر واشاعت کے انتظام کے ساتھ رائج ہونا چاہیے اور اس کی تعلیم اسی طرح پر ہونی چاہیے جیسے سائنس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں قومی فخر ومباہات کو بالائے طاق رکھا جائے اور یہ اس جذباتی عنصر کو خارج کرنے سے ہی ہوسکتا ہے جو فی زمانہ پرخطر اور فرسودہ ہوگیا ہے۔ ایک بچے کے لئے صدہا اور مواقع ہیں جن میں وہ اپنے ملک پر ناز کرسکتا ہے۔ ضرورت دیانت اور رواداری کی ہے اور سب ملکوں سے زیادہ اس کی ضرورت یورپ کے ملکوں میں ہے جہاں تاریخ اور نتیجتاً بغض وعناد کی ماضی زیادہ طویل ہے۔

اگر یہ نہ کیا گیا تو ہماری حالت اُس شخص کی سی ہوگی جو ایک گڑھا کھودنکالتا ہے تو دوسرا گڑھا کھودنے پر مجبور کیا جاتا ہو تاکہ پہلے کی کھدی ہوئی مٹی دوسرے میں ڈالکر نجات حاصل کی جائے۔ یہ ایک برائی کا چکر ہو دنیا کی بہترین قوت ارادی بھی کوئی کام نہ کرسکے گی اگر وہ ان سیاسی برائیوں کی طرف سے آنکھیں بند رکھیگی جو اسکی کارکردگی کو بیشتر اسکے کہ ہمکو احساس ہو مفلوج کردیتی ہیں۔

(۱۶)

ڈوریش غائیت کا مفروضہ (خلاصہ)
مقدر انسانی

پیشتر اس کے کہ ہم ان بعض عملی نتائج کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی طرف توجہ کریں جو ان تصورات کا منطقیانہ ماحصل ہیں جن کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مفروضے کے چند اساسی باتوں کا، جو مفروضے کا محور ہیں، اختصار کے ساتھ اعادہ کر دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم پانچ اساسی ناقابلِ انکار امور کا ذکر کرتے ہیں آغازِ حیات، جس کی نمائندگی بے حد بسیط اجسام نامی کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ مرکب شکلوں کی طرف ارتقائے حیات، اس طویل عملِ ارتقا کا موجودہ انسانی ماحصل یعنی انسان اور اس کا دماغ، تفکرِ انسانی قوتِ خیال، اور ریاضیاتی اور روحانی تصورات کا جنم، کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں ان تصورات کی خود بخود بلا امداد و غیر نشوونما۔

ابھی تک سائنٹفک طور پر ان امور میں سے کسی ایک کی بھی توجیہ نہیں ہو سکی، لہذا اگر ہم ان کے درمیان کوئی معقول رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہیں تو کوئی مفروضہ لابدی ہے اور ارتقار کی دوری غائیت کا نظریۂ ارتقار اس رابطہ کا امکان پیش کرتا ہے۔ وہ یہہ اصول پیش کرتا ہے کہ سائنٹفک ضابطے جو انسان نے مادے کے متعلق وضع کیے ہیں وہ معروضی حقیقت پر چسپاں (ہم یہ نہیں کہتے وہ مکمل طور پر اس کا اظہار کرتے ہیں) ہو جاتے ہیں، اور اگر اپنی پوری کی پوری سائنس کے اعتبار کو ساقط نہیں کرنا تو جب بھی کسی حالت کے لئے ریاضیاتی عدم امکان پیدا ہو تو اس پر ہمیں توجہ دینی چاہیئے۔ اس اصول کی اساس اس ریاضیاتی عدم امکان پر ہے کہ ہم حیات کے جنم اس کے ارتقار اور دماغی سرگرمی کے ظہور کو بخت و اتفاق کی معمولی کارفرمائی کا محصول قرار نہیں دے سکتے۔

اس مفروضے کا دعویٰ یہ ہے کہ ذی حیات ہستیوں کا طبعی ارتقا باوجود اس امر کے کہ اس کی بہت سی میکانکیتیں ابھی تک ہماری دسترس سے باہر ہیں، سائنس کے ان مسلمات میں سے ہے جن پر کمتر اعتراض وارد ہو سکتے ہیں اور سب سے اچھی طرح واضح کئے گئے ہیں۔ وہ اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا

چاہتا ہے کہ اس کا امکان مشکل ہی ہو سکتا ہے کہ ایک تدریجی عمل جو
بارہ ارب سالوں سے زیادہ عرصے سے چلتا آ رہا تھا وہ انسان اور
اس کے تجریدی قوتِ فکر کے ظہور میں آتے ہی رک گیا ہو اور یہ
مفروضہ اس کو واضح کرتا ہے کہ صرف وہی تنا جس سے نوعِ
انسانی کی شاخ پھوٹی ہے، ایسا ہے جس کا ارتقار کبھی منقطع نہیں ہوا
اور بقیہ جتنے اور خاندان تھے ان میں صرف استحالے اور مطابقت
ماحول ہی ہو کر رہ گئے۔ NEANDERTHAL انسان کے بعد
سے جو استحالہ بنی نوعِ انسانی میں مشاہدے میں آیا ہے وہ
بلاریب اس کے دماغ کا ہے۔ بنا بریں یہ تسلیم کر لینا قرینِ عقل
ہے کہ اب آئندہ عملِ ارتقار اسی عضو کے ذریعے چلے گا جس کی
بدولت انسان اس قابل ہوا ہے کہ وہ اپنی بقار کو قائم رکھ
سکے اور اپنی کائنات پر بشمول دیگر جملہ حیوانات کے، حکمرانی کرے۔
یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے مرادف ہے کہ، آئندہ عملِ ارتقا
دوسری سطح پر جاری ہو گا، ایسی سطح جو جسمانی نہیں ہو گی بلکہ نفسیاتی
ہو گی کیونکہ، ہمارے مشاہدے کے پیمانے پر ہر ترقی، دماغ کی ہر
نئی تعمیری اشکال، کا ظہور نفسیاتی مظاہرے ہو گا۔ اور نفسیاتی
ارتقار کا اظہار زیادہ تر تجریدی، اخلاقی اور روحانی تصورات کی

بالیدگی سے ہوتا ہے۔

لیکن زندہ ہستیوں کا ارتقا، بہ حیثیت مجموعی، جامد مادے کی سائنس کے قطعاً متناقض ہے (باب ۴ ملاحظہ ہو)۔ یہ ارتقاء دوسرے حرکیاتی ضابطے کے، جو ہماری سائنس کا بنیادی اصول ہے اور جس کی اساس بخت و اتفاق کے ضوابط پر ہے، بالکل مخالف ہے۔

اس لئے ارتقاء کی وجہ (بلکہ عمل ارتقاء خود بھی) ہماری موجودہ سائنس کے طرف دار نہیں ہیں۔ دُنیا کا کوئی سائنس داں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ ظہور حیات کے بعد جتنا کچھ وقوع پذیر ہوا ہے اس کی توجیہ کے لئے ہم "ضد بخت و اتفاق" کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہیں جو اس عظیم الشان سلسلہ مظاہر فطرت کا رُخ ایک تدریجی بے حد غیر احتمالی سمت (جو بخت و اتفاق کے ساتھ لگا نہیں کھاتی) میں موڑ دیتا ہے جس کا ماحصل انسانی دماغ ہے اس کا مفہوم تو یہ نکلتا ہے کہ ایک نصب العین، ایک منزل مقصود کو تسلیم کیا ہے، کیونکہ کم از کم زندہ ہستیوں کی ایک شاخ کی سمت تو واضح اً ایک بے حد طویل زمانے میں ایک ہی مشاہدہ میں آئی ہے۔

اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابتدائی خلیہ کے جنم سے ہی جتنے واقعات ہوئے ہیں ان کے پیش نظر انسان کا وجود میں لانا مقصود تھا

اور اس حیثیت سے نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ قسم کا حیوان ہو جو قوت نطق رکھے۔ اور اپنے ہاتھوں کا استعمال کر سکے بلکہ ایسا حیوان جو اس عالم کی ترقی کا ممد ہو جو ضمیر اور ذہانت کا اوزار اور انسانی عظمت کا مقام اور آئندہ کے لیے بھی ارتقاء کا خود ایک آلہ ہے۔ موجودہ دماغ کا حاصل 'ابن آدم' ارتقاء کا آخری نمائندہ نہیں۔ بلکہ یہ تو فقط ارتقاء کی ایک عبوری منزل ہے، جو بہیمی یادوں کے نیچے بُری طرح دبی ہوئی ماضی اور اعلیٰ متوقع عملیات سے مامور مستقبل کے درمیان واقع ہو گئی ہے۔ یہ ہے عروج آدم کے متعلق نظریہ فائیت کا مفہوم

معلوم یہ ہوا کہ منشاء ربانی کا ظہور عمل ارتقاء کے ذریعے ہو رہا ہے اور اس کا مطمح نظر ایک ایسی کامل الاخلاق ہستی کا وجود میں لانا ہے جو انسانی جذبات، خود غرضی، حرص و ہوس، اقتدار کی خواہش، سے پاک ہو کیونکہ یہی اس کی ارتقائی زنجیریں ہیں اور عضویاتی غلامی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ روح اور جسم کا رشتہ ہی منقطع ہو جائے۔ یہ تو بے معنی بات ہوگی اس لیے کہ انسان کے معاملے میں روح کا تصور ہی بغیر جسم کے ممکن نہیں۔ اس کا مطلب

صرف یہ ہے کہ وہ شہوات نفسانی کی سلطانی سے نجات حاصل کرلے۔

بنابریں ہر وہ شے جو اس عالم اخلاقیات و روحانیات میں عمل ارتقاء میں مزاحمت کرتی ہے، ہر وہ فعل جو بہیمیت کی طرف ارتجاع کا میلان رکھتا ہے اور ہر وہ خواہش جو ابن آدم کو جسم کا محکوم بناتی ہے، منشاء ربانی کے خلاف ہے اور شر مطلق ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ شے جو حیوان اور انسان کی درمیانی خلیج کو وسیع تر کرتا ہے، ہر فعل جو انسان کے روحانی ارتقاء میں مدد ہے خیر ہے۔

مشاہد فطرت کے نقطۂ نظر سے، انسان کے عالم وجود میں آنے تک عمل ارتقاء کی کوشش صرف یہ تھی کہ دماغ کا عضو ایسے جسم میں پیدا ہوجائے جو اسے محفوظ رکھ سکنے کا ضامن ہو۔ ابن آدم کے سارے اجداد ارتقاء کے کھیل میں محض غیر ذمہ دار نائکی تھے جو اپنے عائد کردہ کردار اداکرتے رہے جن کو وہ سمجھتے نہ تھے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ انسان بھی اپنا کردار ادا کررہا ہے لیکن وہ اس کھیل کو سمجھنے کا بھی خواہشمند ہے۔ وہ اس قابل ہوگیا ہے کہ اپنی تکمیل کرسکے اور چھوٹی باتوں میں صرف اسی میں یہ اہلیت بھی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے اس کو قوت ارادہ کی آزادی کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ

عملِ ارتقاء کی جو امداد ابنِ آدم کر سکتا ہے اس کا انحصار اس کی
اس آزادی کے استعمال پر موقوف ہے۔ (اقبال)

انسان کا یہی استحکام ہے جس کی بدولت وہ ایک سرگرم
ذمہ دار فرد اور نیا مظہرِ حیات بن گیا ہے اور جو دیگر سب باتوں
سے زیادہ، انسان کا وصفِ خصوصی ہے۔ بلاشبہ ارتقاء کی
وہ قدیم میکانکیت، بقائے اصلح کا انتخاب ہی ہے جو پھر کبھی پیدا ہو سکتا لیکن پہلے
کی طرح حیاتیاتی ضوابط اور بخت و امکان پر منحصر ہونے کی بجائے
مکمل عمل انتخاب کا دار و مدار ضمیر پر ہوگا جو اس کی دماغی
سرگرمی کا مظہر ہے اور جس کی بنیاد اس آزادی پر ہے اور جو قوت
آزادی کی ہم میں سے ہر ایک کو اس لئے ملتی ہے تاکہ اس کی مدد سے ہم
آگے بڑھ سکیں۔ ارتقا کا جو درجہ ہمیں حاصل ہو گیا ہے اسی کے مطابق
ہم آئندہ ترقی یا تنزل کی راہ اختیار کریں گے یہ قوتِ اختیار ہی ٹھیک ٹھیک
یہ بتائے گی کہ ہم تکمیل کے کس مرحلے پر آئیں۔

اگر انسان بہیمیت اور اپنے میلاناتِ خاطر کی بدہیئت اور
بدشکل اُمنگوں کے خلاف جنگ لڑنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ انسانی
عظمت کو پا لے گا۔ اگر وہ اس جنگ میں شکست کھا گیا اور ان شہوات
و خواہشاتِ نفسیاتی کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیئے جو بعض

اوقات محض وہی جبلتیں ہوتی ہیں جو اس نے اجداد سے ورثے میں
پائی ہیں تو وہ مشترکہ سعی میں حصہ لینے میں اپنے آپ کو نا اہل اور
ناموزوں ثابت کرکے عملِ ارتقاء سے اپنے آپ کو خارج کرلے گا۔
طبعی انتخاب بقائے اصلح کا کام پورا ہوگیا۔ اس طرح پر ہم کو یہ معلوم
ہوگیا کہ ان طبعی مزاحمتوں، اور سنگے وہ دشمن جن کے خلاف حیوانوں
کو جدوجہد کرکے میدان جیت کر اپنی صلاحیت کو ثابت کرنا پڑتا تھا،
کی جگہ مرتقی انسان کی صورت میں، ترغیباتِ نفسانی وہ کردار ادا
کررہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ وصف، جو ہنوز نوعِ انسان میں ابھی کمیاب ہے
اور جو خصوصیت کے ساتھ اس کا طرۂ امتیاز ہے، اور دیگر حیوانات
سے اس کی شاہراہ کو الگ کرتا ہے، ارتقاء کا صحیح باعث معلوم ہوتا
ہے۔ ابھی ارتقاء ہی کی بدولت اس وصف کو اور نشوونما پانا
ہے اور ایسی تکمیل حاصل کرنا ہے جس کا آج قیاس کرنا بھی ممکن نہیں،
لیکن وجدان پر اس کا کشف ہو رہا ہے اور اتنے زور سے محسوس ہو رہا
ہے کہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے نصب العین کو نجاست سے ملوّث
دیکھنے پر جامِ شہادت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر انسان کا بلند پایہ فریضہ
یہ ہے کہ اپنی بہترین قابلیت کو کام میں لاکر ارتقاء کے اس جدید

صورت میں ممد ہو۔ کسی انسان کو بھی جب تک اس کے عمل میں اخلاص ہے اور وہ دل و جان سے کوشاں ہے اپنی کوششوں کے نتائج یا اپنی امداد کی اہمیت کے متعلق پریشان حال ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اہم چیز وہی سعی ہے جو وہ کر رہا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی آفاقی اہمیت حاصل کر لیتی ہے، وہ ایک سلسلے کی کڑی بن جاتا ہے؛ یوں وہ ایک غیر ذمہ دار کھلونا نہیں رہتا جس کی کیفیت یہ ہو جیسے پانی کی سطح پر کاگ کی جو قابو میں نہ آنے والے محرکات کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا پھرتا ہے۔ انسان کی حالت تو ایک باشعور خود مختار عنصر کی ہے جسے شرفت اپنے ارادے کا اختیار حاصل ہے کیا تو وہ ارتجاع کر کے مٹ جائے یا ترقی کر کے منشائے ربانی کی تائید کرے۔ انسان کی ساری شرافت اپنی آزادی کی بدولت ہے، جو دیگر حیوانوں کو نہیں دی گئی۔ اس کو فخر تو فقط اسی نعمت پر کرنا چاہیئے لیکن افسوس کہ فخر اس کو دوسری ہی چیزوں پر ہے۔

ارتقاء کو اس طرح پر سامنے لانے کے براہ راست نتائج کیا ہیں؟ زیادہ وضاحت کی خاطر ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛ اوّل، فلسفیانہ؛ دوئم، انسانی اور معاشرتی؛ سوئم انفرادی اور اخلاقی۔

فلسفیانہ نتائج

پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ اخلاقی تصورات کو ما بعد الطبیعیات میں مستحیل کیا جا سکتا ہے جن کا سائنٹیفک مظاہر سے موازنہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ارتقار کے ساتھ مربوط ہیں اور ایسے نئے عناصر سامنے لاتے ہیں جو کہ ان تشریحی اور عضویاتی دھنوں کے ہم پلہ ہیں جو ان کے سامنے آنے سے پہلے تنہا ترقی کے معیاروں پر مشتمل تھے۔

کائناتی وحدت کے تصور کو اس طرح سے پیش کرنا تسلی بخش ہے کیونکہ یہ امر ہماری تصوری کائنات کو ایک طرح کی ہم جنسی عطا کرتا ہے۔ اس کتاب کے ابتدا ہی میں ہم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ سب مظاہر کو ایک وحدت میں پرونا یعنی ہر ایک مظاہر کی تاویل ایسے مشترک عناصر کے ذریعے کرنا، معقول تفکر کے عمومی اور قدرتی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح اساسی، اخلاقی، اور روحانی عالم، سائنس کی دنیا سے مل کر ایک ہیئت اجتماعی کو تشکیل دیتے ہیں اور سائنس آخرکار دوبارہ ذہنی سرگرمی کی ایسی دوسری صورت میں شریک ہو جاتا ہے جس کی اساس خالصتاً وجدان پر ہے اور جس کا عروجی مشکل مذہب ہے۔ منطقی تفکر جن اخلاقی نتائج پر اب پہنچا ہے ان نتائج پر مذاہب کئی ہزار سال پہلے پہنچ چکے تھے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

اگر ایک خاص زاویئے سے غور کیا جائے تو معقولی مناہج عمل کے مقابلہ میں
حیرت انگیز طور پر سست رفتار ہیں۔

معقولی اور وجدانی کوششوں کو متحدہ طور پر کارفرما ہونا
اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ کوشش سائنس پر وسعت خیال عائد
کرتی ہے لیکن ساتھ ہی مذاہب سے بھی اتحاد اور نزہت کا مطالبہ
کرتی ہے کیونکہ مذاہب کو ضعیف الاعتقادی کی گندگی کے آثار کو قائم
رکھنے والی رسموں سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
الوہیت کے نظریے سے زیادہ یہ رسمیں ہی ہیں جو دیانت دار
لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مذہب سے برگشتہ کرتی ہیں۔
نزہت مذہب، جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ انجیل کی اساسی
تعلیم کی طرف بازگشت کریں، ادعا ظالمانہ طریقہ پر نہیں ہونا چاہیے
بلکہ تدریجاً پر ہو اور انسانی ارتقاء کے ساتھ شانہ بشانہ عمل پیرا
ہو۔ یہ بالکل ایک یقینی امر ہے کہ خالص عیسائی عقیدے کو اپنانا
اکثریت کے لئے اتنا ہی مشکل ہو جتنا کہ نظریۂ اضافیت کو اپنانا۔ لیکن عوام
نظریۂ اضافیت سے تو قطع تعلق کر کے کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن مذہب
سے وہ قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ تاہم کمیت کے تعاقب میں کیفیت
کی اہمیت کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ خیال دھوکا ہے کہ سطحی

طور پر ہی اشاعت مذہب کر کے ایک بڑی تعداد ایمان لانیوالوں
کی اکٹھی کر لی جائے۔ اس حقیقت کو ملیامیٹ نہ کر دے کہ ہمارا
نصب العین یہ ہے کہ مخلص اور روشن ضمیری کر کے فرد کی اہم اخلاقی
نشو و نما کی جائے، نہ کہ ایسی خارجی رسوں کی کم و بیش بے انتہائی
کے ساتھ پابندی کرانا جو آخرت میں جہنم کے عذاب سے چھٹکارا
حاصل کرنے کے لئے مفت کا بیمہ تصور ہوتی ہیں۔

ہمارا دور عبوری دور ہے اس لئے بعض ان لوگوں کے
لئے اذیت وہ ہے جنہیں عمل ارتقا سے مطابقت حاصل کرنا ہے۔
بچہ تو آناً فاناً مطابقت حاصل کر لیتا ہے۔ ایک عمر رسیدہ آدمی بعض
اوقات اس مطابقت کا نااہل ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات ہر عالم پر صادق آتی
ہے: سیاسی، معاشرتی، صنعتی، ذہنی یا مذہبی کوئی بھی میدان
عمل ہو۔

لہذا آغاز پہلے بچوں سے کرنا چاہیئے؛ پھر طالب علموں سے
اس کے لیئے قدرتاً اس امر کی ضرورت ہے کہ استادوں کا انتخاب
اور ان کی ابتدائی تربیت پر پوری توجہ دی جائے کیونکہ جیسا
ہم بتا چکے ہیں ان کی ذمہ داری معتد بہ ہے۔ یہ مسئلہ ریاستہائے متحدہ
کے لیے اتنا قابل غور نہیں جتنا کہ یورپ کے ممالک کے لئے؛ جہاں

انقلابات سیاسی نے؛ خواہ وہ سفاکانہ ہوئے ہوں یا امن پسندانہ، مذہب کی سطوت کو کم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک میں نیا وار علم، ان دہریانہ عقائد کا دم بھرنے والے جواب سائنس کی تائید سے محروم ہو چکے ہیں اور جو بوجہ چند استثنائی حالتوں کے، مذہب کا مخالف ہوتا ہے۔ ایسے مذہب کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے اور اس کا مشاہدہ اب تک کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ اگر ہم تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو استاد ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کے دل میں نام نہاد مذہب اور سائنس کی جنگ کے متعلق کوئی شبہات نہ ہوں۔ دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اس کو اس کا یقین ہو کہ موجودہ علم کی روشنی میں کوئی آویزش ان دونوں میں نہیں۔ اگر اُستاد کی معقولی اور علمی تربیت، خواہ وہ سطحی ہی کیوں نہ ہو، کلیتاً عقلی ہے یعنی معاشرتی اور سیاسی اثر سے بالکل پاک ہو، ہماری موجودہ علمی معلومات کے مطابق ہو اور پچاس سال پہلے کی سائنس کا دم نہ بھرتا ہو، تو یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ معقولیت کو فلسفہ نہیں بن جانا چاہیئے: یہ ایک طریقۂ کار ہے۔ اس کی شہرت سائنس کی رہین منت ہے۔ سائنس کے بغیر اسکا وجود ہی نہیں۔

اگر قوموں نے اس طرف سعیِ کامل نہ کی تو ہم دیکھ لیں گے

کہ عقلیت اور حریت رائے کے پرانے دشمن پھر نمودار ہو جائیں گے
لیکن اس مرتبہ وہ نام نہاد عقلیت پسند گروہ کے فرد اپنے اندر
ہی سے پیدا ہوں گے، وہی نا رواداری اور تشدد پسند تعصب
جس کے خلاف عقلیت پسند پہلے جائز طور پر علم بغاوت بلند کر چکے
ہیں۔ ایسا ابھی ہو چکا ہے۔ تصورات اچھے ہوں یا بُرے، اُن
کی آواز بازگشت، بدنصیبی سے، خود تصورات سے زیادہ نمایاں
پراثر انداز ہوتی ہے تصورہ یا یوں کہیئے کہ جس لفظ سے اس کا اظہار
ہوا ہے، جلد ہی ایک اجتماعی نعرہ بن جاتا ہے؛ ایک ایسی علامت
جس کی ساری اہمیت زائل ہو چکی ہوتی ہے؛ اور ایک جائز
ہر دلعزیز ردعمل، جس کی باگ ڈور بے اعتدالیاں کھول دیتی
ہیں اور جو ابتدا میں ممکن ہے کوئی اچھا نتیجہ بھی پیدا کرتی ہوں
تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد، انسانی فطرت کو پھر اسی لیک پر
پڑ جانے اور وہی نا جائز تجاوزات کرنے سے روکنے کے ناقابل
ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اب یہ بے اعتدالیاں ایسے اصولوں کی
خاطر کی جاتی ہیں جو پہلے اصولوں کے متبائن ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں یہ مذہب نہیں تھا بلکہ انسانی فطرت ہی
تھی جس نے نا رواداری اور تشدد کو جنم دیا۔ تشدد کے لیے عذر

کوئی بھی کیوں نہ ہو عوام کے ردِ عمل ایک ہی ہوتے ہیں۔ خواہ شہ کوئی بھی ہو۔ ان کا اظہار غیض وغضب اور جوش و خروش ہی کے ساتھ ہوتا ہے جو پھر بہ آسانی تشدّد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زندانی جب محافظ زنداں کو قید و بند میں ڈالنے کا خواب دیکھتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ قانونی پہلو کو سامنے رکھے اپنی آزادی ہی اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ جب اوسط آدمی آزادی کا خیال دل میں لاتا ہے تو وہ عموماً اپنی ہی آزادی کا متلاشی ہوتا ہے، اور یہ ایک بلند درجے کا مرتقی انسان ہی ہوتا ہے جو دوسروں کی آزادی کی محافظت کرنے کا خواہش مند ہو۔

زندگی کے کھیل کے قاعدے ایسے ہی ہیں اور یہ کھیل جاری رہے گا یکساں جوش و خروش، یکساں ہنگامہ خیز نعرے، یکساں آنی خلوص کے ساتھ باری باری قانون اور آزادی کو اُس وقت تک خوش آمدید کہتے رہیں گے جب تک کہ یہ الفاظ ہر آدمی کے دل میں ان فوری فوائد کا احساس پیدا کرتے رہیں گے جو اس کو حاصل ہو سکتے ہیں لیکن جن بڑے نصب العینوں کے لیے یہ نعرے لگائے جاتے ہیں یا جو فرائض وہ عائد کرتے ہیں ان کا اللہ حافظ ہے بہ الفاظ دیگر جب تک ان کی اور ایسے ہی اور نصب العینوں

کی قلم انسانی عظمت کے غائرا احساس پر نہ لگائی جائے گی یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

دور رس غائیت کا دوسرا فلسفیانہ نتیجہ جسم اور روح کی علیحدگی ہے۔ اب یہ علیحدگی ذہنی عمل متصوّر نہیں ہوگی بلکہ ایک سائینٹفک واقعہ کیونکہ گو اب بھی جسم مطابقتِ احول حاصل کرسکتا ہے لیکن اب ارتقار اس کا نہیں ہوگا روح کا ہوگا۔

آپکے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو یہ علیحدگی جس کا ذکر ہم نے پچھلے باب میں کیا ہے اس علیحدگی سے کلیتاً مختلف ہے جو روح کی جسم سے الگ ایک ہستی تسلیم کرنے والے پرانے فلسفیوں کے خیال کے مطابق ہو یہ تصوّر جسم میں باہر سے آکر بسنے والی روح کی آزاد حیثیت کو پیش نہیں کرتا، جو عقلاً ناقابلِ تسلیم ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے: مثالاً خلیوں کا مرتب کردہ دماغ ہی ہے جس پر عمل ارتقار جاری رہیگا لیکن یہ عضو اب اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں اسکی طبعی کیمیاوی اور حیاتیاتی سرگرمی ایک دوسری سطح پر اپنی رونمائی کرتی ہے یعنی نفسیاتی مظاہر کے ذریعے جو براہ راست محسوس ہوتے ہیں، اُن کا وجود اور ہمارا احساس ایک ہی وقت میں واقع ہوجاتے ہیں اور دونوں کے درمیان کسی میکانکیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نفسیاتی واقعہ بذات خود اپنی ہستی قایم کرلیتا ہے حالانکہ دماغی خلیوں خلیوں کی تعمیری اور کیمیاوی تبدیلیاں جو اس کو جنم دیتی ہیں آج تک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ اگرچہ ان کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ مشاہدہ بالواسطہ ہوتا ہے ان اطلاعات کے واسطے سے جو ہمارے حواس فراہم کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر دماغی خلیوں کی تبدیلیوں کے متعلق اس حسیاتی اطلاع (بصری ہو یا کوئی دوسری) کے سمجھنے یا توجیہ کرنے کے لئے غور و فکر کے واسطے کی ضرورت ہوگی یعنی ہماری دماغی خلیوں کا عمل یہ قرین قیاس نہیں کہ ہم فوراً ہی غور و خوض کرنے والی خلیوں کے وظائف کا مشاہدہ کرلیں اور اس سے بھی کم قرین قیاس یہ ہے کہ ہم ان تبدیلیوں کو اس مخصوص خیال کے ساتھ مربوط کرسکیں جو ان تبدیلیوں کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ تشریحی غور و فکر تو خارج از بحث ہے کیونکہ موضوع مرچکا ہوگا، اور دوسرے مناہج مشاہدہ بہت کچھ اٹکل پچو قیاس سے کام لیں گے۔ اس کے برعکس بغیر کسی دقت کے ہم اپنے خیالات کے ساتھ کھیل سکتے ہیں، ان پر تنقید کرسکتے ہیں، اور بغیر کسی مشکل کے ان کی اصلاح کرسکتے ہیں۔

دماغی ارتقا کا پتہ ہمیں خالص مجرد، یا جبا لیا تی تصورات سے چلیگا، یا ان خواہشات اور امنگوں سے جو جسم پر پوری طرح حکمرانی کرتی ہیں، اور ہم اس ارتقار پر عمل صرف انسے ملتے جلتے اعمال ہی کے واسطے سے کر سکتے ہیں یعنی نفسیاتی اعمال سے اور ارادے کے اعمال سے یقیناً جب ہم کسی سے باتیں کرتے ہیں تو غیر مادی خیالات جو ہم اس تک منتقل کرنا چاہتے ہیں وہ ہماری دماغی خلیوں کے مادی تغیرات، ساختی ہوں یا دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں اور جس شخص سے ہم باتیں کرتے ہیں اس کی دماغی خلیوں میں دوسرے تغیرات کو جا کر معین کرتے ہیں، لیکن اس شخص کے دماغ میں جو قابل ادراک اور قابل ضبط انفعالیت نتیجتاً پیدا ہوتی ہے وہ نفسیاتی صورت کی ہوتی ہے اور اس کے مادی انکشاف اور پیمائش پر ہم کو دسترس نہیں۔ اگر ہم اس قابل ہو بھی جائیں، تو جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں (صلا) کہ اگر ہم اس توانائی کی مقدار کو نا پ بھی لیں جو ارادے کی کسی سعی میں منتقل ہوتی ہے، تو بھی ہم اس قابل نہ ہوں گے کہ اس کے کیفیاتی ماحصل کا اندازہ کر سکیں۔ جب ہم "ہاں" کہتے ہیں یا "ناں" کہتے ہیں تو میکانکیتی سعی تو غالباً ایک سی ہوتی ہے۔ ہم "ناں" کو دھیمے اور "ہاں" کو چیخ کر کہہ سکتے ہیں۔ تاہم

"ناں" ایک شخص کی مایوسی اور خودکشی کا موجب ہو سکتی ہے حالانکہ
"ہاں" اس کو تسلی اور نئی زندگی کا پیغام دے سکتی ہے۔ معلوم ہوا
کہ توانائی کی مقدار جو خرچ ہوتی ہے اس اثر سے غیر متعلق ہوتی ہے
جو وہ پیدا کرتی ہے۔

ہم انسانی تفکر کی نوعیت پر کیمیاوی عمل کر سکتے ہیں (غددوں
کی رطوبت (HORMONES) یا دوائیوں سے) یا عملاً (داخلی
غددوں کو عمل جراحی سے نکال کر بھی) لیکن کبھی منظم اور ترقی
پذیر طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ ہم فطری اتفاقی کمزوریوں کی اصلاح
کر سکتے ہیں (جیسے پیدائشی کمزوری جس میں دماغی یا جسمانی نشوونما
رکی ہوئی ہو تو اسے درقیہ غدود کی رطوبت (THYRO.XGLAND) کو
پچکاری کے ذریعے خون میں داخل کر کے درست کر سکتے ہیں) ہم انسانی مشین
کو بگاڑ سکتے ہیں اور اس کی خاص اصلاح بھی کر سکتے ہیں لیکن
جب تک اس کی مخصوص قوت کار کے عملوں ہی کو مستعار لیکر
استعمال نہ کریں، نہ ہم اسے "چلا سکتے" ہیں، اور نہ ہی اس کی تکمیل
کر سکتے ہیں ہمیں ایک عجیب و غریب منظر کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ
میکانکیتیں تو اب بھی بعض کیمیاوی ضابطوں اور ذی حیات مادے
کی مدد ہیں لیکن اس کی قوت کار دوسرے ایسے رابطوں کے

زیر عمل ہے جو اسی قوت کار سے ماخوذ ہیں اور اگر ہمارا مفروضہ درست ہے تو ضرور عمل ارتقار کے ماورائے ادراک ضابطوں پر ان کا انحصار ہے۔

یہ مذکورہ بالا الجھا ہوا اسلوب بیان صحائف آسمانی کی زبان میں زیادہ سادہ مگر ہم معنی طریقے سے ادا کیا گیا ہے "میں خود اپنی عقل سے تو خدا کی شریعت کا مگر جسم سے گناہ کی شریعت کا محکوم ہوں" (رومیوں، پال ۷:۲۵)

لیکن یہ مختصر طرز بیان اُس سُرنگ کی مانند ہے جو کسی سلسلہ کوہ ہی کے نیچے سے نکالی دی گئی ہو۔ سیدھے ایک ہی منزل (یعنی پہاڑ کی دوسری جانب۔ مترجم) پر پہونچ تو گئے لیکن مناظر کو دیکھے بغیر بہت سے ذہین اشخاص کو تو جب تک وہ خود نہایت دشوار راستوں پر چل کر پار نہ جائیں اور ہر سنگ راہ اور ہر اپنی کوشش انہیں یاد نہ ہو، اس کا یقین ہی نہ آئے گا کہ انہوں نے مشکل پر قابو پا لیا ہے (یعنی سرنگ کا راستہ اطمینان میسر نہیں کرتا۔ مترجم) ابھی تک ابن آدم کو ادراک کے پورے سرمائے کا علم نہیں اور ابھی وہ اس پر اعتبار نہیں کرتا۔

جونہی ہم جسم اور روح کی علیحدگی کو اس طرح پر جیسے

ہم نے واضح کیا ہے یا کسی اور طریقہ پر تسلیم کرتے ہیں —— موضوعی
اور نفسیاتی عنصر پوری اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہر ہوشمند
شخص کو یہ احساس ہوگا کہ ہماری بلند پایہ اُمنگوں کی علت سائنٹیفک
تصورات سے ماوراء ہے۔ ہماری عقلی سرگرمیوں کو اس حقیقت کا اعتراف
کرنا چاہیئے اور ہماری کائناتی تمثال میں اس کا مقام ہونا چاہیئے۔
ہمیں اپنی ناقابلِ توجیہ امنگوں کا اعتراف کرنا چاہیئے اور اپنی موجود
حالت سے آگے نکل جانے کی خواہش کی مطلق قدر کو پہچاننا چاہیئے۔
ہماری یہ پرخلوص آرزو کہ ہم اخلاق میں ترقی کریں اور وہ کوششیں
جو ہم اس درجے کو حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں ہمیں ایک داخلی
معبد تعمیر کرنے میں مدد دیتی ہیں جس کے بغیر خارجی مذہبی نمائشیں
بے کار ہیں[15]

تاہم ہمارا یہ کہنے کا مقصد نہیں کہ یہ انفرادی کوشش
بذاتِ خود کافی ہے ہمارا مدعا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ صرف
یہی کوشش کافی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں۔ انسان تنہا
اپنی مرضی سے ہی اس اعلیٰ مقام کو حاصل کرسکتا ہے جس کی
طرف ارتقاء روحانی کر رہا ہے لیکن یہ بات بعید از عقل و قیاس ہوگا کیونکہ اس کا

---

۱۵ (حاشیہ از مصنف) خدا کا مقدس پاک ہے اور وہ محترم ہو (ذکر [illegible] کے نام پر [illegible] کا پہلا خطبہ ۱۴۳

مطلب تو یہ ہوگا کہ گویا یہ اس ارتقار کا خالق ہے جو اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سے چلتی چلی آ رہی ہے۔ وہ تو صرف اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کر سکتا ہے۔ جس طرح کہ "قدر بخت و اتفاق" کی مسلسل طبعی مداخلت) مطابقت ماحول کی پیدا کردہ عجیب المخلقت صورتوں کے علی الرغم، ارتقاء کے دوامی شعوری ترقی کا ضامن تھی ویسے ہی یہ مداخلت بھی نفسیاتی ترقی کے دوران میں لابدی ہے تاکہ اکتسابی سیرتوں کو انتخاب کیا جا سکے اور ان کو دوام دیا جا سکے۔

چونکہ اب ارتقار کی نوعیت بعینہ پہلے کی سی نہیں اور چونکہ اتفاق، تبدلِ نوعی، مطابقت ماحول اور انتخاب اصلح کی جگہ انفرادی کوشش اور روایات نے لے لی ہے اور چونکہ یہ جدید طریق ارتقا بے حد تیز رفتار ہے اس لیئے ماورائے فطرت مداخلت بھی مختلف نوعیت کی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ زیادہ "کفایت شعاری کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے" اور اس عمل میں اب تضییع کم ہوتی ہے۔ زندہ اجسام کے تدریجی ارتقار کے دوران میں، امکانی تجربی شکلیں جو ابتدا میں بے انتہا ہوتی تھیں یعنی ان پسندیدہ صورتوں کی تعداد جو مقصودہ سمت میں مزید ترقی کرنے کی

اہل تھیں، اب اوسطاً انکی تعداد گھٹتی چلی گئی۔ یہی صورت حال کھیلوں میں میر میدان کے انتخاب کے طریقے پر بھی صادق آتی ہے۔ ابتدائی آزمائشوں کے دوران میں حصہ لینے والوں کی بڑی تعداد بتدریج کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخری مقابلہ سے پہلے مقابلے میں مقدار بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ جبکہ تمام امکانی صورتوں کی آزمائش پیشِ نظر ہوتی تھی لاکھوں انڈوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن وہ ذوات، انڈوں میں اور بالخصوص انکے برتر طبقے میں آکر چند محدود بچوں کی شکل میں باقی رہ گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، قوتِ نطق اور روایات کی بدولت اب ہر چیز یوں ہو رہی ہے جیسے ہر فرد کی "اکتسابی سیرتیں" ارثی بن گئیں ہیں کیونکہ اب بچے باپ کے تجربے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ حیوانات کی ہر آنے والی نسل نئے سرے سے اپنی کائنات کی آگاہی حاصل کرنے پر مجبور ہو اور اپنے والدین اور اجداد کے تجربی اکتسابات اسے پھر سے اپنی زندگی میں جمع کرنے پڑیں یہاں تک کہ بالآخر خوش بختی سے کوئی ایسا نوعی تبدل اس کے ہاتھ لگ جائے جو کسی محدود منفعت کا حامل ہو، ہر نسل کا بہت سا وقت بچ جاتا ہے اور ہر فرد زندگی کے خطرات سے آگاہ ہو جاتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے

کہ اسے واقفیت ہو جاتی ہے۔ ابن آدم کے لئے وقت سمٹ جاتا ہے۔ وقت کی قدر اب، اتفاق کے پیدا کردہ شماریاتی ارتقاء کے پیمانے پر نہیں رہی، بلکہ انفرادی پیمانے پر آگئی ہے۔ تاہم، اگر انفرادی مطابقت عمل (اول تا عمل) تیز بھی ہو جائے، تو بھی پورے کرۂ ارض پر رہنے والی نسلوں کا ارتقاء، جو اخلاقی سطح پر مکتسب مسرتوں کو ارثی بنا دیتا ہے، محض ضمیر پر منحصر نہیں ہوتا، بلکہ ارتقاء کے طبعی طریق پر اس کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ابن آدم اپنی ضمیر سے، اپنے ارادے سے، اپنے خلوص سے، انتخاب اصلح میں امداد کرتا ہے لیکن یہ انتخاب خود نہیں کرسکتا۔

بشری اور معاشرتی نتائج :-

ہر فرد انسانی کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنی اہلیت کارکردگی کے مطابق، مکمل بشری نصب العین کے قریب تر ہوتا جائے! اور یہ سعی اپنے روحانی سکون حاصل کرنے کے خود غرضانہ مقصد کی خاطر سے نہیں اور اس خیال سے بھی کہ ربانی منشاء کی تکمیل کرکے وہ قلبی مسرت اور بھلائے دوام حاصل کرے۔

بلکہ منشاءِ ربانی کے ساتھ اشتراکِ عمل کر کے اس سے برتر نسل کی بعثت کی تیاری میں امداد کرنے ارتقاء کی موعود ہے۔

لہٰذا یہ نظریہ جمیع نوعِ انسانی میں ایک رابطہ اور ایک ایسا غائر آفاقی اتحادِ عمل فراہم کرتا ہے جو ذاتی بلکہ قومی تعصب اور طرفداری سے بھی پاک ہو۔ سب انسانوں کو باہمی اتحاد کے ساتھ انسانیت کے مشترکہ فریضہ میں امداد کرنا چاہیئے اور جب انفرادی نصب العین عمومی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جائے گا؛ تو ہر فرد سے جس سعی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ کسی قربانی پر مشتمل نہیں ہو گی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی شکل کاروبار میں لگے ہوئے راس المال کی سی ہو گی۔ انفرادی اور عمومی منفعت کا اتحاد صرف اخلاقی اور روحانی سطح پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ماہرانِ عمرانیات نے مدتوں اس مسئلے پر غور و خوض کیا ہے لیکن وہ اس کے حل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ ان کا تخیل اور ان کی تلاش ملکیتِ مشترکہ کے مادی فوائد ہی میں اُلجھے رہے۔ عمرانی نظامِ اخلاقیات نے ہمیشہ تخیل کے خوف افزا فقدان کا مظاہرہ کیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ بشری نفسیات اور اس کی بے اندازہ متاعِ گراں بہا

کو نظر انداز کرتے رہے ہیں بلکہ وہ صرف موجودہ نظاموں ہی میں مطابقتوں اور تبدیلیوں کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس خطرناک تخیل ہی کی عزت افزائی کرتے رہتے ہیں جو سیاسی، یا گروہ بند جماعتوں کا موجد ہے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ گروہ بندیاں تو عارضی چیزیں ہیں اگرچہ جب کسی برائی کی اصلاح مقصود ہو تو یہ بعض اوقات مفید بھی ثابت ہوتی ہیں لیکن یہ بالعموم آخرکار آزادی پر حد بندیوں کا موجب ہوتی ہیں بلکہ آمریتوں کے نزول کا باعث بن جاتی ہیں۔ ہر اس نظام اخلاقیات کا انجام، جو مادیت کے رنگ میں رنگا ہو، یہی ہوتا ہے۔ دُنیا ایسے بہت سے تجربے مشاہدہ کر چکی ہے۔ زمانہ حال ہی میں نہیں ماضی کے ہر دور میں یہ ہوتا رہا ہے۔ ایسی ہر سعی کی قسمت میں بالآخر ناکامی ہی لکھی ہے، یہ فعل تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ماہر کیمیا اس کوشش میں لگا رہے کہ طروت کی شکلیں بدل بدل کر وہ کیمیاوی ردّعمل کو ہلا دے۔

سب برائیوں کا سرچشمہ خود انسان کا اپنا مادی وجود ہے اس برائی کا قلع قمع کرنے کے لیۓ صرف یہی کافی نہیں کہ ان جبلتوں کے اثر کو زائل کیا جائے جو اس کو اپنے بہیمی اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں بلکہ ان توجہات کو غیر منضبط ذہنی سرگرمیوں کے رذائل کو گرا کن

اُمنگوں کو، جو انسانی اسلاف سے منتقل ہوکر ہمیں پہنچی ہیں دور کرتا ہے اور انکا مقابلہ کر کے ان کی جگہ انسانی عظمت کے احساس کو قایم کرنا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کیونکہ معمولی انسان بھی یہ جانتا ہے یا قیاس کرسکتا ہے کہ باشعور انسان کہلانے کا فخر تو جبھی حاصل ہوسکتا ہے جب وہ اپنی اُن سرگرمیوں پر، جن سے عموماً اس کی حیوانی خواہشات اور بشری شرمیں وابستہ ہیں، قیود عائد کرے۔

جب ہم ابنِ آدم کا اپنے نفس کے خلاف جدو جہد کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو اُس وقت اس کے نفس کے مطالبات ہی ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتے بلکہ معاشرے میں مشترکہ زندگی کی بدولت جو ذہنی بدہیئتیاں اس میں پیدا ہوگئی ہیں وہ بھی ہمارے خیال میں ہوتی ہیں۔ یہی وہ رذائل ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ جو پھوڑے پھنسیوں کی طرح اخلاق میں پیدا ہوگئے ہیں اور اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ ہیں تو بہت سے لیکن مثال کے طور پر ہم ایک کا ذکر کرتے ہیں: یہ ہے خواہش نمایاں ہونے کی، صفِ اول میں آنے کی، شہرت پسندی کی۔ اس مرض میں کم و بیش ہم سب مبتلا ہیں۔ جب تک کہ اس کا اظہار اپنے آپ کو بہتر بنانے کی شکل میں ہو یا مدرسے میں اپنے ہم سبق ساتھیوں پر

سبقت لے جانے کی شکل میں ہو، یہ اچھا جذبہ ہے کیونکہ اس سے
مقابلے کے صحت مند جوہر کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم یہ کبھی کبھی اصل مقصد
سے تجاوز کر جاتا ہے اور مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ پھر اس کا بھی
کچھ ہو جانا ممکن ہے، حرص، اقتدار، شہرت پسندی اور یہ سب
ترقی کرنے کی حقیقی اور مخلص قلبی کوشش کے لئے مضر ہیں اور ہماری توجہ
کو صحیح مقصد سے منحرف کر دیتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ذہانت
کی سب سے خطرناک برائی کی شکل اختیار کرے۔ یعنی اقتدار
کی ہوس۔ ہم میں سے بہت سے اپنے مختصر حلقۂ اثر میں آمر بننے
کے خواہشمند ہیں، اور جاہ پسند لوگ، جب ان کی پیشہ ورانہ قابلیتیں
ایسی نہیں ہوتیں کہ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں پر فوقیت حاصل کر سکیں،
تو دل خوش کن نمایاں کردار ادا کرنے کے لئے وہ اور بھی زیادہ
سرگرمی دکھاتے ہیں۔ یہ رجحان نہ صرف انفرادی ترقی کی راہ
میں روڑے اٹکاتا ہے بلکہ افراد کو مدہوش اقتدار کر دیتا ہے اور
دنیا خوب جانتی ہے کہ اس میں کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے۔

چونکہ مذاہب اس حقیقت سے آشنا تھے اور بشری نفسیات
کا وافر علم رکھتے تھے اس لئے انہوں نے جہنم کی اختراع کی جس کا
خوف آج سب کے دلوں سے غائب ہو گیا ہے۔ ابتدائی بے تعصب عیسائی

مذہب کو خود سچے عیسائی بنانے میں ہمیشہ کامیابی نہیں ہوئی۔ سپین کا بادشاہ فلپ، جو ایک عبادت گذار اور جوشیلا عیسائی تھا، جب بستر مرگ پر تھا تو اس نے اس وقت اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ زندگی کے آخری سالوں میں اسے جو مصیبتیں اُٹھانا پڑیں کہاں ان کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ اس نے کافی بدعتیوں کو نذر آتش نہیں کیا! حضرت مسیح علیہ السلام سے اگر یہ سوال پوچھا جاتا تو وہ کیا ارشاد فرماتے؟

دور رس نائیت کا ایک اور بشری اور معاشرتی نتیجہ پوری آزادی کا علی الاطلاق لزوم ہے اور یہاں ایک دفعہ پھر عیسائی عقیدے کی دور رس غائیت[1] کے نتیجے کے ساتھ ٹکر ہوتی ہے۔[2] جب سے ابتدائی خلیہ کا ظہور ہوا آزادی ارتقاء کا معیار رہا ہے۔ ابن آدم کی شخصیت کی نشو ونما آزادی ہی کی جانب راجح رہتی ہے۔ یعنی ایک مرتقی قوت اختیار کی جانب بیک وقت نصب العین بھی ہے اور اوزار بھی یہ نصب العین تو اس لئے کہ ایک نہ ایک دن انسان کو جسم کی استبداد سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اوزار اس لئے کہ جب تک ابن آدم میں خیر و شر میں سے انتخاب کرنے کی قوت

(باقی اگلے صفحے پر)

نہ ہو وہ اپنے ارتقا میں شرکت نہیں کرسکتا اور اپنی قلبی حالت کی گہری اصلاح نہیں کرسکتا۔ اس رائے میں ہم ایک نہایت قابل ذکر اور حیرت انگیز طرز پر ہوشمندانہ کتاب خدا ہے مشین" (THE GOD OF THE MACHINE) [1] سے پورے طور پر متفق ہیں جس میں ان سب مسائل کا تفصیلی بیان ہے جو کہ بنی آدم کو درپیش ہیں۔

عملی اور اخلاقی نتائج

اغلباً سب سے زیادہ اہم ضرورت اس امر کی ہے کہ عیسائیت کے سرچشمے اور اساسی اصولوں کی طرف رجوع کرکے مذہب میں پھر روح پھونکی جائے اور ان غیر رواداری خرافات کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے جو عقیدوں میں داخل ہوگئی ہیں اور جو عیسائیت کے مستقبل کے لئے خطرے کا باعث ہیں۔

(نوٹ صفحہ گزشتہ) (از مصنف) "اور جہاں کہیں خداوند کی روح ہے وہاں آزادی ہے۔" کرنتھیوں کے نام پولس رسول کا دوسرا خط باب ۳، آیت ۱۷)

[1] (از مصنف)

BY ISABIL PATERSON, PUTMAN, NEWYORK 1943

یقینی امر ہے کہ تیسری صدی عیسوی سے جو اضافے اور بشری تاثیرات مذہب عیسوی میں داخل ہونا شروع ہوئیں ان سے نئے مذہب کی سائنٹیفک صداقتوں سے بے اعتنائی کے ساتھ مل کر مادہ پرستوں اور ملحدوں کو سب سے زیادہ مضبوط دلائل مذہب کے خلاف بہم پہونچائے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بعض قدیم روایاتی رسومات کے ساتھ رواداری برتنے میں کلیسے مورد الزام نہیں ٹھیرائے جا سکتے۔ خرافاتی اساطیر، مقامی پوجا پاٹ کے مسالک، اور بعض رقت انگیز جادو ٹونے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ نوعِ انسانی اپنی طفولیت ہی میں ٹوٹے پھوٹے طریقوں سے اس تلاش میں رہی کہ کوئی نصب العین ایسا مل جائے جو اس کی وجدانی مطالبے کو پورا کرے، کوئی ایسا معبود جسے وہ جان پہچان سکے جس کی پرستش کر کے اپنی خواہش کی تسکین کرے، اور اس طرح اساسی مذہبی روح مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی رہی تاکہ ان اوقات میں جب ابنِ آدم غمزدہ ہو یا اسے کوئی خطرہ درپیش ہو تو وہ اس کی ڈھارس بندھائے۔

اضطراب و پریشانی، غم و محن کے بغیر تو حقیقت میں ابنِ آدم نہ انسانی جامے میں آسکتا ہے اور نہ ہی اس کی روحانی تمنائیں کھل کر سامنے آسکتی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ دکھ درد ثمر آور چیزیں ہیں

اور بعض اوہام پرستیاں قابلِ عزت ہیں۔ لیکن ان سے رواداری اسی صورت میں برتی جا سکتی ہے جب وہ صرف اپنی نہایت ہی سادھی اور سیدھی بے ضرر طفلانہ شکل میں ہوں۔ جب ان کی صورت محض محبت، احسانمندی اور اعتماد کی نہ رہ جائے اور وہ اپنے عقب میں عدم رواداری اور تشدد کا طوفان لائیں تو وہ خطرناک ہو جاتی ہیں۔ کوئی مذہب کامیابی کی توقع نہیں کرسکتا اگر وہ عدم رواداری اور تشدد کے ان دو [illegible] آخوروں سے رواداری برتتا ہے جو انسان میں کم ترین احساس شرافت کے رجحانوں کی ظاہری شکلیں ہیں، تکبر، نفرت، ریاکاری، ظلم و تعدی کی بدولت آزادی کے ساتھ، بے خوف پاداش اپنا اظہار کر لیتے ہیں۔

عیسائی مذہب نے اور مذاہب کی طرح، ان سے نقصان اُٹھایا ہے۔ اسپین میں ان کی بدولت مقدس دینی تفتیشی عدالتیں[1] وجود میں آئے یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ میں جادوگروں کی سزاؤں کیلئے

---

[1] از مترجم (HOLY CATHOLIC INQUISITION) جس کے شریک پادری تھے کی ایک عدالت جو بدعتیوں کو نہایت سنگین اور درد انگیز سزائیں دینے کے لئے قائم تھی۔

عدالتیں بنیں، اور یہ سب کچھ بے سمجھی اور جہالت کی وجہ سے اُسی ایک خدا کے نام پر اور اُسی ایک مقدس کتاب کی غلط بشری تاویلوں کی بدولت ہوا۔ آج کتاب مقدس کی تاویلات گو مختلف کیجاتی ہیں لیکن تشدد اور عدم رواداری کا جنازہ ابھی اُٹھا نہیں۔ جب معمولی اختلاف رائے کی بدولت ہزاروں بے گناہ انسان مارے جاتے رہے تو کیا یہ ہوشمندانہ بات نہ ہوگی کہ آج ہم کتاب مقدس کی ایسی تاویل کریں جو قرینِ انصاف ممکن ہو؟ کیوں نہ ہم ایک ایسے عقیدے کے ساتھ اپنے موجودہ مسائل کا سامنا کریں، جس عقیدے میں ایک طرف صحائفِ آسمانی کے لئے احترام موجود ہو اور دوسری طرف انسانی علمی ترقی سے پوری پوری آگاہی ہو؟ ان مادہ پرستوں کے حملوں کا جواب، جو معقولی تفکر کے واحد مالک ہونے کا بڑی جسارت سے دعویٰ کرتے ہیں، تو صرف اسی طریقے سے دیا جا سکتا ہے۔

ہماری اس رائے پر یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی کے لئے کتابِ مقدس کے سوا کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم ایک مخلص عیسائی کے دل میں یقین پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہماری تمنا تو دوسروں کو راہِ راست پر لانا ہے اور ہمارے تجربے نے تو ہمیں یہی بتایا ہے کہ

بہت سے لوگ جن کا عیسائیت پر ایمان ہے اپنے وجدانی یا جذباتی عقیدے اور اپنی سائنس میں خیالی تضاد کی بدولت گہری بے چینی میں مبتلا ہیں؛ ضرورت ان کو آگاہی بخشنے کی ہے، اور چونکہ انجیل کی پرانی اور قدیمی زبان، اگر ہم صرف الفاظ کو جن سامنے رکھیں، تو موجودہ ضروریات کے مطابق نہیں، اس لئے حتی الامکان ہمیں انہیں تصورات کو ظاہر کرنے اور اس کے نتائج سمجھنے کیلئے سائنٹیفک زبان استعمال کرنا چاہیئے۔ آج صرف یہی وہ زبان ہے جس میں دہریت اور مذہب کی طرف سے بے اعتنائی کرنے والوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جا سکتا ہے۔ اس زبان کو عظمت سند اسی امر کی بدولت حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی قدر و منزلت ثابت کر دی ہے اور ہمارے زمانے کے ذہنی نشو و نما اور علمی اکتشافات کے مطابق ہے۔ سائنس ہی کی امداد سے ہم ستاروں کی گردشوں کی پیش بینی کر سکتے ہیں اور جوہروں کی گردشوں پر قابو پا سکتے ہیں؛ یہی امراض کے دکھوں کو تسکین دیتی ہے اور انسانی زندگیوں کی محافظت کرتی ہے۔ یہی فطرت کی بے انتہا پیچیدگیوں کا راز فاش کرتی ہے اور بالآخر یہ کہ یہ جذبات سے مبرا ہے اور اللہ کی عظمت اور خالق کے تصور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

ہم فطرت کا انکشاف کائنات کے ایک ایسے نظام کی شکل میں ہوتا ہے جو علی الدوام تغیر پذیر ہے۔ کلیسا کے امام یکے بعد دیگرے اور تفریباً بالاتفاق کوپرنیکس کے نظام شمسی، زمین کی کرویت، اس کی قدامت، اور عمل ارتقاء کی صحت کو قبول کر کے، نظام فطرت کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پر انیسویں صدی میں کلیسا نے گویا کتاب مقدس میں سائنٹیفک صحت کے فقدان، اور مستحکم علمی انکشافات کے ساتھ اس کی مطابقت کے امکان کی ضرورت کو مان لیا ہے۔ لہذا اگر ہم مذہبی راسخ الاعتقادی سے یہ مطالبہ کریں کہ انسانی فہم وذکا نے کائنات کی بتدریج جو تسخیر کی ہے اس کو وہ قبول کر لیں تو یہ مذہب کے ساتھ کوئی آویزش نہیں۔

وہ شخص خوش نصیب ہے جو اپنے عقیدے میں پختہ ہے اور جس کی زندگی صحائف آسمانی کے احکام کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے، جو ان قلبی آویزشوں سے بے خبر ہے جن کا وجود خود پادریوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن کیا ایسا مخلص اور راسخ الاعتقاد انسان بہت عام ہے؟ ہمارا تو یہ خیال نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہم ان المیوں، ان جرائم، کبیرہ اور صغیرہ، ان باہمی جھگڑوں، اور اخلاقی برائیوں کی کیا توجیہ کر سکتے ہیں جو

ہمیں ہر طرف سے محیط ہیں اور جن کو بعض لوگ تسلیم کرنے کے لئے انکار کر دیتے ہیں تاکہ انہیں ناکامی کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ جو نقشہ وہ کہ انسانیت آج پیش کر رہی ہے وہ بجز چند خوش آئند استثناؤں کے روح فرسا اور حوصلہ شکن ہے۔ جب ہم اس کا سبب سمجھنے کی سعی کرتے ہیں تو ہمیں ایک گومگو کی کیفیت کا سامنا ہوتا ہے۔

اگر ہمارے خیال کے برعکس وحی الٰہی کا عطا کردہ مذہب ہی دنیا میں زیادہ رائج ہے اور اسی کو اعتقاد و اعتبار کی روح پھونکنے کا حق ہے تو واقعی نتائج کے پیش نظر فرد اور عوام کی اصلاح کے آلے کی حیثیت سے اس کی قدر معمولی سی ہے۔ اگر ابن آدم اپنے افعال اور اپنی زندگی کو عیسائی نصب العین کے مطابق نہ ڈھالے تو عقیدے کے اشاراتی ظواہر، پابندی کے ساتھ گرجے کی حاضری، نمائشی نیکی لاحاصل رسومات ہیں۔

اگر اس کے برعکس ہم یہ اعتراف کریں کہ مذہب کا عام شیوع نہیں ہوا تو جب بھی ہم کلیساؤں کی قوت، تعداد، اور جاہ و مرتبت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ مذہبی الاپ، رسائل، صحائف مقدس، اور وعظ و نصائح، انسان کو یقین فراہم کرنے کی قوت کھو بیٹھے ہیں اور بنا بریں ضرورت اسکی

ہے کہ ابنِ آدم کے قلب، ذہانت، اور ضمیر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دوسرے طریقے انگیز کیے جائیں۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ ان دونوں مفروضوں میں سے کونسا درست ہے بہر دوصورت یہ ظاہر ہے کہ کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ ہم ان دلائل سے جن کی اساس بنی نوعِ انسانی کے صدیوں کے ذہنی اندوختے سے استفادہ کرنے پر رکھی گئی ہے اپنے جبلی یا وجدانی تصورات کو تقویت پہنچائیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کاغذی باڑھوں کو جن کی ہیئت کذائی بدل کر ایسا بنا رکھا ہے جیسے وہ لوہے کے جنگلے ہوں توگرادیا جائے، جو افسوس ہے کہ لوگوں کے درمیان حائل ہیں اور ایسے وقت میں ان کی کوششوں کو ناکارہ کر رہی ہیں جب کہ مستقبل کو تشکیل دینے کے لئے ان کی قوتوں کے اشتراک کی سب زمانوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ مصنف کو علم ہے کہ ایسے کیسے ہیں جن کو ان سب باتوں پر پورا یقین ہے۔ لیکن کچھ کیسے ایسے بھی ہیں جن کو کوشش کر کے آمادہ کرنا ہے۔

سب اس پر متفق ہیں کہ نوعِ انسانی کی اخلاقی رفاہ لازمی ہے، لیکن بعض مذہبی اشخاص کتبِ آسمانی کا مطلب غلط

سمجھ کر کلیتاً رسوم کے بجا لانے، اور فضلِ الٰہی پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں
اور اس توکل علی اللہ میں وہ ملحدوں سے ملتے جلتے ہیں جو کہ معاشرتی
تنظیم اور بخت و اتفاق پر آسرا لگائے ہوئے ہیں۔ ان دونوں انداز
فکر کے، جن میں بظاہر بعد المشرقین ہے، نتائج ایک ہی ہیں کیونکہ یہ
دونوں انفرادی، داخلی، معقولی سعی کو ثانوی حیثیت پر گرا دیتے ہیں
نیک نیت اور دیندار لوگ، جن کی طرف ہمارا روئے سخن ہے،
ہر اس عقلی سعی کو، جو خدا اور مذہب کے ماورائے عقل اساسی مسائل
کی طرف بڑھنے کی کی جائے، قیاس قبل از وقوع ہی سے مسترد
کر دیتے ہیں اور یوں ایک ایسی شاندار خود پسندی کا اظہار کرتے
ہیں جس میں اگر نوع انسانی سے ہمدردی کا خیال زیادہ ہوتا تو
تحسین کے قابل ہوتی لیکن ازمنہ وسطیٰ کی عدم رواداری لئے ہوئے
ہونے کی وجہ سے اس سے وحشت آتی ہے۔ مادہ پرست عنصر کا
اعتماد محض خارجی اور معاشی تدبیروں پر ہے جو انفرادی آزادی
کو پامال کرتی ہیں اور حکمی طور پر آمریتوں کی جانب رہبری کرتی ہیں،
یا، اور یہ بھی مماثل صورت ہی ہے، ایسی تنظیموں کی طرف جن کا خیال
حشروں کے "معاشروں" کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔
یہ کہا گیا ہے کہ جب کوئی شخص جان یا اذیت کے خوف

کے ماتحت ایک جو سٹیلا اعتقاد خدا کی ہستی پر کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذہنی قوائے بے آب ہو گئے ہیں اور درحقیقت وہ صرف اپنے اجدادی توہمات کی طرف رجعت قہقری کرتا ہے۔ یہ تو کچھ یقینی بات نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ بالکل ممکن ہے کہ ذہنی قوائے کسی عارضی حادثے سے نجات پا کر خوف کے باعث ایسی انتہائی فعالیت حاصل کر لیں جو صورت معمولی زندگی میں پیش نہ آتی ہو لیکن اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ خطرے کی موجودگی قوت فکر کی قدر کو دباتی ہے اور یہ بھی مان لیں کہ جو لوگ پرامن گھروں میں اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں صرف وہی ہوشمندانہ غور و فکر کے اہل ہیں، تو ہمیں اس مسئلہ کی اکثریت کے فیصلے پر توجہ مبذول کرنا ہوگی جنہوں نے ہماری سائنس اور ہمارے فلسفہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں، اور جو خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے تھے اگر کوئی ایسا سائنس دان جس کو یہ اطمینان تک نہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد سائنس کی تواریخ میں اس کا بھی کوئی آثار پائے جائیں گے فخر و مباہات کے ساتھ یہ دعوےٰ کرے کہ نیوٹن[۱]، فیرے ڈے، میکسول، ایمپیئر، یا مجر ذہنی اعتبار سے اس سے کم درجے کے سائنس دان تھے

۱؎ (از مترجم) نیوٹن (سر آئزک نیوٹن ۱۶۴۲-۱۷۲۷) انگلستان کا رہنے والا مشاہیر علمائے سائنس

تو ہمیں یہ انتہائی مہمل دعویٰ معلوم ہوگا۔

یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ سائنس نے ترقی کرلی ہے اور مذکورہ بالا مشاہیر سائنس کے پاس وہ علمی عناصر نہ تھے جو آج ہمارے پاس ہیں۔ اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی ہمارے بہترین ماہرین سائنس میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں نیز یہ کہ اس کتاب کا شروع کا حصّہ کلیتًا یہی ثابت کرنے پر صرف ہوا ہے کہ گزشتہ چالیس برس میں جو معلومات حاصل ہوئی

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ:-

ہیں جیسے اس نے حرکت اجسام کے تین ضابطے اور قانون کشش ثقل پیش کیے۔ سائنس اور ریاضی میں اعلیٰ پایہ کے انکشافات کیے۔ فیری ڈے (MICHAEL FARADAY ۱۸۶۷-۱۷۹۱) انگلستان کا مشہور عالم طبیعیات ان کا زیادہ تر کام برقی مقناطیس کے متعلق ہے۔ شہرۂ آفاق ہے۔ کلیرک Maxwell JAMES CLARK MAXWO (۱۸۳۱-۱۸۷۹) انگلستان کے مشہور عالم طبیعیات و ریاضی ان کا مشہور برقی مقناطیسی موجوں کی ... وات علی وہ بجلی یا ریاضی حال کی ایمپیئر (ANDRE-MARIC AMPIRE (۱۸۳۶-۱۷۷۵) فرانس کے مشہور عالم طبیعیات برق اور مقناطیس میں رابطہ دریافت کیا اور بجلی کی رو کی اکائی آج تک ان کے نام سے منسوب ہے۔

پاسچر (PASTEUR) انیسویں صدی کے اوائل کا مشہور فرانسیسی سائنس داں۔ جنون کے جراثیم پر کام کیا۔ کتے کے کاٹے کا علاج نکالا اور دنیا میں شہرت حاصل کی۔ ان کا نام ادب میں داخل ہوگیا ہے اور ہر جگہ ان کے نام سے علمی ادارے قائم ہیں۔

ہیں وہ بجائے اس کے کہ مادہ پرستوں کے نقطۂ نظر کو تقویت پہنچائیں ان کو ساقط الاعتبار کر دیا ہے۔ ایڈنگٹن، جو ایک بڑے ہیئت داں اور ریاضی داں ہیں، نیز دنیا کے بہت سے عظیم المرتبت ماہرینِ حیاتیات نے گذشتہ بیس برس میں اس موضوع پر بہت کچھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

تشدد پسند مذہبی شخص ہو یا کوئی ملحد، دونوں میں ہمیں ایک ہی سی بشری کمزوری دکھائی دیتی ہے یعنی تکبر اور ایک ہی سی فیصلے کی گمراہی جسکے باعث انسان نفسیاتی سرگرمی کے نصف کو یا تو نظر انداز کرتے ہیں یا اس سے انکار کرتے ہیں۔ اول الذکر تو ذہنی حصے کا منکر ہے، موخر الذکر وجدانی حصے کا۔ یہ خیال کہ انسانی شخصیت ان دونوں عناصر کے ہم آہنگ اتحاد ہی سے وجود میں آتی ہے، ان کے ذہنوں میں آتا ہی نہیں۔

فطرت کائنات میں ہر طرف ہمیں جدوجہد نظر آتی ہے اس کا تخلیقی یا تحفظی فعل انسان میں کیوں جلوہ پذیر ہو؟ اگر اسے کوئی کردار ادا نہیں کرنا تھا تو جدید خالص بشری تجریدی ذہانت معرض وجود میں ہی کیوں آئی؟ خدا پر ایمان رکھنے والے شخص پر یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ کوئی سائنٹفک دریافت، جب تک کہ وہ حقیقت سے دور نہ ہو جائے، خدا کے عقیدے کے منافی

نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے حقیقت نہ ہوگی۔ اس لئے اگر کوئی شخص سائنس سے خائف ہے تو یہ اس کے اپنے ایمان کی کمزوری ہے (یہ جواب ہے مذہبی انتہا پسندوں کو) اس انسانی آویزش سے جس کا ہم نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے' ہماری مراد اس جدوجہد سے ہے جو ابن آدم کی ماورائے عقلی امنگوں اور اس کی ابتدائی جبلتوں کے درمیان جاری ہے' اور ساری دماغی قوتوں سے اشتراکِ عمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ کوئی سمت متعین کئے' یا حدبندی لگائے بغیر یہ ذہنی سعی کو معنی خیز بنا دیتی ہے۔

ایک امر واقعہ ایسا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا' وہ یہ کہ جدوجہد کرنے کی آرزو' کسی اعلیٰ مرتبے کو حاصل کرنے کے لئے جان لڑا دینے کی تمنا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ابھی تک یہ تمنا عالمگیر نہ ہو تاہم بھی یہ فطرتِ انسانی کا ایک امتیازی شرف ہے اور ایسا شرف جو سب سے زیادہ انسان کو ارتقاء کے ربانی عمل کے ساتھ مربوط کرتا ہے ہم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں کہ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور تمام ذہنی سعی ایک بیکار شے ہے

ابنِ آدم کا نصب العین صرف یہ ہونا چاہیئے کہ انسانی شرف عظمت کو اس کے

پورے مفہومات کے ساتھ تکمیل کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے اپنے تمام
ذہنی اکتسابات کو معاشرے کی بہم کردہ تمام سہولتوں کو (جیسے
مدارس، دارالعلوم، کتب خانے، معمل علمی)؛ تمام مذاہب کی
بہم کردہ اطلاعات کو؛ اپنی صلاحیتوں، اپنے کام اور اپنی
فضیلت کو بہتر اور مفید بنانے کے سب مواقعوں کو، اپنی شخصیت اور
اپنی اخلاقی حالت کو سنوارنے کے آلات تصوّر کرنے چاہئیں۔ اگر
تعلیم و تربیت کردہ اپنی ذہنی سرگرمیوں کے میدان کو وسیع کرنے،
جاہ و جلال حاصل کرنے، یا مادی دولت فراہم کرنے کا ذریعہ
سمجھتا ہے تو وہ غلطی میں مبتلا ہے۔ اسے تو سائنس اور ثقافت
کو اپنے آپ کو اخلاقی طور پر بہتر بنانے، اور دوسروں کی ترقی
میں امداد دینے میں، استعمال کرنا چاہیے۔ اگر تدریس کو بذاتِ
خود ایک نصب العین بنا دیا جائے تو وہ ناکارہ ہو جاتی ہے،
اور اگر اسے خود غرضانہ جذبات یا کسی ایک گروہ کے فوائد کا محکوم
بنا دیا جائے تو وہ خطرناک چیز ہو جاتی ہے۔ علم خواہ کتنا ہی متنوع
ہو، محض اس کو ذخیرہ کر لینے اور صرف خارجاً اس کو استعمال کر لینے
سے انسان کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی اور اگر ایک عالم نے
انسانیت کے ایک ذمہ دار عنصر کی حیثیت سے ارتقا کے عمیق

مدارج طے نہیں کیے تو یہ ساری مشیت ملی بے کار ہے۔ دنیا کے
مکروہات کی طرف سے اسے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا چاہیئے اور
اگر اس کی راہ میں گڑھے کھود دیئے جائیں تو ان سے ڈر کر صراط
مستقیم سے انحراف نہ کرنا چاہیئے۔ اسے اپنی لغزشوں کو مسخر کر کے
اپنی نگاہ اس حسن وجمال پر لگائے رہنا چاہیئے جو اسے اپنے اعماق
ضمیر سے حاصل ہوتی ہیں، ممکن ہے آج اسے یہ حسن وجمال ایک
فریب نظر ہی معلوم ہو لیکن یہی آنے والے فردا میں ایک عظمت نمایاں بن جائیں گی۔

دوسروں کو آمادہ کرنے یا ان سے عہدہ برآ ہونے سے
پہلے اسے اپنے نفس کو آمادہ کرنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔
ان سب ذرائع کو جو اسے حاصل ہیں استعمال کر کے اسے اپنے قوت ارادہ کو ایک
راسخ عقیدہ تعمیر کرنے میں لگا دینا چاہیئے۔ گو یہ عقیدہ صرف شرف
انسانی اور مقدر انسانی کے یقین تک ہی محدود ہو۔ اس میں
طریقۂ کار کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مختلف
وادیوں سے چلنے والے مسافر کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کریں
جب تک وہ راستہ پہاڑ کی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے وہ
قلۂ کوہ پر ایک دوسرے سے ضرور مل جائیں گے۔ کسی کو اس بات
پر فخر نہ کرنا چاہیئے کہ جو راستہ اس نے منتخب کیا ہے وہی بہترین

ہے اور نہ ہی اپنے ہمسائے کو اپنے نقشِ قدم پر چلانے کے لئے جبر و اکراہ سے کام لینا چاہیئے۔ ہر شخص وہی راہ اختیار کرے گا جو اس کی دماغی ساخت، اس کے توارث، اور اس کی روایات نے عائد کیا ہے۔ اس کو سہارے روشن خیالی اور امداد کی پیش کش کی جا سکتی ہے۔ لیکن جو نسخہ ایک پر کامیاب ہو وہی دوسروں پر ممکن ہے ناکام ہو، اور ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق جدوجہد کرتا رہے کیونکہ اس کے بغیر اسکی ترقی ناممکن ہے صداقت کو پا لینے کا کوئی ایک قریبی راستہ نہیں۔[۱]

قابل اعتبار شئے صرف سعی ہے۔ یہی بنی نوع انسانی کی روحانی قرابت کی تصدیق کرتی ہے اور جو رشتہ یہ قائم کرتی ہے وہ اور سب رشتوں کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہے۔ ایک دن وہ آئے گا کہ جب ارتقار کی بدولت اخلاقی تکمیل جو نوع انسانی کی اقلیت میں پوشیدہ ہے اکثریت میں کھلائے یک رنگ و بو کی شکل میں ہویدا

---

[۱] (از مترجم) کاش "صراط مستقیم الذین انعمت علیہم" اور "غیر المغضوب علیہم و لا الضالین" کہکر اسلام نے تجویز کیا ہے اس کی تمیز مصنف کو ہوتی تو وہ یقیناً یہ رائے ظاہر نہ کرتا۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ یہی وہ طریق ہے جو جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بتایا۔

ہو گی اور اسی دن لوگ اس محبت اور راحت کو بھی سمجھیں گے جو
حضرت مسیح کی ذات سے منسوب ہوئی ہر دوست ہی نعمت کے نزول کے وقت کو
قریب لانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ابن آدم اپنی
اصلاح میں لگا رہے۔ اپنی تکمیل کے لئے محنت شاق اٹھانے سے،
اپنا داخلی معبد تعمیر کرنے سے، بغیر آسودہ خاطر بیٹھے اپنا احتساب
کرتے رہنے سے، انسان غیر شعوری طور پر ایک روح انگیز کر لیتا
ہے جو سیلاب کی شکل میں اس سے نکل کر چاروں طرف پھیلتی ہے
اور دوسروں پر اثرانداز ہونے کے لئے بے تاب ہوتی ہے! اپنی
تلاش میں لگنے سے ابن آدم کو ایک بھائی مل جاتا ہے ترقی کرنے کے لئے اسے
اپنے نفس امارہ سے جنگ ناگزیر ہے۔ نفس کے ساتھ جنگ کے
لئے اسے معرفت نفس درکار ہے؛ اگر اسے نفس کی معرفت حاصل
ہو جائے تو وہ دوسروں کے لئے مروت اور شفقت کا پابند بنجاتا
ہے، اور وہ مزاحمتیں جو اس کے اور اس کے ہمسایوں کے درمیان
حائل ہوتی ہیں بتدریج دور ہو جاتی ہیں۔ انسانی شرف کی تلاش
اور احترام کے سوا کوئی دوسرا طریقہ بنی نوع انسان کی یکجہتی
اور اتحاد کے حصول کے لئے نہیں ہے۔

(۱۷)

ذہنی یا اخلاقی نشو ونما؟
آثار ابن آدم

اب ہم چوتھی بُعد ”زمان“ میں اپنے سفر کے اختتام کے قریب ہیں۔ دو درس غائیت کے مفروضے ہیں، جو اب تک پیش کیا گیا ہے، غائیت کی تھوڑا سا مختلف تصور شامل کرکے، ہم اس قابل ہوگئے تھے کہ مشاہدے میں آنے والے واقعات کے درمیان ایک تسلی بخش لزوم قائم کرسکیں، اس طرح ارتقا کے

۱؎ (از مترجم) مکان کی ابعاد ثلثہ یعنی لمبائی، چوڑائی، اور اونچائی سے ہم واقف ہیں۔ چوتھی بُعد کا خیال مدت سے ریاضی دانوں کے ہاں موجود رہا۔ لیکن آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے بعد ریاضی کے بطون ”زمان“ واقعات عالم کے تعین میں چوتھی بعد کی حیثیت سے باقاعدہ شامل ہو گیا ہے۔

یکتا تصور میں مظاہر فطرت کی معتدبہ تعداد کے شمول اور ابن آدم کی خصوصی سرگرمیوں (بالخصوص اخلاقی تصورات) کے ضم کر لینے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی بدولت جو عملی نتائج منطقیانہ طور پر سامنے آئے۔ وہ بالعموم بعینہٖ وہی ہیں جو صحائفِ آسمانی سے حاصل ہوتے ہیں۔

مصنف کو کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ جو رہنمائی بخش سررشتہ اس نے تجویز کیا ہے وہ ہر مشکل کی وضاحت کر دے گا یا قطعی ہوگا۔ اس کے ذہن میں تو اس کی اہمیت صرف اتنی ہی ہے کہ وہ اس حقیقت کی سمت میں ایک اقدام ہے جو حقیقت ممکن ہے کبھی بھی ہماری دسترس میں نہ آئے۔ لیکن اس کا اسے یقین واثق ہے کہ جب تک قانونِ ارتقا کو پوری فطرت کائنات پر جس کا ایک لازمی جزو انسان اور اس کی اخلاقی اور ذہنی ترقی ہے منطبق کر کے مسئلے کا حل تلاش نہ کیا جائیگا اُس وقت تک کامیابی نہ ہوگی۔

جو مفروضہ بھی اختیار کیا جائے وہ ایسا ہونا چاہیے اس سائنٹفک عمارت کی ہیئتِ سالمہ کا احترام کرے جو لیوازیہ (LAVOISIER)[1] کے زمانے سے لے کر اب تک بتدریج تعمیر ہوا

---

[1] (از مترجم) LAVOISIER فرانسیسی ماہر علم کیمیا (۱۷۴۳ — ۱۷۹۴) ... تحقیقات کیں (باقی اگلے صفحہ پر)

منظم ہوتی ہے۔ یہ بنائے عظیم، طبیعیات اور کیمیا کی اقلیم میں، ایسے عمومی ضابطوں، آفاقی اصولوں پر مشتمل ہے اور ایک ایسا مربوط اور متجانس منظر پیش کرتی ہے جسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اغلباً یہ معروضی حقیقت بھی کسی ملتے جلتے نظام کے مطابق ہے۔ ارتقار کا ہر وہ نظریہ جو مادے کے متعلق ہمارے دریافت کردہ ضابطوں کی عمارت کو غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ بالخصوص احتمال کے ضابطوں کو یعنی مسئلہ جبر پر رائج الوقت تصورات کو خود بخود خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

فائنیت کے تصور کی طرف ہمارا تدریجی اقدام کسی جذباتی وجہ کے ماتحت نہ تھا۔ یہ ہر طرح پر ایک ایسے استدلال کا نتیجہ تھا جو کبھی کبھی کسی نئے مظہر فطرت کے انکشاف کا موجب بن جاتا ہے۔ کئی برسوں تک اس تصور کی ہر طرح کی آزمائش کی گئی اور ہر قسم کی تنقید اس پر کی گئی۔ یہ ہر آزمائش اور تنقید سے عہدہ برا ہوتا رہا اور ترقی کرتا رہا۔ اس سے پہلے جتنے مفروضے پیش ہوتے رہے ان پر ہمارے مفروضے کو یہ فوقیت ہے کہ یہ غیر ذی روح مادے

بسلسلہ صفحۂ گزشتہ۔

ادراس کے مرکبات پر کی اور ۱۷۷۲ء میں عمل احتراق پر تجربات شروع کیے۔

نے متعلق شعبہ ہائے سائنس کے حاصل کردہ نتائج کی تغلیط نہیں کرتا۔ مظاہر فطرت کی میکانکیتوں کا احترام کرتا ہے۔ اور عمل ارتقا میں شماریاتی طور پر ان کو شریک کار سمجھتا ہے۔ تاہم اسکا امکان ہے کہ اس سے بعض ان مشاہیر علمائے سائنس کے غیر علمی جذبات کو ٹھیس لگے گی جو یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں کہ کارنو کا اہم ضابطہ ذی روح اجسام پر صادق نہیں آتا۔ ہمارے دعوے کو تجربات کے ذریعے غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ مصنف کو، جو ایک آزمودہ کار ماہر حیاتیات ہے، ان کے تجربات کے نتائج کے متعلق ذرہ برابر بھی تشویش نہیں، ہاں اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ ان کے ظہور میں آنے کے لیے طویل عرصہ درکار ہوگا۔

بعض قارئین کو ممکن ہے حیرت ہو رہی ہو یا اس امر سے صدمہ بھی پہونچا ہو کہ یہ مفروضہ اخلاقی اور روحانی اقلیم تک ممتد کردیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو کلیتاً اصول استدلال کے مطابق نتیجہ نکلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جونہی ہم بتدریج نظریۂ غائیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے' یا بالفاظ دیگر جوں ہی ہمکو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ارتقاء کی توجیہ ایک غیر علمی مفروضے "ضدِ اتفاق" کی مداخلت کو مانے بغیر ممکن نہیں۔

یہ واضح ہو گیا کہ توضیح فطرت فراہم کرنے کی کوشش میں ہمیں اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ہم اپنے آپ کو سائنس کے معروف اور ناپ تول کے قابل مظاہر تک ہی محدود رکھیں۔ جہاں تک کہ طبیعاتی کیمیاوی ضابطوں کے عمل دخل کا تعلق ہے ہمارا نظریہ اساسی طور پر ان نظریوں سے مختلف نہیں جو آج تک پیش ہوئے ہیں۔ یہ اوروں سے مختلف صرف اس بنا پر ہے کہ یہ صاف صاف غائتی ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سادہ ذی حیات اجسام میں بھی طبیعاتی کیمیاوی ضابطے زیادہ عمومی ضابطوں کے مفتوح اور محکوم بن کر کارفرما ہیں اور یہ عمومی ضابطے ان ضابطوں سے مختلف ہیں جو جامد مادے میں عمل پیرا ہیں اور جن کا ہمیں ابھی پوری طرح سے علم نہیں۔

ایسی ہی حدبندیاں جامد مادے کی اقلیم میں بھی پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر جب کسی متجانس "ام محلول"[1] میں بلور کی قلمیں بنتی ہیں تو اس میں ایسے تشاکل رونما ہوتے ہیں جو براوئنی حرکت

---

[1] (از مصنف) اُمِ محلول (MOTHER-SOLUTION) : وہ محلول ہے جس میں نمک ڈالنے سے بلوری قلمیں بن جاتی ہیں۔ [2] (از مترجم) کسی منجمد مادہ۔ جیسے نمک کے محلول میں ذرات کا

کی عائد کردہ شماریاتی تجانس کو برباد کر دیتے ہیں، یا جب کہ گبس تامسن[1] کے ضابطے کے مطابق سطحی عامل سالمے "جذب" ہو جاتے ہیں یعنی دوسرے ساتھیوں سے جدا ہو کر سطح پر آجاتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں محلولوں کے مخصوص ضوابط دوسرے ضوابط کے زیر اثر آجاتے ہیں جن کا اطلاق ان غیر معمولی سالموں پر ہوتا ہے حیات بعض محلولوں (جیسے نخز مایہ PROTOPLASM) کو غیر معمولی خواص حوالے کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ نئے ضابطوں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

صریحاً جو مفروضہ ہم پیش کر رہے ہیں اس کی اساس ایک اصول موضوعہ پر ہے۔ لیکن یہی صورت تو اقلیدس کے علم ہندسہ

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) مسلسل اضطراب جو کسی محیط واسطے کے سالموں کے ساتھ ذرات کے غیر متوازن تصادمات کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور خورد بین سے دیکھا جا سکتا ہے BROWNIAN MOVEMENT کہلاتا ہے چونکہ ذرات کی تعداد بے شمار حساب ہوتی ہے اس لئے نتائج شماریاتی حساب سے متوقع ہوں گے۔

[1] جب حل ہونیوالے مادے کسی محلل کے سطحی تناؤ کو کم کر دیں اور سطح پر مرتکز ہونا شروع کر دیں تو یہ GIBLO-THOMSON کا ضابطہ کے مطابق عمل ہے۔

کی ہے اور آئن سٹائن (EINSTAIN) کے نظریہ اضافیت میں تو ایک درجن سے زائد اصول موضوعہ ہیں۔ یہی بات بہت سے جدید نظریوں پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہمارا اصول موضوعہ ہی تنہا ایسا ہے جو ابنِ آدم کی ہستی کے لیئے ایک معقول وجہ پیش کرتاہے اور اس کی زندگی کو ایک واضح اہمیت منسوب کرتا ہے۔ علمی لحاظ سے یہ مفید ہے اور بہت سے مسائل پر جو اب تک مبہم تھے روشنی ڈالتا ہے۔ بالآخر اس میں ایک زائد برتری یہ بھی ہے کہ وہ ابنِ آدم کی داخلی سرگرمیوں کا ارتقار کی مجموعی حیثیت کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح روحانی تائید کو عقلیت کا رنگ دیتا ہے جن کی سب کو شدّت کے ساتھ ضرورت ہے۔

اگر ہم میں کافی جسارت ہو تو ان تصورات کی بنا پر جو اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں پیش کیے گئے ہیں ایک جست لگا کر معلوم حالات سے نامعلوم حالات اخذ کرتے تو سر آئیزک نیوٹن کے ہوشمندانہ الفاظ میں یہ کہتے کہ ہر واقعہ کائنات میں کچھ اس طرح ہو رہا ہے کہ مادی کائنات کا زوال پذیر ہو کر غیر متحرک ابتری کی صورت اختیار کر لینے اور فنا ہو جانے کی طرف میلان کا نعم البدل یہ ہوگا کہ اسی وقت ایک غیر مادی کائنات کا عروج ہوگا یعنی روح کا جس کی ہم آہنگی اور تکمیل جامد کائنات

کی خاکستر سے نمودار ہو گی۔

اتنی دور کی کوڑی تو ہم نہیں لاتے، لیکن زیادہ حق پسندی کے ساتھ چھوٹی جست لگا کر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ خود اپنی ذات سے یہ سوال پوچھیں کہ اگر دماغ کی سرگرمیوں کے مقدر میں تسلسل ہے تو آیا یہ تسلسل اخلاقی اور روحانی اقلیم میں ہوگا یا محض ذہنی اقلیم میں: یہ ایک اہم سوال ہے اور مستحق غور و خوض ہے۔

"ذہانت[1] اپنے لغوی اور حرفی معنوں، ابن آدم کی حیثیت ایک طالب علم کی قایم کرتی ہے جو علی التواتر کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔" (PASCAL[2]) لہذا اپنی کائنات کے مقابلے میں ابن آدم کی حیثیت مستقل طور پر کمتری کی ہے۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ کسی نہ کسی دن وہ ہر گتھی سلجھا لے گا۔ تب وہ اپنی سائنس کا کیا کرے گا؟ اور اس کی کامیابی کے نتائج کیا ہوں گے۔؟ اگر کچھ سیکھنے

---

[1] (از مترجم) (INTELLIGENCE) لاطینی مصدر (INTER-LEGERA) کے معنی چھانٹ کر اکٹھا کر لینے کے ہیں۔ اس کی طرف مصنف کا اشارہ ہے۔

[2] (از مترجم) BLAISE PARCAL ۱۶۶۲ - ۱۶۲۳ یہ فرانس کا جید ریاضی داں اور فلسفی تھا اس کی کتاب THONGHTS یعنی خیالات "تفکرات" روحانیات کے عالموں کیلئے اعلیٰ قدر رکھتی ہے۔

کو باقی نہ رہ جائے گا تو وہ اپنا وقت ذہنی کوششوں میں صرف نہیں کرے گا کیونکہ تب نہ تو کوئی اسرار قدرت باقی رہیں گے اور نہ ہی مادی اشیا میں اسے کوئی دلچسپی ہوگی جو اب اس کی سائنس کے موضوع مشاہدہ ہیں۔ لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا کیونکہ غیر معمولی ذہانت اور گراں پایہ علمیت والا انسان گھناؤنا ہو جاتا ہے۔ برخود غلط ہونے کی عادت اور دوسرے رذیل جذبات بغیر روک ٹوک اس میں نشو و نما پائیں گے' قساوت قلبی، جو جذباتی اذیت رسانی کا خاصہ ہے' لازماً سرسبز ہوگی اور صرف قوت استدلال کا احترام ہوگا اقتدار کی ہوس، تباہ کن ایجادات سے شہ پاکر' جن کا کچھ اندازہ پچھلی جنگ میں ہو چکا ہے، ہولناک لڑائیوں کا موجب ہوگی اور بنی نوع انسان کی اکثریت کو غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے گی۔ یا پھر یہ ہوگا کہ اگر اس کی ذہانت نے اسے ہر طرح کی حب جاہ سے بے نیاز کر دیا ہے تو وہ اس کائنات سے عاجز آ جائے گا جس میں اب اس کے لئے کوئی راز باقی نہیں رہا ہوگا اور جس میں سے اس نے جمال کو بھی مار بھگایا ہوگا۔ کیونکہ یہ یقینی نہیں کہ احساس جمال' ذہانت کی تسخیر قدرت سے کلیتاً آزاد ہو کر اپنے وجود کو باقی رکھ سکے گا۔ اس وقت یہ قرین قیاس ہے

کہ انسانی نسل بتدریج صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی یا پھر حیوانیت کی طرف ارتجاع کرکے کثیر نسل افزائی میں لگ جائے گی جو زیادہ اغلب نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ مفروضہ مادی ترقی اور مذہبی اور اخلاقی ضابطوں کا فقدان اس کے مانع ہونگے۔

علاوہ بریں یہ کبھی ممکن نہ ہو سکے گا کہ نوع انسانی کی ایسی نسل تیار کرلی جائے جس کا ہر فرد پورا پورا اور مساوی طور پر ذہین ہو جیسے کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک ایسی قوم کی تخلیق کی جاسکے جس کے تمام شہری کھیلوں میں ریکارڈ توڑ دیں۔ ایسے افراد ہمیشہ پائے جاتے رہیں گے جو اوسط افراد سے زیادہ ذہین ہوں گے اور جو اپنے آپ کو دوسروں کے نافذ کردہ معاشرتی قانون کے پابند نہیں سمجھیں گے۔ وہ اتنے ذہین ہوں گے کہ ہر اخلاقی قید سے آزاد ہونے کے باعث بالآخر اپنے لیئے ایک ایسے تمدن کی نشو ونما کرینگے جو الڈس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY)[1] کے تصور کردہ تمدن سے ملتا جلتا ہوگا، جو المناک طور پر بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے اور ذہانت کے عروج کا صحیح نمائندہ ہے۔

---

[1] (از مصنف) BRAVE NEW WORLD BY ALDOUS HUXLEY

بہر نوع ایسی زندگی غیر انسانی معلوم ہوتی ہے۔ اور جو کچھ بھی
ہو یہ تو مسلمہ امر ہے کہ ابنِ آدم کو مسرت و شادمانی کی تلاش
ہمیشہ رہی ہے، اور جو مسرتیں اسے جذباتی، رحم دلانہ، اور جمالیاتی
وصفوں کی بدولت حاصل ہوتی ہیں وہ ان مسرتوں سے زیادہ
عمیق ہوتی ہیں جن کی اساس قطعاً خیالی اور ذہنی سرگرمیوں پر
ہو۔ مزید براں اگر ہم ذہنی طمانیت کا احتیاط کے ساتھ تجزیہ
کریں تو اس میں عموماً کوئی ذاتی جذباتی عنصر ہوتا ہے جو فی الحقیقت
شادمانی اور مسرت کا منبع ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہانت مسرتوں
میں اضافے کی سعی کرے گی لیکن وہ ایسی مسرتوں کی تلاش کیوں
کرے گی جو پوری پوری خود ستایانہ نہ ہوں؟ وہ ایسی مسرتوں کو
کیوں تلاش کرے گی جن کے لئے زحمت اٹھانا پڑے اور قربانیاں
دینا پڑیں؟ ایسی مسرتوں کے خلاف تو وہ جنگ کرے گی اور
ان کی جگہ ایسی مسرتوں کو قائم کرنے کی سعی کرے گی جو ٹھیک
ٹھیک عقلی ہونگی۔ اس کا لازمی نتیجہ بے ہودہ انسانی ہوگا جو مقصد
ارتقا کے منافی ہے۔ دوسرے ذاتیت کے نقطۂ نظر سے جو شے
انسانی نقطۂ نظر سے یہ تقاضائے انسانیت کے متضاد ہے کیونکہ
اتنا تو یقیناً صحیح ہے کہ اخلاقی قدروں کی ہمیشہ عظمت کی گئی ہے

اور آفاقی طور پر ایسے لوگ بھی ان کا اقرار کرتے ہیں جو خود اخلاقاً کمتر درجے پر ہوتے ہیں۔ راہِ حق میں جان دینے والے انسانیت کو بالا کرنے میں ایک زبردست ہیرو ہوتے ہیں اور اپنی مثال سے ایک خونخوار اژدہام کو انصاف یا آزادی کے نصب العین کے لئے جان لڑا دینے والی جماعت میں متبدل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابات کے دوروں میں حکومتیں عموماً اس بات کی احتیاط کرتی ہیں کہ ان کے کسی مخالف کی بدولت انقلابی شہیدوں کا درجہ نہ حاصل کر لے تاکہ اژدہاموں میں قابو سے باہر کر دینے والا تشدد نہ پیدا ہو جائے۔

مخلص اور مسلمہ بے لوثی میں وہ ناقابلِ تسخیر قوت ہوتی ہے جس کو نہایت درجے دقیقہ سنج فلسفوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اس قوت کو بغیر وضاحتوں کے ادراکاً محسوس کر لیتے ہیں گویا وہ سب اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہیں کہ یہ بے لوثی غیر متنازعہ فیہ نصب العین ہے جس سے وہ اپنی بزدلی اور اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے محروم ہیں۔

کون یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ مصلوب نہ ہوتے تو عیسائیت کی اشاعت ہوتی۔ اور وہ ترقی کرتی۔

اخلاقی قانون سے لوئی عائد کرتا ہے' یہ ان عادات کو قایم کرنے کا حکم دیتا ہے' جو ناخوش گوار' دشوار اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس کے مطالبات نفسِ امارہ پر شاق گزرتے ہیں جس کی واحد غایت اپنے آپ کو برقرار رکھنا اور شاد کام ہونا ہوتی ہے' اخلاقی قانون کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی خاطر جو بے دین لوگوں پر مبہم ہوتی ہے' اپنے خود غرضانہ جذبات کا گلا گھونٹ دیں لیکن وہ چیز یعنی شرف انسانی تحفظ نفس کی جبلت بھی زیادہ توانا ہوتی ہے۔ اس عظمتِ انسانی کی غامض آگاہی ایک رفیع اخلاقی زندگی عطا کرتی ہے جو روحانیت کا راستہ صاف کرتی ہے۔ اور سب سے بڑا عجیب نکتہ یہ ہے کہ اس سخت گیر ضابطے کو بنی نوع انسان کی عالمگیر توجہ اور قبولیت حاصل ہے لیکن کبھی کبھی ابن آدم اپنی ذہانت کی مدد سے اس کا مقابلہ کرکے اس کی اصلیت اور حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

جو مسرتیں یہ احساس شرف انسانیت فراہم کرتا ہے' وہ ان قربانیوں کی تلافی کر دیتی ہیں جن کا یہ مطالبہ کرتا ہے۔ فرض شناسی کے جذبے کی تکمیل اپنے جلو میں ایسی کلی طمانیتِ قلب لاتی ہے جو روح کے سکون و چین کا واحد ذریعہ ہے۔ اخلاق کا

حالِ انسان، جسے زمانہ سلف میں نیکوکار انسان کہا جاتا تھا، اپنے حلقۂ اثر میں مسرّت اور بہی خواہی کی شگفتگی کرتا ہے، یا اگر مسرّت ممکن نہ ہو، تو صبر و تحمل اس مسرّت کے جانشین پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی تکمیلِ انسانی شاذ و نادر ہی ملتی ہے لیکن کیا ہم یہ گمان کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ یہی منزلِ مقصود ہے جس کی طرف عملِ ارتقاء راجع ہے نہ کہ ایک خشک، محض ذاتی اور غیر انسانی ذہنیت کی طرف؟

ذہانت نے انسان کی یہ خدمت کر کے کہ اسے مطابقتِ ماحول کرنے، زندہ رہنے اور تسخیرِ کائنات کرنے کے قابل بنایا، ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ فریضہ وہ آئندہ بھی ادا کرتی رہے گی جس کا آئندہ نتیجہ یہ ہوگا کہ سائنس اور مذہب میں مصالحت ہو جائے گی بشرطیکہ مذہب بھی اس مقصد کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے اور معاونت کا ہاتھ بڑھائے۔ لیکن ذہانت کو اگر اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو وہ دوسرے مطابقتِ ماحول کے عملوں کی طرح عملِ ارتقاء کی مخالفت میں بھی کام کر سکتی ہے۔ معقولی تفکر سائنٹفک (سائنس نے) ان قوانینِ فطرت کا انکشاف کر کے یقیناً عملِ ارتقاء کی مدد کی ہے، جن کو صنعت و حرفت کی ترقی میں استعمال کر کے ہم

آدم اس قابل ہوگیا ہے کہ کائنات کی تسخیر کرے ماحول اور اپنی آزادی کو مستحکم کرے۔ مگر ذہانت، بیش از بیش مہلک جنگ آرائیاں کرکے، تصور الوہیت کے اور مجرد خیر و شر کے تخیل کے خلاف عمل پیرا ہوکر، منزلِ مقصود کے وجود سے انکار کرکے اور حیات اور انسان کی سرگرمیوں کی ساری اہمیت کو زائل کرکے، ارتقا کے اور خود اپنے خلاف عمل پیرا ہے۔ اگر وہ فوری جلبِ منفعت کی لعنت سے اپنے آپ کو بالاتر ثابت نہ کرے گی اور وہ اندھیاریاں لگائے رہے گی جو ارتقائی جلیبی حقیقتوں کے دیکھنے سے مانع ہیں تو ذہنیت ترقی کا ایک حیرت انگیز آلہ نہ رہیگی تب وہ ایک غیر فطری چیز ایک اعجوبہ خلقت شے بن جائیگی جب یہ صورت ہوگی تو ذہانت عقلی چیز نہ رہے گی۔

آج ہمیں یہ سوال درپیش ہے کہ آیا بالآخر فتح ذہانت کی ہوگی یا اخلاقیات کی؟ ابنِ آدم اس سوال کا جو جواب تجویز کریگا اسی پر انسانیت کے مقدر اور مسرت کا دار و مدار ہوگا۔ عقلیت کا اعتقاد صرف افادی اخلاق تو مہیا کرسکتا ہے جو بظاہر کارآمد ضرور ہوتا ہے، لیکن اس پراسرار اور نہایت اہم سیرت سے محروم ہوتا ہے جو محسوس تو کی جاسکتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آسکتی اور جس کی بدولت

اخلاقی ضوابط کو عظمت اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ خالص ذہنی اخلاقیات کے مقرر کردہ اصول مذہب کے مقرر کردہ اخلاقی اصولوں کے بالکل مطابق ہیں۔ ان کا بے مہر اقتدار، دیوانی قوانین کا سا ہوگا، جن کا احترام سزا یا جزا کی دفعات ہی سے کرایا جا سکتا ہے۔ وہ انسانی ہستی جو محض اس لئے قتل سے باز رہتی ہے یا چوری نہیں کرتی کہ اسے پھانسی دے دی جائے گی یا قیدخانے میں بند کر دی جائے گی۔ کوئی زیادہ دلچسپ انسانی نمونہ نہیں۔ اگر تنہا عقلیت کی حکومت "قایم ہوجائے" تو وہ سب انسانی امتیازات جن پر ہم کو بے اندازہ ناز ہے، جیسے احساس فرض، آزادی، شرف انسانی، بے لوث سعی کا حسن، شدہ شدہ غائب ہوجائیں گے یا طاق نسیاں پر رکھ دیئے جائیں گے یہاں تک کہ خود تہذیب وتمدن کا آفتاب بغیر کسی شفق تک کا نشان چھوڑتے ہوئے غروب ہوجائے گا۔

اس کے برعکس، اگر اخلاقی قانون کی حکمرانی ہو، تو وہ ذہن کی آزاد نشوونما کی راہ میں کسی طرح حائل نہیں ہوگا۔ وہ بتدریج سب کو اپنا ہم خیال بنائے گا اور سب بشری، وجدانی، اور ذہنی خواص کو پوری آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کی اجازت دیگا۔ وہ انسانی روح کے بلا قیود پھلنے پھولنے اور پوری آزادی کے ساتھ پہنچ کر تکمیل کرنے کا ذمہ دار

ہوگا۔ انسانی روح کا ارتقاء ضروری ہے۔ طریقۂ ارتقاء کو کوئی اہمیت نہیں، ہم اس کا پھر اعادہ کرتے ہیں کہ جو چیز اہم ہے وہ بشری سعی ہے؛ حقیقی ترقی داخلی شئے ہے اور اس کا انحصار محض اخلاقی اور روحانی اقدار کو، ٹھیک ٹھیک انسانی مفہوم کے مطابق، ترقی دینے کی پرخلوص اور پرجوش خواہش پر ہے۔ خود اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کرنا۔ اس کا یقین رکھنا کہ ایسا کر لینا ممکن ہے، اور یہ اعتقاد وثوق کہ عمل ارتقاء میں ابنِ آدم کا بھی فریضہ ہے۔ وہ خوبیاں ہیں جو انسانی ضابطۂ عمل پر مشتمل ہیں۔

مقدر انسانی کرۂ ارض پر ابن آدم کے وجود تک ہی محدود نہیں اور اسے یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی زندگی میں جو کچھ کام اس نے کئے ہیں ان سے اس کی کارکردگی کا اندازہ اتنا نہیں کیا جائے گا جتنا کہ ان آثار سے جو شہاب ثاقب کی طرح وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی ممکن ہے خود اسے کوئی آگاہی نہ ہو۔ ممکن ہے وہ یہ خیال کرتا ہو کہ موت اس دنیا میں اس کی حقیقت کو ختم کر دے گی۔ ممکن ہے کہ موت زیادہ بڑی اور زیادہ معنی خیز حقیقت کا آغاز ہو۔

ابنِ آدم کی زندگی کی مدّت اور آنے والی نسلوں پر اسکے اثر کی مدّت میں جو عدم تناسب ہے اسے دیکھ کر ہم حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے پیچھے ایک دنبالۂ اثر چھوڑ جاتا ہے خواہ یہ اثر دھیما ہو یا تاباں اور ہمیں اپنی زندگیوں کے سب اعمال کو اس یقین سے متاثر رکھنا چاہئے۔ کسی خاندان کے ایک سرپرست کی مثال پر غور کیجئے جس نے اپنی سیرت، مثال، اور خیالات سے اپنے بچوں، اور اپنے احباب سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس کی یاد اس کی وفات کے بعد بھی بہت دنوں تک باقی رہے گی اسکے معقول اور کردار اُن لوگوں کو بھی فیضان بخشتے رہیں گے جن سے وہ واقف بھی نہ تھا اپنی جن بہترین خوبیوں سے اکثر غیر محسوس طور پر اپنے احباب اور اعزا کو مستفید کرتا رہا ہے وہ کبھی کلیتاً رائیگاں نہیں جاتیں سب سے زیادہ موثر وہ آثار ہیں جو مفکر اور بانیان دین پیچھے چھوڑتے ہیں وہ پیغمبر جن کی بدولت ہمیں اخلاقی زندگی کا ناقابلِ ترمیم ڈھانچہ نصیب ہوا ہے۔ پانچ یا چھ ہزار برس کے عرصہ کے بعد ان کے نام فراموش ہو جاتے ہیں۔ ہم کو تو صرف ان اکابر کا علم ہے جن کو بہت قدیم سینہ بسینہ روایات ورثے میں پہونچیں اور انہوں نے ان

روایات کو کتابی صورتوں میں مدون کیا جن سے ہمیں ان کی کرۂ ارض پر چند روزہ زندگی اور ان کی شخصیتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ باوجود اس کے کہ گمنام روایت ہی کی شکل میں وہ یاد ظاہر ہوتی ہے پھر بھی اس کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔

استعارتاً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ روح کے ارتقا کے روشن دُنبالے کو، افراد کے متحدہ آثار، ابدیت کے تاریک پس منظر پر اور منور کرتے جاتے ہیں۔ اگر پسند کرے، تو ہر ایک شخص اپنے پیچھے ایک تاباں نقش چھوڑ سکتا ہے۔ جو موجودہ راہ رفتگان کو عریض یا طویل بنا کر پنکھ کی طرح پھیلی ہوئی چادرِ نور کی شکل دینے میں ممد بن سکتا ہے۔

یہ ایک طرح کی لاشخصی بقائے دوام ہے جس کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انفرادی بقائے دوام معقولی تصور کی دسترس سے باہر ہے۔ لیکن اگر ہم آثار کی حقیقت کو تسلیم کر لیں تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ اس اول ابنِ آدم کا پیچھے چھوڑا ہوا اثر جس نے مردوں کو دفن کیا اور کھرے پتھروں کے سروں کو باہم ملا کر ان سے مُردوں کے چہروں کو محفوظ کیا، اس پہلے ابنِ آدم کا اثر جس نے اپنے بچوں کو اپنے جیسے انسانوں کو قتل کرنے سے منع کیا! اس پہلے ابنِ آدم کا اثر

جس نے یہ ہدایت کی کہ زخمیوں اور ناتوانوں کو، جن میں خود شکار مارنے کی سکت نہیں کھلانا پلانا چاہیئے اور موت کے منہ سے بچانا چاہیئے! یہ سب ایسے آثار ہیں جو آج حقیقت ہیں، غالباً اس سے زیادہ پُرحقیقت جتنے وہ ابتدائے کار میں تھے ان دنبالی آثاروں کو منور کرنے والوں کی اس احسان مندی کو جس کے وہ مستحق ہیں ہم فراموش کر چکے ہیں۔ مگر جملہ اوقات میں وہ لوگ ہمارے رفیق کار ہیں، موجودہ ابن آدم نہایت قدیم ماضی کے سیلِ رواں کا ایک دھارا ہے جو اپنے قدیم ترین اجداد کے ساتھ ایک ایسے غیر مادی مگر غیر منقطع رشتے کے ساتھ مربوط ہے جو اہرامِ مصر سے زیادہ پائدار اور زیادہ دلنشین ہے۔ حضرت موسیٰ، گوتم بدھ، کابوشیس، لاؤتزی، اور مسیح کے[۵]

---

۵ (از مترجم) ایک مسلمان کے نزدیک تو یہ سب بزرگ ہستیاں نصوص صریحہ کے مطابق قابلِ تعظیم و تحسین ہیں لیکن مصنف کو اس فہرست میں رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا نظر نہ آنا اگر تعصب کی وجہ سے ہے تو قابلِ ملامت ہے اگر بے خبری کی بنا پر ہے تو قابلِ افسوس اور اس وجہ سے ہے جو غالباً غالب ہے کہ اس آخری شمعِ ہدایت کی چمک دمک میں پہلی تعلیمیں زیادہ اجاگر نہ ہو سکیں گی تو یہ مورخانہ دیانت کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے ابھی تک

چھوڑے ہوئے آثار اغلباً آج بنی نوع انسان پر اس سے زیادہ اثر انداز ہیں جتنے دن اُس وقت تھے جب ان کے بانی نوع انسانی کے مقدر اور شادمانی پر غور کرتے ہوں گے۔ اگر کوئی شخص نوع انسانی کی بھلائی کی سعی کرے اور اس کے بدلے میں سوائے اس مسرّت کے جو نوع انسانی کی ترقی میں مدد دینے سے اس کو حاصل ہوتی ہے اور کوئی اجر نہ چاہے تو اس کی ہستی کلیتًا مفقود نہیں ہو جاتی۔ اگر ہماری ذہنی سرگرمیاں بشمول تمام علوم سائنس انسان کی رہنمائی معرفت نفس کی، زندگی کے صحیح مفہوم، اور ان داخلی مخفی سرچشموں کی طرف نہیں کرتیں، تو وہ بےکار اور بے مصرف ہیں۔

واحد خلیوں والے اجسام نامی کے بقائے دوام میں ہماری اُمنگوں کے لئے کوئی تسکین کا سامان نہیں۔ میسوزوایک (MESOZOIC) دَور کے عظیم الجثہ رینگنے والے حیوانات کے حجری آثار ایسی یادگاریں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ):-
عیسائیت خائف ہے اور انسان عمومًا اپنی کمزور شمع کو وہاں نہیں لے جاتا جہاں اس کے بجھنے کا ڈر ہو۔ ادھر ہم بھی صحیح اسلام کی طرف سے غافل ہیں اور جو کام ہوا یا ہو رہا ہے اس میں گروہ بندی کی عصبیت زیادہ اور اسلام کی اصلی صورت کم ہے۔ مملکت پاکستان میں اب اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

نہیں جو ابنِ آدم کو روحانی فیضان فراہم کر سکیں۔ جو نقش اسے اپنے بعد چھوڑنا چاہیئے وہ اس سے اعلیٰ تر مرتبے کا ہونا چاہیئے اس یادگار کو تو ابنِ آدم کی اصلی برتری کا ثبوت نصب العین کے حصول کی طرف راجع قوتِ ارادی کی شکل میں پیش کرنا چاہیئے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ان تھک کوششوں کے سہارے روز افزوں قربِ الٰہی حاصل کر رہا ہے۔

کس کو یہ علم ہے کہ ہمارے موجودہ تہذیب و تمدّن کے کون سے آثار آئندہ باقی رہ جائیں گے۔ یہ تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبلِ بعید میں، اب سے دس یا بیس ہزار سال بعد اس دَور کی مادی سرگرمیوں کا کوئی اثر باقی نہ رہے گا۔ ہماری ان عظیم الشان عمارتوں کو، جو آج ہمارے فخر و مباہات کا باعث ہیں، تو اتنی پائداری اور عظمت بھی نصیب نہیں جو مصر کے منادر کو حاصل ہے، جن کے تحفظ کی ضمانت مصر کی خشک آب و ہوا نے لے رکھی ہے۔ دھاتوں کو زنگ لگ جاتا ہے اور لوہے کا سہارا لے کر سیمنٹ کی بنی ہوئی تعمیریں پھٹ پھٹ کر گر پڑتی ہیں۔ ہمارے فنونِ لطیفہ کے شاہکار، ہماری کتابیں اگر جنگوں کی تباہ کاریوں سے بچ بھی نکلیں تو کچھ مدت میں بوسیدہ

بوسیدہ ہوکر خاک میں مل جائیں گی۔ اگر انسانی ذہنیت میں کوئی
گہری تبدیلی نہ ہوگئی تو بعض خیالات ، جن کی وہ حامل ہیں ممکن ہے
باقی رہ جائیں۔ تاہم یہ قرینِ قیاس ہے کہ اخلاقی تخیل کی بے ثقل
رقت مادہ سے اپنا بدلہ لے، اور جس طرح کہ شفاف پانی کی ندی
اسوکال سنگ احمر کے بنے ہوئے مندروں کے کھنڈروں کے اندر
سے پیچ در پیچ مستقل راستہ بنا کر بہتی رہتی ہے، صرف یہی خیالات
شاندار ماضی کی گواہی دیتے رہیں گے۔

تسخیر کائنات میں جو دن دونی اور رات چوگنی ترقی انسان
نے کی ہے، جب تک اس کے مطابق ہی اس میں اخلاقی نشوونما
نہ ہوگی، اس کو وہ کامرانی اور مسرت حاصل نہ ہوگی جس کا وہ مستحق
ہے۔ آج کے معاشرے میں، اس ترقی کی اساس صرف عقلی
سائنس اور ماورائے عقل، مذہب کے اتحاد اور اتصال پر،
مادے اور جوہر کی یگانگت پر، مادے اور روح کے باہمی ربط کی
وضاحت پر، اور اس تفرق پر رکھی جا سکتی ہے جو جبلتوں کے
اسیر حیوان میں، اور بالارادہ ابن آدم کے درمیان قدرتی
ارتقا کے میدان میں ہے۔ اس کتاب میں ہم نے اسی حقیقت
کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عملِ ارتقا کا مستقبل اب

ہمارے ہاتھوں میں ہے اور وہ روح کے مستقبل کے ساتھ
وابستہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ مباحث ممکن ہے چند
لوگوں کے لئے ہی مفید مطلب ہوں، مگر کثرت ایسے لوگوں کی ہے
جو ان سے مطمئن نہ ہو سکیں گے اور جو غیر شعوری طور پر بنیادی
مطلق، ماورائے بشریت صداقتوں کی تلاش میں ہیں، ابھی
طویل مدتوں تک، انسان اوسطاً، اس قابل نہ ہو سکے گا کہ وہ
اپنی روز مرہ کی زندگی کے افعال کو اس کردار کے ساتھ ہم آہنگ
کر سکے جو اسے عمل ارتقا میں بطور ایک ذمہ دار عامل کے ادا کرنا
ہے۔ موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ابنِ آدم
اچھی طرح اس حقیقت کو سمجھ سکے کہ خالق کائنات کا شریک کار
بننے یا ارتقا کا گاد اور تلچھٹ ہو کر رہ جانے کا انحصار اس
امر پر ہے کہ اس کا طرز عمل کیا ہے، اپنے سب سے ادنٰے اور
سب سے اعلٰے فرائض وہ کیونکر ادا کرتا ہے اور اپنے جذباتی
مسائل وہ کس طریقے پر حل کرتا ہے۔ اس کے لئے اسے روشن خیالی،
ہمت افزائی، مشورت، تشفی اور رجا کی ضرورت ہے۔ کارگر
اور بے لوث مدد تو اس کو صرف اس عیسائی مذہب کی ہوشمندانہ

وحی کے ذریعے حاصل شدہ انسانی روایات ہی سے مل سکتی ہے، جو نوعِ انسانی کے روحانی خزانوں کا وارث، اور اس ابدی شمعِ ہدایت کا محافظ ہے، جو عہدِ عتیق سے جاں بلب تہذیبوں کی لاشوں کے اوپر سے عظیم المرتبت اور پرخلوص ہستیوں نے دست بدست ہم تک پہنچائی ہے۔[1]

---

[1] (از مترجم) فاعتبروا یا اولی الابصار۔ جو شمعِ ہدایت مسلمان کے پاس ہے اس کو اپنی اصلی صورت میں پاکستان کے علمائے سائنس اور حاملانِ دین کو دنیائے مغرب کو دکھلانے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام گروہ بندیوں سے الگ ہوکر خالص علمی روشنی میں کرنے کا ہے جس کا افسوس ہے علمائے سائنس سے ناواقفیت کی وجہ سے، اور سائنس دان علمِ دین سے بے خبری کی وجہ سے ابتک نہیں کرسکے۔ با اشتراکِ عمل یہ ممکن ہے۔ حکومت اگر توجہ کرے اور ایک محکمہ اس کام کے لئے مقرر کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مفید اور ضروری کام نہ ہوسکے۔ اس صدی کے آغاز تک تو عیسائی عالموں اور مبلغوں نے اسلام کو حد درجہ شرانگیز طریقے سے ہی دنیا کے سامنے پیش کیا لیکن اب صورتِ حال کسی قدر بہتر ہے۔ چنانچہ ریورینڈ اے۔ پی کاک کی ایک "تقریر" اسلامک ریویو ستمبر ۱۹۵۸ء میں چھپی ہے جو یوم النبی کے موقع پر کیکسٹن ہال لندن میں کی گئی جس کے چند اقتباسات درج کرتا ہوں: "آیئے پیغمبرِ اسلام کی حیات پر ایک نظر ڈالیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق:-

اور دیکھیں کہ وہ کونسی خصوصی خوبیاں آپ کی ذات میں تھیں جو ایک عیسائی سے بھی خراج تحسین حاصل کر سکتی ہیں۔ میرے نزدیک آپ کی ذات میں ایک عمیق بصیرت اور ہمت مردانہ نمایاں صفات ہیں۔ جس ماحول میں محمدؐ پیدا ہوئے اس میں چاروں طرف لامذہبیت کا دور دورہ تھا۔ ان کے ہمعصر یا تو صدہا دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز تھے یا کچھ ایسے بھی تھے جو کلیتاً کسی ایک خدا کو بھی نہیں مانتے تھے۔ خالق کائنات کے متعلق یا تو ان کا عقیدہ مبہم اور غیر واضح تھا یا تھی اور اس عقیدے کا ان کی روزانہ زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اخلاق کا معیار پست تھا۔ گناہ عام تھا۔ اعلیٰ اور ارفع انسانی نصب العین تو نا زونا در ہی کسی دل میں جلوہ زیب تھے۔ اس بے دینی اور لاوبالی زندگی کے خلاف آپ نے بہت پر جوش خطبے فرمائے "خدا ایک ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں"! اس کی اشاعت پر آپ نے زور دیا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کی بنی اسرائیل کے نبیوں نے بھی تلقین کی تھی۔ آپ کو بھی اپنی زندگی میں ویسے ہی واقعات پیش آئے جیسے ہمیشہ دیگر مذاہب کے ان سب رہنماؤں کو پیش آتے رہے جنہوں نے مذہبی عقائد اور اخلاقی اصولوں کی نزہت اور پاکیزگی کی سعی کی۔ کفار نے مظالم توڑے جس سے آپ نے یگانگت اور اشتراک عمل کا مطالبہ کیا اسی نے ان کو ملامت اور صعوبت کا نشانہ بنایا۔ ناچار آپکو بھی وہی کرنا پڑا جو حضرت ابراہیمؑ کو ہزاروں سال پہلے اور حضرت مسیح کو اپنے زمانہ میں کرنا پڑا۔ انجیل مقدس کے الفاظ میں "مخالفین سے ان کو کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی"۔ وہ گروہ بندیوں سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی یہ آرزو کہ خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے سب فرقے ایک جھنڈے کے نیچے

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق:-

جمع ہو جائیں پوری نہ ہو سکی۔ یہودی اور عیسائی اپنی زندگیوں کو ان کے ایمان کے پیروؤں کے ساتھ وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو اپنا راہِ عمل الگ کر لینا پڑا اور وہی کر دکھایا جس پر آپ کو یقین تھا کہ خدا کا حکم ہے۔

آپ اخوتِ اسلامی کو مستحکم کرنے میں لگ گئے۔ وہ لوگ جن میں آپ پیدا ہوئے تھے اور مذہبی فرقے جو گرد و نواح میں آباد تھے تنگ نظر تھے اور قبائلی عصبیت کے شکار۔ پیغمبرِ اسلام کو اس کا پورا احساس تھا کہ اگر خالق کائنات ایک اور صرف ایک ہے تو عالم انسانیت کو بھی ایک ہونا چاہیے، آپ کی بہت بڑی آرزو تھی کہ تمام دنیا کے لوگ ایک عالمگیر اخوت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں اور سب مالکین توحید خالق اور توحید انسانیت پر متحد ہو جائیں۔

علاوہ ازیں آپ خوب جانتے تھے اور اس پر اصرار فرماتے تھے کہ اگرچہ مذہبی عبادتیں اور تقریبات مذہبی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں تاہم اگر ان کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو یہ مہلک ہوگا۔ اپنی قوم اور دنیا کے سامنے آپ نے مذہب اور عقیدے کا ایک ایسا تصور پیش فرمایا جو اگرچہ اساسی محمولات کے اعتبار سے غائر تھا، اسلوب بیان میں سادہ اور صاف تھا۔ خانقاہیت یا رہبانیت (تکفیر) کے لئے اس کی تعلیمات میں کوئی مقام نہ تھا.... وہ تعلیمات ہیں جنکی عیسائیوں کو قدر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرت مسیح کی تعلیم بھی یہی تھی۔ وغیرہ وغیرہ

تقریر خاصی معنی خیز ہے۔

(۱۸)

آفاقی تخیل سمٹتا ہوا کرۂ ارض
تلخص اور نتائج

ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ لوگوں سے "آفاقی" طرزِ فکر کا مطالبہ کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے آپ کو عالمِ انسانیت کا بحیثیت مجموعی عناصر تصور کریں عالمگیر شہریت کے احساس کو بیدار کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ خیال نیک ہے، لیکن جو دلائل اس نیک خیال کی تبدیت کے لئے پیش ہوتے رہے وہ اتنے مبہم، اتنے جذباتی اور عقلاً اتنے ناکافی تھے کہ وہ انسانوں کی اکثریت یا اقلیت ہی کے بڑے حصے کے موجودہ نفسیاتی حصار ہو کے ساتھ لگا نہ کھا سکے۔ آفاقی نفسیات کا انحصار بڑی حد تک ہر خطے کے ماحول اور اسکی ترقی کے درجے پر ہے۔ اگر کسی عام رہائشی انسان سے کہا جاتا کہ وہ اپنے تخیل کو "قومی نقطۂ نظر" سے ترقی دے

تو اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اس کے آباؤاجداد اپنے خاندان
کی حدود ہی میں سوچ بچار کر سکتے تھے۔ اس نے خود لاکھوں برس کے
بعد اپنی اور اپنے بھائیوں کی اولاد پر خاندان کا تصور بنایا۔
اور پھر خاندانی قبیلے کا تصور گاؤں پر منتج ہوا۔ مدتوں اسکی دلچسپیوں
کی مملکت شکاری سرگرمیوں کے میدانوں سے آگے نہ بڑھی؛
جو چند میلوں کا رقبہ تھا۔

نوعِ انسانی بتدریج کرۂ ارض پر پھیلی۔ ناقابلِ کاشت
زمین کی رہنے والی جنگجو نسلوں نے وطن سے نکل کر پھیلنا شروع
کیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر، قتل و غارت کرتے ہوئے دوسری
بستیوں میں جا گھسے جو ٹولی کہ لڑتے مارتے اپنی
جنم بھومی سے بہت دور آگے نکل گئی۔ وہ قوتِ بازو
کی بدولت مقامیوں سے تھوڑی بہت مقامی لڑائی اور آویزش
کے بعد وہیں سکونت پذیر ہوئی۔ خانہ بدوش نسلوں کے
ایک جگہ جم کر رہنے والے کاہل قبیلوں میں دخول کی بدولت
مختلف گروہوں میں روابط قائم ہو گئے۔ جن گروہوں میں
اس سے پہلے ملنا جلنا نہیں تھا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ایک طرح
کا اشتراکِ زندگی[1] پیدا ہو گیا جس نے بہت مدت کے بعد ذاتی

[1] اگلے صفحہ پر دیکھو۔

عداوتوں کے فراموش ہونے پر ملکیت مشترکہ کے تصور کو جنم دیا جو روز افزوں وسعت پذیر خطۂ ارض پر محیط ہو گیا۔ قدرتی رکاوٹیں جیسے دریا اور پہاڑ نئے حملہ آوروں سے بچنے کیلئے ان کی فصیلیں بن گئے۔ مشترکہ فوائد کے خیال کے پیش نظر اتحاد عمل کی ترغیب دوسرے دور دراز انسانی گروہوں تک پھیلی۔ اور قبیلوں کے قائدطاقتور ہوتے گئے اور مقامی جنگوں سے فروغ حاصل ہونے پر قوم کا تصور بتدریج رونما ہوا۔ "جدید اخلاقی شخصیت" یعنی "وطن کا تصور" وجود میں آیا۔ اب لوگوں کا نقطۂ نظر "قومی" بن گیا۔ آج ہم اسی دور میں ہیں جو کئی ہزار برس سے چل رہا ہے۔

ان سب صدیوں میں کوئی ایسے بڑے واقعات نہیں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) (از مترجم) مصنف نے یہاں حیاتیات کی اصطلاح (SYMBIOSIS) استعمال کی ہے جس کی تعریف یہ ہے: دو نامی اجسام میں داخلی باہم منفعت بخش اشتراک جس کی بدولت کوئی نیا نامی جسم پیدا ہو جائے جیسے سماروغ FUNGUS اور آشنہ (ALGAE) کے باہم اشتراک سے کائی LICHEN پیدا ہوتی ہے۔

ہوئے جو ایک گروہ انسانی کے بقیہ انسانوں کے ساتھ طرزِ عمل کو بدلنے میں مد ہوتے۔ جب تک گھوڑا ہی سب سے زیادہ تیز رفتار ذریعہ نقل و حرکت تھا، تو فاصلوں کے عدم تغیر اور معاشرے کی مادی ساخت کے کڑا پن نے تفکرِ حیاتِ انسانی پر ایک طرح کا شریفانہ تناسب عائد کر دیا تھا جو عظیم الشان تمدنوں کے نشو و نما اور فنونِ لطیفہ میں بیش بہا ترقی کے لئے مناسب حال تھا۔

تقریباً ایک سو برس پہلے ارضی فاصلے، ابتدا میں بہت دھیمی رفتار سے، سکڑنا شروع ہو گئے۔ ریل کی پٹریوں نے بچھتے ہی فاصلوں کا مذاق اُڑانا، براعظموں کو سمیٹنا، لوگوں کو باہم ملانا اور ان کی اُمنگوں کو اُبھارنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے قید خانے کے دروازے کھول دیئے گئے؛ گویا ان الفاظ میں حقیقی مفہوم پیدا ہو گیا جو اب تک محض، یا تو نقشوں پر مختلف رنگوں کے نشانات، یا سراسر مہمل ہستیوں کے بے تکے افسانوں، یا عجیب و غریب لباسوں میں ملبوس اور حیرت انگیز رسومات کے عامل ہستیوں کے قصوں کو نگاہ کے سامنے لاتے تھے۔ دُخانی جہازوں کے ذریعے سمندری سفر نے اُن خرافاتی کہانیوں کا خاتمہ کر دیا جو پندرھویں صدی کے جہاز راں اپنے بحری سفروں سے واپس آکر سنایا کرتے تھے۔

بتدریج گورے رنگ والی نسل نے زمین پر تسلط جمانا شروع کیا۔ اور ہر جگہ دوسری نسلوں کی روایات اور دلفریب رسومات کو تباہ کرکے ان کے بدلے میں جو کچھ دیا وہ روئی کے بنے ہوئے کپڑے، ہتھیار اور چند بری خصلتوں سے زیادہ نہ تھا۔ یہی وہ عمل ہے جسکو معمولاً تمدن و تہذیب کہا جاتا ہے۔

بالآخر بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہوائی جہاز اور ریڈیو نمودار ہوئے اور پورے کرۂ ارض کو گھٹا کر اتنا کر دیا جتنا مرتفع جھیلوں پر رہنے والوں کو سوئٹزرلینڈ کی وسعت دکھائی دیتی ہے۔ آج ہم ایک بہت بڑے وسیع پارک میں رہتے ہیں جو دن بدن چھوٹا ہوتا جا رہا ہے[1] زمان کا اب پہلا سا احترام نہیں، اور نہ ہی ان شاہکاروں کا جن کی تخلیق میں اسے مدد دی کیونکہ دوڑ میں یہ ہار چکا ہے۔ یہ سابقہ ناقابل تسخیر دشمن اب ابن آدم کے مہمات عزایم کی راہ میں کوئی قابل توجہ مزاحمت نہیں

---

[1] (از مترجم) فضائی حملوں سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اب زمین تو تل کے برابر ہو گئی ہے اور فضا نے ابن آدم کے آگے اپنی وسعتیں سمیٹنا شروع کر دی ہیں۔ لیکن یہ خدا کرے کہیں چیونٹی کے پر نکل آنے کا مصداق نہ ہو۔

رہا کیونکہ اس کے خلاف بے رحمانہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔ فاصلوں
کو کم کر کے ابنِ آدم اپنی پوری مملکت اور اس کے باشیوں سے
سے واقف ہو گیا ہے۔ اپنے ہم عصروں کو اب وہ خوب جان
پہچان گیا ہے اور وہ پردۂ راز جو انکے اور اسکے درمیان پڑا ہوا تھا اب اُٹھ گیا
ہے۔ ہر چیز کے متعلق فیصلے تو اب بھی اپنے ہی معیاروں سے کرتا ہے
لیکن اب وہ آزاد ہے کہ سنی سنائی باتوں پر فیصلہ نہ کرے بلکہ ذاتی علم کی بنا پر
کرے۔ دُنیا کے دور دراز ملکوں کے واقعات کی اطلاع اسے فوراً مل جاتی
ہے۔ ہولناک آگ سڈنی میں تباہ کاری کر رہی ہو یا برکلن میں
وادیٔ گنگا میں سیلاب آئے ہوں یا مسی سی پی کی وادی میں، ابنِ آدم
کے نزدیک ان کی قدر ایک ہی ہے کیونکہ ان کے شروع ہونے کے
بعد ان کے متعلق چند منٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں ہی میں اسے اس کی
خبر ہو جاتی ہے اور اکثر تو یہ حادثات جاری ہی ہوتے ہیں کہ اس کا
خبریں دینے والا آلہ ان کی خبریں بہم پہنچانا شروع کر دیتا ہے حادثہ کی ہیبت
ناکی کو وقت فاصلے سے بھی زیادہ گھٹا کر دکھلاتا ہے۔ حادثہ
کی اہمیت میں ایسی شدت ہمیں محسوس ہوتی ہے جس پر ذاتی
شرکت ہی سبقت لے جا سکتی ہے۔ ان دو جملوں میں فرق عظیم
ہے؟ ۱۷۷۰ء میں ایک ہولناک قحط نے ہندوستان کو تباہ حال

کر دیا" اور " ایک ہولناک قحط نے اس وقت ہندوستان میں تباہی مچا رکھی ہے۔ ایک ہزار سے زائد آدمی موت کا شکار ہو گئے" بھوک سے۔ جو لوگ کہ صدہا سال پہلے مرے وہ تو آج ہر صورت میں مردہ ہی ہیں لیکن جو کل مرے ہیں یا آج صبح مرے ہیں بچائے جا سکتے تھے اگرچہ ان خبروں سے روح پر ایک مبہم ذمہ داری کا احساس چھا جاتا ہے" میں اس وقت جب کہ میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں وہ بھوک کے مارے گرے پڑتے ہیں زمین پر سے اٹھنے کی سکت ان میں نہیں "گزشتہ کل جو ان کی دردناک تصویریں کھینچی گئیں وہ ہماری تخیل پر اثر انداز ہیں۔" میں بلا شک کئی بچوں کی جانیں تلف ہونے سے بچا سکتا تھا اگر میں ان کو وہ کھانا پہنچا سکتا جو میز پر میرے سامنے ہے" حکام ملک کے جرم پر غصہ پیدا ہوتا ہے؛ ایک تازہ اتحادِ انسانیت، آنی ریڈیائی لہروں کے محو کردہ فاصلوں کوہستانوں اور سمندروں سے بے نیاز، ہمارے اندر ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ اس طرح کرۂ ارض کے انسانوں کے درمیان بتدریج ایک مضبوط انسانی رشتہ مستحکم ہونا شروع ہو جاتا ہے جو اس محیر العقول، وقت کو محو کرنے والی ایجاد سے پہلے ممکن نہ تھا۔

ریڈیو نے، جو ذہانت کا ایک حیرت انگیز ثمرہے، یوں مقاصد مذہب کے ایک مقصد کے پورا کرنے میں معاونت کی ہے۔ یعنی انسانوں کی باہمی مصالحت اور مفاہمت میں۔

آگے امید بندھتی ہے کہ ابنِ آدم کی سوچ بجا رہیں اب آفاقیت کا آغاز ہو جائے گا۔ اس کی میکانیکیتی ذہانت اس کے اخلاقی وجدان کی مدد کو پہونچ گئی ہے۔ زمان و مکان نے اس کو اسکے بھائی بندوں کے مصائب سے علٰحدہ کر رکھا تھا اور اس کے چاروں طرف رکاوٹیں حائل کر رکھی تھیں۔ ان دونوں میں تخفیف کر کے ابنِ آدم نے صدیاں پس انداز کرلی ہیں۔ اس کا افق قریب تر ہو گیا ہے۔ اس کا دائرہ نظر وسیع ہو گیا ہے، اس کے قلب میں قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی حیرت انگیز اختراعی صلاحیت اغلباً اس کے حقیقی کائناتی ارتقاء میں اس کی معاون ہو گی اور جس دن اس کی سمجھ میں یہ آجائے گا کہ وہ بیک وقت اس ارتقا کا صناع بھی ہے اور اس سے منفعت اندوز بھی اس دن اس ارتقاء کے غائر مفہوم پر بھی اسکو دسترس حاصل ہو جائے گی۔ کیونکہ اب اسے وہ خارجی وسائل حاصل ہو گئے ہیں جو اس کی داخلی سعی کو فروغ دینے میں ممد ہوں گے اور ایسے رشتوں کو استوار کریں گے جن کی بدولت اسے اس عظیم الشان

جسم کا جسے انسانیت کہتے ہیں ایک خلیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بدنصیبی سے میکانکیتی ترقی کے کچھ ماحصل اور بھی نکلے ہیں !"

ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ عظیم تر اور ہولناک جنگیں اسی کی بدولت وجود میں آنے لگی ہیں ضروری نہیں کہ دشمن برابر والے گھر ہی میں ہو؛ وہ دُنیا کے کسی حصے میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ایک آدمی کو نصف دنیا کے گرد چکر لگا آنے میں اس سے کم وقت لگتا ہے جتنا کہ ریل گاڑی میں نیویارک سے کیلی فورنیا تک جانے میں لگتا ہے۔ (مصنف کا مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اب جنگیں پہلے کی طرح مقامی نہیں عالمگیر ہوتی ہیں مترجم) جنگیں انسان کو حشروں کی فرسودہ معاشرتی حالت میں پہنچا دیتی ہیں کیونکہ آبادی کا ایک حصہ اسلحہ تیار کرنے میں لگ جانے کی وجہ سے اپنی خوراک خود پیدا کرنے کے ناقابل ہو جاتا ہے۔

جب تک کہ نوع انسانی کی اکثریت آفاقی تخیل پیدا نہ کر لے جب تک ارادی قوتوں کی سمت ایک ہی نصب العین کی طرف نہ ہو جائے اور جب تک کہ حکومتیں ایک ہی روحانی جذبے کے تحت اپنی ہمہ گیریوں کو مشترکہ ورثے کے منظم کرنے اور انفرادی آزادیوں کے تحفظ تک محدود نہ کر لیں گی جنگیں ہونا بند نہ ہوں گی قنوطی بنے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی ہم اس منزل پر نہیں پہنچے۔ لیکن چند ہزار برسوں میں تو بڑے بڑے

تغیرات ضرور رونما ہوں گے۔

مقدرِ انسانی ہیں اور روح کے مستقبل میں ہمیں وثیق اعتماد ہے لیکن اس کا اندیشہ ہے کہ فوری مستقبل، اور فوری سے ہماری مراد آنے والی صدی ہے، دُنیا کے لئے وہ مسرت، وہ زندگی کی شادکامی، وہ سکون، اور وہ احساس طمانیت میسر نہ کر سکے گا جو ارتقا کے موجودہ ترقی کے دور میں شریک کار بننے سے حاصل ہونا چاہیئے۔ ان سب نصب العینوں کا، ان سب جائز اُمیدوں کا، جو ایک نہ ایک دن یقیناً مجسم ہو کر سامنے آئیں گی، دار و مدار ابن آدم کے ضمیر کی انفرادی ترقی، صحائف آسمانی کی بیان کردہ نیکیوں کے عمیق نفوذ اور انسانی عظمت کے ادراک پر ہے۔

اصلی مسئلے یعنی داخلی صلاح کے مسئلے پر جمعیت خاطر کے ساتھ مشغول نہ ہونے کی وجہ سے انسان اپنی قوت کو فضول کوششوں میں ضائع کرتا رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ایسے اشتراکی وجود تخلیق کر کے اپنی آزادی کو محدود کرے گا جن کی مصنوعی شخصیت فرد کی ہستی کو پامال کر دے گی۔ نئے اصول اخلاق، جن کی اساس افراد کی فلاح و بہبود کو قربان کر کے ان اجتماعی اداروں کے تحفظ کے لزوم پر ہو گی، انفرادی اخلاق کے لئے خطرہ ثابت ہوں گے

اور ارتقا کے نقطۂ نظر سے اصلی اہمیت انفرادی اخلاق کو ہی
ہے؛ یا یہ ہوگا کہ وہ فرد کو اجتماعی اداروں کے ماتحت کرکے اسکی
حیثیت ثانوی کردیں گے جس سے اس کی نشو ونما رُک جائے گی
ایک مصنوعی کلیتًا خارجی اتحادیت عمل عائد کردی جائے گی۔
یہ کبھی اس اتحادِ عمل کی جگہ نہ لے سکے گی جو انسانی قلب کے محاسن سے
جو افروختہ ہوکر اپنے چاروں طرف ضو فگنی کرتا ہے۔ الگ الگ عناصر
کو حقیقی اتصال دینے کے لئے یہ کافی نہیں کہ ان کو ایک بکس میں
سربمہر کردیا جائے؛ ہر عنصر کو دوسرے عنصر کے ساتھ مربوط کرنا
ضروری ہے۔ ایک عائد کردہ اتحادیت عمل، جس کی بنیاد کلیتًا
کسی جماعت کے مادی فوائد پر ہو، وہ حقیقی اور بشری اتحادیت
عمل کے متضاد ہے اور اس کی نشو ونما کے راستے میں روڑے
اٹکاتی ہے۔

حیف صد حیف جن انقلاباتِ عظیم (مصنف کی مراد دوسری
جنگِ عظیم سے ہے۔ مترجم) میں سے دنیا ابھی گزری ہے ان سے
نوع انسانی کی قوت اتنی سلب ہوجائے گی کہ انفرادیت خطرے
میں پڑ جائیگی۔ اولوالعزمیاں، بالخصوص یورپ میں، مدتوں کیلئے
امن کے تحفظ تک محدود ہو جائیں گی؛ تمدنی کے خلاف تحفظ، بھوک

کے خلاف تحفظ سردی کے خلاف تحفظ، نوع انسانی مصائب سے نہایت چکنا چور ہو جائے گی۔ وہی خوف و ہراس جو از منۂ قدیم میں انسان کے اجداد کو گھیرے رہتے تھے پھر سامنے آگئے ہیں، اور قرین قیاس ہے کہ پھر وہی ٹولیاں بنا کر رہنے کی ضرورت، وہی گلوں میں مل کر رہنے کا حیوانی عزم، خانہ بدوش قوموں والی جرأتوں میں پنہاں جبلت، عوام میں پھر نمودار ہو جائے گی۔ اس خدشے کے ابتدائی آثار ابھی سے سامنے آرہے ہیں۔ اغلباً یہ ان ہیبت زدانہ یا دوسرے تحفظی اداروں کی کثرت کی شکل میں سامنے صورت پذیر ہوں گے جن کا آغاز تو افراد کے حقوق کے تحفظ سے ہوتا ہے مگر بالعموم خاتمہ ان کا فرد کی ہستی کو ملیا میٹ کرنے اور اس کے حقوق کو پامال کرنے پر ہوتا ہے۔ جب ابن آدم مادی اشیاء کی غلامی میں آجائے گا، جب اس کی انفرادیت زائل ہو جائیگی، جب وہ بے جان معاشرتی یا سیاسی گٹھ جوڑوں میں مادی تحفظ کی اُمید باطل لے کر پناہ گزین ہو گا؛ تو بے ایمان اور ناخداشناس نیتے اور قائد اس کی اس حالت زار سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے؛ روحانی قوت کی اطاعت سے انحراف، جو سرگرم علمیت اور واضح بصیرت کے فقدان کی وجہ سے ان لوگوں کی مایوسی کا باعث

ہو جاتا ہے جبکہ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے ممکن ہے ضمیر انسانی کے تقاضوں کو فرو کر دے۔ انسانی ارتقا کے لئے شاید یہ دور تیرہ و تار ثابت ہو، ایک بے مدعا، خفیہ سازشوں کا دور، اصلاحی پیش قدمی کی بجائے بے یقینی کا دور، غرضیکہ حقیقی ارتقا کے تنزل کا دور۔

خدا کرے کہ ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہو۔ لیکن اگر ہم نے وقت کے اشارات کا صحیح مفہوم پا لیا ہے، یا اگر ہم نے بعض علامات کی غلط توجیہ بھی کر لی ہے تو بھی ہماری رائے میں نوع انسانی کو نجات مذہب ہی میں مل سکے گی۔ ہاں یہ شرط ہے کہ یہ ہو خالص عیسائیت جس میں قدیم نصب العینوں کے ذریعے پھر سے جان ڈالی گئی ہو، سائنس کی ترقیوں سے باخبر ہو، معقول نظری ذہانت کے خلاف تعصب سے پاک ہو، اور فرقہ بندیوں کی حدود سے ارفع و اعلیٰ پرواز رکھتا ہو۔ عیسائیت کے دو ہزار برس کے دوران میں کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ نوع انسانی کی تشفی اور رہنمائی کے لئے کلیسا کو اس سے بہتر موقع ملا ہو یا ادائیگی فرض کے لئے فوری اقدام کی ضرورت پیش آئی ہو۔

موجودہ صورت حال کے متعلق جو خدشات ہم نے ظاہر کئے ہیں ان سے انسان کے معنوی ارتقا پر ہمارے ایمان کو کسی طرح

کوئی صحت نہیں پہونچتا۔ بلکہ بلاشک وشبہ ذی حیات ہستیوں کے تحقیقی مطالعے میں علمائے الفوا تر ہمیں ایسی مخصوص میکانکیتوں کا پتہ چلتا رہا ہے جو دوسرے زیادہ عمومی ضوابط کے ماتحت کام کرتی ہیں اور جن ضابطوں کے وجود کا پتہ ہمیں عناصر فطرت کی بعض ان سلسلہ بندیوں سے چلتا ہے جنکا ہمارے کائنات پر عمل پیرا ضوابط کے مجموعے میں کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا، اس طرح ہم مشاہدے کے اعلیٰ تر پیمانے پر مثلاً ہر فطرت کے ایک سلسلے کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اپنا اظہار تو غیر مسلسل واقعات کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن ان میں تواتر کی اتنی باقاعدگی ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی متجانس کُل کا ایک حصہ ہیں۔ اسی طرح کہ جب ہم کسی کوہستانی ملک کے ایک لمبے سرنگ میں سفر کرتے ہیں۔

~~ہوتے ہیں~~ تو ہمیں ان کھڑکیوں کے ذریعے جو کہیں کہیں چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں، باہر کے قدرتی مناظر کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ان شاندار مناظر میں تسلسل نہیں ہوتا اور پھر ہر ایک کا پس منظر مختلف ہوتا ہے اور مناظر میں باہم کوئی ربط نہیں ہوتا ہے۔ تاہم ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک ہی وادی کا حصہ ہیں اور یہ سرنگ کی دیواریں ہی ہیں جو کوہستانی منظر کے بیک وقت

دکھائی دینے میں حائل ہیں۔

علم معدومیات کی دریافتوں کی بدولت ایسے ہی مناظر کا ہم پر انکشاف ہوا ہے جن پر بہت سے ماہرینِ سائنس کی تحقیقات کی بدولت ہم اس قابل ہیں کہ قانون ارتقار کی تاریخ کا ایک خاکہ کھینچ سکیں۔ یہ ایسی کھڑکیاں ہیں جو وسعت زمان پر کھلتی ہیں امکان پر نہیں۔ ہم زندہ اجسام کی مختلف صورتوں کے میکانکی ارتقار کا مشاہدہ ایک کروڑ سالوں کے دوران میں کرتے ہیں لیکن یہ کبھی ہمارے مشاہدے میں آتا ہے کہ یہ ترقی نہ تو ماحول ہی کے اثرات سے آزاد ہے اور نہ ہی ان نوامیس فطرت سے جو اس پر کارفرما ہیں عمل ارتقار اپنے جزیات میں گرد و پیش کے مادی احوال کے سانچے میں ڈھلتا رہا ہے اور احوال کا ہر تغیر نئے موثرات کے مطابق نئی زندہ صورتیں پیدا کرتا رہا ہے کرۂ ارض پر جو مظہر ان تغیرات کی بدولت آج موجود ہے وہ زمانی تسلسل کے پورے خواص کا مظہر ہے اور عالمی قوتوں کے رد عمل کا مجموعی ماحصل ہے جو بظاہر متضاد ضوابط کے ان ذہنوں سے وہ نوامیس فطرت جو ارضی مظہر پر عمل پیرا ہیں اور جن کی بدولت ابن آدم کا وجود ظہور پذیر ہوا فی الحال ہماری دسترس سے

باہر ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ اس عظیم الشان مہم کی آخری مرتقی شاخ ہم نوع انسانی ہیں اور ہم ایک رفیع المرتبت ترقی کے حامل ہیں، کیونکہ دیگر حیوانات کے برعکس، ضمیر کے حاصل ہو جانے سے، ہم اپنی آئندہ ارتقا کے خود صناع بن گئے ہیں۔ باوجود اس کے ہم ہزاروں زنجیروں کے ذریعے، غیر نامی اور ذی حیات پر مشتمل جملہ مادی کائنات کے ساتھ، جکڑے ہوئے ہیں۔ ان نامعلوم ضوابط کو جن کا پتہ ہمیں دور رس مقدر انسانی کی طرف نوع انسانی کے سیلاب کے تدریجی اور دشوار ارتفاع سے چلتا ہے، غیر متوقع حادثات سے سابقہ پڑتا ہے علاوہ ان سے اسی طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں جس طرح جامد مادے کے عمومی ضابطے فطرت کے مخصوص ضابطوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ہر کام یوں چلتا چلاتا ہے کہ گویا نوامیس فطرت کا خود درجہ وار ایک ترتیبی نظام ہے اور اگر ادنیٰ سطح پر کوئی عارضی بے ترتیبی واقع ہو جائے تو عظیم الشان عمومی منصوبے کی ہم آہنگی پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا، حیات کے ارتقا کے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق زمان کی قابل لحاظ اکائی ایک ہزار صدی کے مرتبے کی تھی۔ انسانی ارتقا کے پیمانے پر شاید یہ اکائی ہزار برس کے مرتبے کی ہے۔ لیکن

انسانی ذہانت ہیں چونکہ اتنی سکت نہیں کہ ارضی منظر، جس کا
امتداد لاکھوں برس کی وسعت رکھتا ہے، حرکیاتی انداز میں ابھر
قابو پالے اس لئے جسمانی اذیت اور جذباتی غم و غصہ سے مجروح
ہو کر، وہ مجبور ہے کہ بظاہر نا قابل توجیہ واقعات سے وہ خوفزدہ
ہو اور بظاہر نا واجب حادثات پر بیزاری کا اظہار کرے۔
ایسے ہنگامی واقعات کے زیر اثر جیسے کہ جنگ، یا اس مجبوری
کی وجہ سے جو اسے ان تغیرات سے مطابقت حاصل کرنے میں پیش
آتی ہے اور جو میکانیکی ترقی اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی مسائل سے وجود
میں آتی ہے، نوع انسانی کا ردِ عمل شدید ہوتا ہے اسے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ارتقا کی کشتی جو وہ کھے رہا ہے اپنے طریق و روش سے ہٹتی جا رہی
ہے اور وہ پتوار کو زور سے گھماتا ہے۔ لیکن وہ ماورائی ضابطے،
جن کی تعمیل بغیر ان کو جانے ہوئے، نوع انسانی کر رہی ہے،
ہزاروں صدیوں کے عرصے میں اسے اس حالت تک پہنچا چکے
ہیں کہ وہ ان چند عارضی انحرافوں سے متنفر ہو گیا ہے جو ارتقا کے
مشاہدے کے پیمانے پر غیر محسوس ہیں۔ اس جہاز کی طرح جس کے سفر
کے دوران میں ہر کے طریقی انحرافوں کو اس کا ملاح درست کرتا رہتا
ہے، نوع انسانی کبھی رکتی ہوئی اور ٹھٹکتی ہوئی ممکن ہے دکھائی د

لیکن یقیناً وہ بالآخر اس بندرگاہ پر ضرور پہونچے گی جو بیک وقت
اس کی منزلِ مقصود بھی ہے اور اس کی ہستی کی تخلیق کی وجہ بھی۔

روزمرہ کی زندگی میں، اپنے ہم عصروں سے میل ملاپ
میں، ابن آدم کو اپنی عقل سے کام لینا چاہیئے لیکن اگر وہ اپنے
قلب کی آواز پر توجہ رکھے تو وہ اس سے کم غلطیوں میں مبتلا
ہوگا جتنا کہ محض عقل کی رہنمائی میں وہ کر بیٹھتا ہے۔ حق بات
تو یہ ہے کہ بہترین عقلی فیصلہ بھی ہمیشہ مشتبہ ہی رہتا ہے کیونکہ
وہ سب عناصر، جو اس فیصلے کو مطلق قدر دینے کے لئے مطلوب
ہوتے ہیں، ناممکن ہے کہ فراہم کیئے جاسکیں۔ لہذا ان سب
فیصلوں میں جو عقلی معلوم ہوتے ہیں غلطی کے اسباب موجود رہتے
ہیں، اول تو اس لئے کہ وہ ہمیشہ اتنے عقلی نہیں ہوتے جتنا
کہ ہمیں یقین ہوتا ہے اور ہمیشہ ان میں کچھ نہ کچھ جذبات کا دخل
ہوتا ہے اور ثانیاً چونکہ ان کی اساس نامکمل اطلاع پر ہوتی ہے
چونکہ بہر صورت ہم جذبات کو محسوب کرنے پر مجبور ہیں اس لئے
بہتر صورت یہ ہے کہ ہم فراخ دلی کے ساتھ مشتبہ معاملات کے
متعلق اپنے فیصلوں میں جذبات کا جائز مقام تسلیم کریں۔

منصف مزاج بننے سے فیاض طبیعت بننا زیادہ بہتر ہے۔ بعض اوقات بجائے سمجھنے کی سعی کرنے کی ہمدردی کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ جب تک روحانی نشوونما پر زد نہ پڑتی ہو انفرادی دلجوئی کی عادت ڈالنا چاہیئے، اس دلجوئی کا موجب لاپروائی، کمزوری، اور بزدلی نہ ہونا چاہیئے اور ہمیں ارسطو کا قول فراموش نہ کرنا چاہیئے: "اس سے بدتر کوئی ناانصافی نہیں کہ ہم غیر مساوی اشیاؤں کو مساویانہ درجہ دیں!" صیاد قوموں اور بدنہاد انسانوں کی قوت غالبہ کو کچھ امداد اس بے خوفی کی وجہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے جو ان کے شکاروں کی انسان دوستی کے جذبات کا نتیجہ ہی ہوتی ہے مثلاً ان کو اچھی طرح پر اس کا علم ہوتا ہے کہ کوئی مہذب انسان اس کی جرأت نہ کرے گا کہ وہ شدید روحانی یا جسمانی تعذیب کو جائز رکھے، یا بڑے پیمانے پر شہریوں کی انبوہ در انبوہ باقاعدہ ہلاکت یا جلا وطنی کو عمل میں لائے۔ ایسے انسانوں اور قوموں سے جن میں بہیمیت نے انسانیت کی جگہ لے لی ہو، ان کی طاقت چھین لینا چاہیئے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ قوموں اور افراد کو بھی اس کا

علم ہونا چاہیئے کہ ان کی ضروریات کیا ہیں۔ اگر مہذب قوموں کو
امن مطلوب ہے تو ان کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مسئلے کی طرف
ان کا اقدام اساسی ہونا چاہیئے۔ گزشتہ نسلوں نے اس کے لئے
جو میثاقیں تیار کی ہیں ان میں ہر طرف شگاف پڑ چکے ہیں۔
اب ان کو عارضی تدبیروں، رسیلوں کے ٹکڑوں، گوندوانیوں
اور عالی مرتبت معزز امراء کے سنجیدگی کے ساتھ دستخط شدہ
صلحناموں سے مستحکم نہیں کیا جاسکتا۔ مزید براں استحکام و انضمام
تقاضیت بھی نہیں کرتا۔ امن کی استقامت ابن آدم کی داخلی
استحالت سے ہی کرنا چاہیئے خارجی ڈھانچے تعمیر کرنے سے مقصد
حاصل نہ ہوگا۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ سب جنگوں کا سرچشمہ
سب شر کا منبع ہمارے ہی اندر ہے۔ اگر اس دشمن کو جو ہمارے
اعماق قلب میں دبکا بیٹھا ہے زندہ رہنے دیا گیا تو کوئی خارجی
تحفظ کارگر نہ ہوگا۔ اس کا قلع قمع تو وقت کی امداد اور اسے ڈھونڈ
نکالنے کی راسخ سعی ہی سے ہوگا۔ اس مقصد کی کامیابی کا صرف ایک
ہی طریقہ ہے۔ اول تو یہ کہ تاریخی صداقت کا مسلک قائم کر کے
ساری دنیا کے نوجوانوں کو ایک ہی تاریخی مواد فراہم کیا جائے
تاکہ باہمی مفاہمت کی ایک اساس قائم ہو۔ یہ تو ابتدائی اقدام

ہے جو بغیر توقف فوراً کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انفرادی عظمت انسانی کا مسلک قایم کیا جائے اور قدیم جبلتوں کو مفلوج کر کے ابن آدم کو بہتر بنایا جائے۔ یہ کام آئندہ کی صدیوں میں تکمیل پا سکے گا۔

براہ راست نوجوانوں ہی کی اصلاح کرنے سے کامیابی کے ساتھ بہتر معاشرہ ڈھالا جا سکتا ہے۔ تمام ادعائی مسالک تصوف، معاشی ہوں استدلالی ہوں یا سیاسی، کی بجائے عیسائی تصوف کو قایم کرنا چاہیے کیونکہ یہی ایک تصوف ہے جس کی اساس آزادی اور شرف انسانی کے احترام پر ہے[1] جب لوگوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم حاصل ہوگی، جب ایک ہی اخلاقی ضابطوں پر وہ عامل ہوں گے اور ان کی سوچ بچار آفاقی ہوگی تو وہ آسانی

---

[1] (از مترجم) ناظرین نے غور فرمایا ہوگا کہ جہاں کہیں مصنف نے عیسائیت کے اس اعلیٰ مرتبے کا اعلان کیا ہے وہاں صرف چند ہی خطابت سے کام لیا ہے کوئی شہادت پیش نہیں کی جس سے دعوے کا ثبوت ہو لہٰذا افسوس اس کا نہیں کہ ایسا دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے ہر شخص کو اپنے ایمان کے اعلان کرنے کا حق پہنچتا ہے تو ہم مصنف کا اپنا فیصلہ کافی اطلاع پر صادر فرما رہا ہے جس کے خلاف وہ چند صفحے پہلے مقدر انسانی کہہ چکے ہیں اگر مصنف کو علم ہوتا کہ اسلام نے اللہ تعالیٰ نے آدم کو آزادی ہی نہیں خلافت ارضی سے سرفراز کیا ہے اور شرف بنی آدم کا اعلان فرما چکا ہے "انی جاعل فی الارض خلیفہ"

سے ایک دوسرے کے خلاف جنگ آرا ہونے کا خیال دل میں نہ آنے دیں گے اور باہمی مفاہمت قریب الحصول ہو جائے گی۔ آج وہ سب قومیں جو آزاد افراد پر مشتمل ہیں لیکن ساتھ ہی ایک خودمختار زندگی بھی ان کو حاصل ہے، اپنی زندگیوں اور کوششوں کو اسی نصب العین کے حصول پر مرتکز کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کوششیں بعض وقت تو خالصتاً افراد کی بہبودی کے پیش نظر کی جاتی ہیں، بعض اوقات محض قومی رہنماؤں کے فوائد کے لئے یا اس نصب العین کی خاطر جس کو یہ رہنما فرد کے نصب العین سے بہتر شمار کرتے ہیں صریحاً حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ دشمنوں سے اپنے ملکوں کا تحفظ کریں کیونکہ اس طرح وہ اپنے ملک کے افراد کا تحفظ کرتے ہیں جن کے وہ نمائندہ متصور ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ان کا فرض ہے کہ صحیح علمی اور اخلاقی روشنی کو پھیلا کر اور شر کی جڑوں کو کاٹ کر مستقبل کی تشکیل کریں۔ اگر یہ نہ کیا جائے گا تو یہ کھیل بے انتہا زمانہ تک چلتا رہے گا اور معاشرہ کی تعمیری طرزوں میں تبدیلیاں

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:-

تو غالباً وہ اس دعوے پر اتنا زور بلا خفت صرف نہ کرتا۔ اب یہ کام ہمارے کسی نوجوان سائنسدان کا ہے کہ وہ پاکستان میں اس تنظیمی کام کو اپنے ذمے لے۔

کرنے سے تو اداروں کی روح کو متغیر نہیں کیا جا سکتا۔ حکومتی ادارے جیسے ہیں اگر وہ ویسے ہی رہے تو تہذیب و تمدن اور ارتقا کی ترقی کی رفتار سست رہے گی کیونکہ بعض ممالک کی عملی سرگرمیاں تو دوسرے ممالک پر حملہ آوریوں کی جانب لگی رہیں گی اور بعض ممالک کی تحفظ کی تیاریوں میں۔ افراد کا اتحاد تو اخلاقی روحانی، اور ذہنی تعلیم ہی کی یکسانی سے منصۂ شہود پر آ سکتا ہے، اور یہی وہ مستحکم بنیاد فراہم کر سکتی ہے جس پر کوئی استوار اور پائدار معاشرہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ حکومت کو ابن آدم کا خادم ہونا چاہیئے، اس کی آزادانہ ارتقا میں اس کا تحفظ کرنا چاہیئے اور اس کی امنگوں کا اہل ہونا چاہیئے۔ حکومت کا یہ کام نہیں کہ اس پر قبضہ جما کر اسیر حلقوما ہو جائے کسی حکومت کی قدر اس کے افراد کی اقدار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی حکومت، افراد کی ترقی میں تنگ و دو کرنے کی بجائے اپنی اغراض کی تسکین میں لگی رہے تو وہ رجعت پسندانہ ہے اور انسانی عظمت کے لئے خطرے کا موجب۔

بعض لوگ ممکن ہے یہ کہیں کہ ابھی ہم اس زمانے سے بہت دور ہیں جب ابن آدم اتنا کافی مرتقی ہو جائے گا کہ اسے اپنی ذات کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اپنی حکومت کا تحقق سر دست تو وہ ایسے ہی سلوک

کا حق رکھتا ہی جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ رائے ممکن ہے صحیح ہو لیکن اس وجہ سے تو اور بھی ضروری ہے کہ اس کی نشو ونما میں امداد کی جائے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے معاشرے کی تنظیم کی جائے۔ کیونکہ جب کوئی حکومت ایسے مقاصد کے حاصل کرنے میں کوشاں رہے گی جو اس مقصد سے مختلف ہیں جو اس کے افراد کے پیش نظر ہونا چاہیئے تو کوئی قابل اعتنا حقیقی ترقی ممکن نہیں۔

ہمارے یہ سادہ خیالات؛ یہ عمومی منطقی اصول، جو اس پر مشتمل ہے کہ تمام انسانی مسائل کا حل فرد کے ذریعے تلاش کیا جائے اور وہ اس طرح کہ ان تنظیمات اجتماعی کی ترقی ہیں جس میں وہ شامل ہے، خواہ وہ کوئی کارخانہ ہو، یا ریاست۔ فرد کو موثر اور اساسی عنصر تصور کیا جائے؛ یہ اصول یہ مطالبہ کرتا ہے کہ فطرت کائنات میں؛ ارتقا میں؛ یہ ابن آدم ہی ہے جسے اہمیت حاصل ہے اور اس امر کی یاد تازہ کرتا ہے کہ معاشرتی واقعات اسکے نفسیاتی ارتقا کے لازمی نتائج ہیں! کہ کوئی پائیدار کام ایسا تکمیل نہیں پاتا جو انفرادی روح میں کسی سابق استحالے کا ماحصل نہ ہو اور یہ کہ یہی استحالہ اس کی جدوجہد کی غایت ہونا چاہیئے؛ یہ خیالات، جو ارتقا کے دور رس غائیت کے

مفروضے کے منطقی نتائج ہیں، جس کو ہم نے اس تصنیف میں مدّون
کیا ہے، جوہری طور پر عیسائی اخلاقیات کے ہیں[1] اس پر بھی
صورت حال یہ ہے کہ نہایت مخلص اور ذمہ دار رہنما بھی، ایسے
رہنما جو پورے اعتماد کے اہل ہیں، ان خیالات سے متاثر نہیں ہیں
آج ہر شخص امن کی تنظیم کے متعلق سوچ بچار میں غرق ہے
سب اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ فیصلہ کن مسئلہ ہے جو اور سب
مسائل پر فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن جو حل سامنے آتے ہیں وہ
سب "خارجی حل" ہیں جو گرد و پیش کے احوال میں تبدیلیاں کرتے
ہیں لیکن خود صاحب فکر ہستی پر اثر اندازی کی طرف کوئی توجہ نہیں
نہیں ہوتی اور اس کی شخصیت ایسی ہی غائب رہتی ہے جیسے
مویشیوں کے گلے میں کسی مویشی کی۔ مصنف کو ان اخلاقی کوششوں
کے ضروری ہونے پر کوئی اعتراض نہیں اس کا کہنا صرف یہ ہے
کہ ان میں کسی مستقبل کے لیے کوئی پیش بینی نہیں، ہم صلحناموں،
دستخطوں، مفاہمتوں، مجلسوں، بین الاقوامی پولیس، اور
پنچائتی عدالتوں کا ذکر تو سنتے ہیں لیکن ان صلحناموں اور دستخطوں

---

[1] (از مترجم) پھر یہ دعویٰ بے سند اور بے دلیل ہے۔

کے احترام، فیصلہ کن مجلسوں کی دیانت داری، منصفوں کی غیر جانب داری، اور جملہ اراکین کی صدق نیت کا کبھی کوئی تذکرہ نہیں سنتے اور یوں ظاہر ہے کہ یہ نہ ہوں تو یہ سب ذرائع بے قدر ہیں۔ اب تک ہمیں یہ معلوم ہو جانا چاہیئے تھا کہ ان ذرائع کی اثر پذیری کا انحصار تو کلیتًا ان ارباب حل و عقد کی اخلاقی سیرت پر ہے جنہوں نے صلحناموں کے مسودے تیار کیے ہیں یا ان کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ کاغذات جن پر ممالک کے باہمی تعلقات اور ان ملکوں کے باشندوں کی قسمت کا دس، بیس، یا تیس سال کے لئے طے پانا موقوف ہوتا ہے۔ اور جن کاغذات پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دستخط کیے جاتے ہیں، اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کو دستخط کنندگان کی ایک آنی ذمہ داری ہی حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات بجز چند روزہ "کاغذ کے پرزوں" سے زیادہ وقعت انکی نہیں ہوتی۔

جب تک کہ وہ اجتماعی ضمیر پیدا نہیں ہوتی جو حکومتوں کو نہیں، بلکہ خود قوموں کو یعنی قوموں کے افراد کو، ایسے نمائندوں کے طے کردہ عہدناموں کی پابندی کا مشترکہ ذمہ دار ٹھیرائے

اس وقت تک یہ قول و قرار المناک سوانگ ہی رہیں گے'
حیرت اس پر ہے کہ ابھی تک ایسے لوگ ہیں جو ایسے عہدناموں
کے چکمے میں آجاتے ہیں۔ با ایں ہمہ یہ کھیل جاری ہے اور مذکورہ بالا
حضرات پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ایسے عہدناموں
کے مسودے لکھواتے اور ان پر دستخط ثبت فرماتے ہیں جنکے
متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں امن کے ضامن ہونگے
کب تک یہ سلسلہ فریبی جاری رہے گی ؟

امن کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم اور پیچیدہ ہے کہ وہ ان سطحی
طریقوں سے حل نہیں ہو سکتا۔ حقیقی ضمیر کی عدم موجودگی میں،
جس کی تعمیر ہوتے ہوتے ہوگی، یہ مسئلہ صرف اس طرح حل ہوگا
کہ بچوں کے دماغوں پر باقاعدگی کے ساتھ اثر ڈالا جائے اور ان پر
کڑے اخلاقی ضابطے عائد کیے جائیں جو بعض افعال شنیعہ کو انکی
نظروں میں نفرت انگیز بنادیں۔ اگر انسانی شرف کا احساس
عالمگیر ہوتا تو وہ سچے قول اور تحریری اقرار کا ضامن ہوتا
اور [illegible] باہمی کا مددگار ہوتا اور عہدناموں کو حقیقی قدر عطا کرتا
چونکہ ہر شہری طے شدہ شرائط کی تعمیل کی ذمہ داری کو اپنا اخلاقی
فرض سمجھتا اس لئے امن بغیر کسی سعی کے متیقن ہو جاتا۔ اس اثنا

ہیں یہ خیال کرنا حق بجانب ہوگا کہ قرآنا اخلاقی تربیت، جس میں تمام
اور اخلاقی فضیلتوں کے، قول و قرار کے خواہ وہ کسی قسم کے ہوں
احترام کے مطلق لزوم پر زور دیا گیا ہے[1] اس ذہن کو تیار کردے گی

---

[1] (از مترجم) ایفائے عہد کے متعلق چند احکامات قرآنی پیش کرتا چلوں۔ جو اس بارے میں کچھ کم با عظمت نہ ہوں گے۔

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ○ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۴)

عہد کو پورا کرو کیونکہ یقیناً اس کی جواب طلبی کی جائے گی۔

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (مسلمانوں کی تعریف میں سورۂ بقرہ آیت ۱۷۷)

(اور) اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں جب اقرار کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ○ (سورہ مومنون آیت ۸)

اور (سچے مومن) وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور قول و قرار کا خیال رکھتے ہیں۔

اسی طرح عدل کے متعلق قرآنی احکام بھی ملاحظہ ہوں۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (سورہ انعام آیت ۱۵۲)

جب کوئی بات کہو تو خواہ وہ شخص جس کے متعلق تم بات کہو قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○ (سورہ الحجرات آیت ۹)

خدا انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس میں اگر بیج بویا گیا تو وہ نہ صرف پھوٹے گا بلکہ پھولے گا اور پھل لائے گا۔ انفرادی ضمیر کو تقویت دینے والے امور کی بجائے مستقبل کی تیاری کے لئے اگر ایسے حیلے کئے گئے جن میں ضمیر کو نظر انداز کر دیا گیا، تو نتیجہ ناکامی اور حسرتناک تضییع اوقات ہوگا۔

ساری دنیا کو اس حقیقت کا پورا احساس ہے جو انسانوں کی کثیر جماعت کے قابلِ اعتماد بن جانے سے حاصل ہوگی۔ اس

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ
(سورۃ النساء آیت ۱۳۹)

اے مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو چاہے وہ گواہی اپنے خلاف یا اپنے ماں باپ کے خلاف یا قرابت والوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مصنف کے ہمارے ہم وطن مسلمانوں کو ۱۴۰۰ برس سے معلوم ہیں۔ اگر مسلمان ہونا شرط ہے۔ ہم نے ریڈر بیڈ اے۔ پی کاک کی تقریر سے دو اقتباس اس باب کے آخیر پر اپنے حاشیے میں نقل کئے تھے۔ اسی تقریر میں سے دو ایک اقتباس ہم اور پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا اسلام کی وسعت کتنی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

بارے میں جتنا اتحادِ خیال دُنیا میں پایا جاتا ہے اتنا سوائے احکامِ عشرہ کے محولات کے اور کسی چیز کے بارے میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن جو سعی کہ اس خیال کو بچوں کے قلوب پر اتنا نقش کا لحجر کرنے کے لئے کی جا رہی ہے کہ یہ طبیعت ثانیہ بن جائے، وہ اتنی معمولی ہے کہ نا طقہ سر بہ گریباں ہے۔ صرف امن ہی نہیں، انصاف، تجارت، صنعت و حرفت، سائنس، غرضیکہ ساری دُنیا کے توازن و تعاون کا انحصار انسانوں کے قول اور دیانت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:-)

پیغمبرِ اسلام اپنی تعلیمات و خیالات میں پختگی رکھتے تھے۔ آپ یہ توقع نہیں کرتے تھے کہ مخالفین ان کی سب باتیں قبول کرلیں گے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ لوگوں کے خیالات اور تصورات زندگی میں ہمیشہ اختلافات رہیں گے اس لئے وہ دوسرے مذاہب کے متعلقین سے قائم کرنے کی رواداری کی تلقین فرماتے تھے۔ ان کو سب سے بڑی فکر اس بات کی رہتی تھی کہ توحیدِ خالق اور توحیدِ عالمِ انسانیت کا یقین دلوں میں پیدا ہو"۔ . . . . . .

"ہماری دُنیا آج ایک کرب و عذاب میں مبتلا ہے یعنی آدم ہر جگہ خوف زدہ اور سہا سہا چلتا نظر آتا ہے۔ کیا یا پائیڈر وجن بم پھٹنا چاہتا ہے یا نہیں؟ کیا وسعت اور ترقی کا دور آرہا ہے یا انسان اپنے ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کا سامان کر رہا ہے؟ نوعِ انسانی کی اس ناگوار پریشان حالی میں آپ کی تعلیمات ہم مسلمانوں کے لیے

کے اعتماد پر ہے، اور دس یا پندرہ برس کی تعلیم و تربیت میں
جو اخلاقی تعلیم بچوں کو دی جاتی ہے وہ چند گھنٹوں یا بعض حالتوں
میں چند دنوں سے زیادہ نہیں بنتی۔ بہت سے بے کار جزئیات
سے تو نوجوانوں کے دماغوں کو معمور کر دیا جاتا ہے لیکن جوہری

بسلسلہ صفحہ گزشتہ:۔
"بلکہ جمیع الناس کے لئے ایک تسکین بخش پیغام ہے، ویسا ہی پیغام جیسے حضرت عیسےٰ
اور دیگر اولوالعزم نبیوں کا پیغام تھا اور وہ یہ ہے "یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں، انسان
کی ملکیت نہیں کہ وہ اس میں جو چاہے کرے۔ یہ دنیا خدا نے پیدا کی ہے۔ ہمارے
پاس جو کچھ ہے سب قوائے ذہنی و جسمانی جو اس کے خزانۂ قدرت سے عطا ہوئے ہیں
ان کو اس طرح استعمال کرنا چاہئے گویا وہ ایک امانت ہیں جو خدا نے انسان
کے سپرد کی ہے۔ اگر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی بدولت وہ اعلیٰ مراتب حاصل
کر لیتا ہے تو اس کو یہ گھمنڈ نہ ہونا چاہئے کہ وہی مالک و مختار ہے بلکہ یہ ہمیشہ
یاد رکھنا چاہئے کہ وہ خدا کا ایک آلۂ کار ہے اور منشائے ربانی کے پورا کرنے
میں شریک کار ہے۔"
"پیغمبر اسلام نے یہود اور عیسائیوں سے مفاہمت کی سعی فرمائی۔
لیکن چونکہ وہ لوگ آمادہ نہ ہوئے آپ کو کامیابی نہ ہوئی۔ آج مذاہب

طور پر ضروری اجزا طاقِ نسیاں پر رکھے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو
ایسی ہی بات ہے جیسے کاشتکاروں کو یہ تعلیم دی جائے کہ
وہ کھیتوں میں ہل جوتنا سیکھے بغیر اس کے کنارے پھول بو دیں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ)

کی باہمی مفاہمت نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم مذہبی رواداری میں تعصب
اور وطنی کدورتوں کا شکار رہتے رہے تو بین الاقوامی سیاست، سائنس
اور تعلیم میں ہم آہنگی کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں گی۔ بیسویں
صدی کے اچھے دماغ جس نظم کو دنیا میں قائم کرنے کے خیال میں
لگے ہوئے ہیں وہ جب تک اپنی تجویزوں کو مذہب کے ضروری اصولوں کا سہارا
نہ دیں گے کامیاب نہ ہوں گے۔ اس میں ہم سب کو امداد کرنا چاہیے۔
ایسی عملی کوششیں پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہوں گی۔"
آپ اُن بلند پایہ ہستیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی زندگیوں
کو اس طرح گذارا جیسے وہ ہر لمحے خدا کے حضور میں حاضر ہوں۔ اور
لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا مطالبہ احکامِ خداوندی کرتے
تھے۔"

ماخوذ از اسلامک ریویو لندن ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء صفحات ۱۸ و ۱۷

یا نوخیز لڑکیوں کو آرائش و زیبائش کا فن تو سکھا دیا جائے، لیکن یہ نہ سکھلایا جائے کہ جسم کو پاک اور صاف کس طرح رکھا جاتا ہے۔ امتحانوں کا کام تو واقعات کی ایک مقدار کی جانچ ہے

جو تین مہینے کے اندر ہی اندر فراموش ہو جاتے ہیں، یا جو خالص فنی ہوتے ہیں، بچوں کو سکھلایا جاتا ہے کہ عامۃ الناس کے سامنے وہ عمدہ برتاؤ اور تمیز داری سے رہیں لیکن کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ بطور دعا کے وہ روزانہ یہ کہیں: "ہر وعدہ ایک مقدس فریضہ ہے، کوئی شخص عہد و پیمان کرنے پر مجبور نہیں لیکن جس نے اپنے عہد کا ایفا نہ کیا وہ ذلیل ہوگیا! وہ اپنی ذاتی شرافت کے خلاف ناقابل معافی جرم کا مرتکب ہے، وہ غداری کرتا ہے؛ وہ بے حیائی کے لباس میں جلوہ گر ہے؛ انسانی جماعت سے وہ اپنے آپ کو خارج کرتا ہے۔"

اگر یہ شکل حقیقت میں دعا کی نہیں تو عقیدے کا اظہار ہی سہی! ایسا عقیدہ جو انسان سے اپنے آپ کو مخاطب کر کے عظمت انسانی کا اقرار کراتا ہے اور حضور خالق کائنات میں جس نے یہ شرف ہم کو دیا ہے۔

مستقبل قریب ہی میں نوع انسانی باہمی بے اعتمادیوں کی بدولت

مصائب میں مبتلا ہوگی۔ ہم سب کو اس حقیقت کا احساس ہے لیکن
اس کو روکنے کے لئے کہ کہیں یہ صورت حال دائمی نہ ہو جائے کیا
کیا جا رہا ہے؟ چند ہی لوگوں کو اس کی فکر ہے۔ حکومتیں تو صرف
فوجوں کے قیام کا، اور رنج کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ
ابھی بہت ہی ضروری، اور ہر طرح کی باہمی میل جول میں رکاوٹیں پیدا کرنے
کا ہی خیال کر سکتی ہیں، اور یہ باہمی بدگمانیوں میں مزید اضافے کا باعث
ہے۔ کیا ان صاحب الرائے لوگوں میں جن کے مشورے پر لوگ دھیان
دیتے ہیں، ایسے چند افراد بھی ہم کو نہیں مل سکتے جو اپنے مشاغل
کی حدود سے باہر ایک انسانی زندگی کے ایک حقیر وقفے کے ماورا
اپنے تصوری نگاہ ڈالنے کے قابل ہوں اور آئندہ آنیوالی نسلوں میں صحیح بصیرت
پیدا کرنے کی انہیں فکر ہو۔ ایسی بصیرت جو عزت نفس سے
بھرپور اور ان اوہام سے معرا ہو جو مجموعی ترقی کے راستے
میں حائل ہیں؟ کیا ہم کو ایسے قائد نہیں مل سکتے جنہیں اتنی دوراندیشی
اور روشن ضمیری ہو کہ وہ پنج سالہ اقتصادی منصوبوں کے بجائے
انفرادی ترقی کا ایک ایسا بین الاقوامی منصوبہ تیار کریں جو
کئی پشتوں پر ممتد ہو؟ یہ ایک عظیم الشان کام اتنا وسیع ہے جو اغلباً
ہماری حقیر تمناؤں کے بس کا روگ نہیں!! فوری مسائل عارضی

حل طلب کرتے ہیں اور ایسے نتائج اپنے عقب میں لاتے ہیں جو دراصل ہی
ہوتے ہیں لیکن وہ کم خشک اور جلد حاصل ہو جاتے ہیں۔ خدا حکم لگانے
سے باز رکھے۔ نوع انسانی ابھی عقل و بصیرت عصر پر نہیں
پہونچی اور ابھی تک اس کی جدوجہد قبائلی پیمانے پر ہی ہے۔

مذکورہ بالا سطور کی تلخی سے متاثر ہو کر ابن آدم کے شاندار
مقدر پر ناظر کتاب کا ایمان متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ تاسف
کی گھڑیوں میں اس سے اور بھی مشتعل ہو کر اپنے متوقع کا منصب کو زیادہ
راسخ عزم کے ساتھ پورا کرنا چاہیے۔

حقیقی ابن آدم اپنی ضمیر کی ترقی کی ایسی منزل پہنچ چکا ہے
جس کی بدولت وہ اپنے نظریہ زندگی کو وسعت دینے اور بحیثیت ارتقا
کے ایک ذمہ دار عامل کی حیثیت سے اپنا شاندار فریضہ ادا کرنے
کے قابل ہو گیا ہے۔ بخلاف ان کثیر ابن آدموں کے جو سمندر کی تہ
پر ابھی جانا چاہنے کی خاطر انتہائی جدوجہد کرتے ہیں اور جن کو
کبھی اس امر کا شعور نہ ہوگا کہ وہ ایک ایسی مرجانی چٹان کی تاسیس
کر رہے ہیں جو صدیوں کے عرصے کے دوران میں ایک نو خیز جزیرہ
بن جائیگی اور جو جزیرہ حیات کی ہر ترقی سے معمور ہوگا۔ ابن آدم کو
علم ہے کہ وہ ایک نفیس تر اور مکمل تر نسل کو پیش رو ہے جس کا

تخلیق میں اس کا بھی حصہ ہے۔ جو عظیم الشان ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے اس پر اسے فخر ہونا چاہیئے اور اس پر افتخار اتنا ہونا چاہیئے کہ اس کے مقابلے میں لا بدی مگر عارضی مایوسیاں اور مصائب بے حقیقت معلوم ہوں اگر یہ نکتہ ذرا زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے اگر اپنے فریضے کی ادائیگی پر وہ نازاں ہوں اگر اس کی ادائیگی سے وہ لطف اندوز ہوں، تو روحانی نصب العین تک پہونچنے سے پہلے ہی، یہ دنیا ایک بہت بہتر دنیا ہو جائے۔

ضرورت اس کی ہے کہ ہر انسان یہ یاد رکھے کہ مقدر انسانی ایک لاثانی چیز ہے اور اس کے حصول کا دارومدار زیادہ تر اس پر ہے کہ اس کی قوت ارادی ارتقا کے عظیم الشان کام میں اشتراک کرے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ قانون ارتقا کا تقاضا یہی رہا ہے اور یہی ہو کہ یہ جدوجہد جاری رہے اور یہ کہ اگر مادی سطح سے یہ آویزش روحانی سطح پر آگئی ہے تو اس سے اس کی شدت میں فرق نہیں آیا؛ یہ بھی یاد رہے کہ انسانی حیثیت اس کی شرافت وعظمت، غلامی سے نجات حاصل کرنے اور اپنی غائر اور اعلیٰ امنگوں کی فرماں برداری میں سعی کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ

اسے یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ربانی نور کی رمق اس میں، اور صرف اسی میں ہے، اور اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو اس کو نظر انداز کر دے، اس کو بجھا دے، اور چاہے تو عمل کی سرگرمی سے منشاء ربانی میں اشتراک کرے اور جو کچھ کرے حسبۃً للہ کرے۔

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۵	MCCANNISM	MECHANISM	۳۶	کالم ۲ آخر	EOCFNE	EOCENE
〃	۷	ارتقاع	ارتقا	۳۶	۴ 〃	PAIEOZOIC	PALEOZOIC
۷	۱۱	مشہورزیانہ	مشہور زمانہ	〃	۲ سطر ۲۴	برل	برس
۱۰	۱۳	حل	سکل	〃	۳۰ 〃 ۳۴	CARBANIZ-FENOUS	CARBONIFE-RCUS
〃	〃	لدیم	لدیہم	〃	۳۳ آخر	DENONIAN	DEVONIAN
۱۴	۸	بعل	معل	۳۸	۲ سطر ۲	SILLRIAN	SILURIAN
۱۹	۱	اس سے	اس سے	〃	۳۰ ۳۱ 〃	سونگے	مونگے
〃	۸ و ۹	غیرمعمو	غیر معمولہ	۳۹	۳ 〃	جب س زین	جب سطح زمین
〃	۹	سعی	سعی	〃	۱۳	ذیلی زمانے	ذیلی زمانہ
۲۱	۸	ملی	علمی	〃	۱۹	سچ س سے	بیچ ہما ہے
۲۶	۴	نسل	نکل	۴۰	۴	پہلے کا نام	پہلے کو
〃	۱۷	ادا	ادادا	〃	۵	اس قرآن کو	لا
۲۷	۷	تانون	قانون	〃	۱۰	طبقات الارض	طبقات الارضی
〃	۱۶	جیسے	جیسے	۴۳	۱۲	دماں	دماغ
۳۱	۱	دماغی علاد	دماغی علوں	〃	۱۳	اصلاح	اصطلاح
〃	۵	پیچھے	پیٹھے	〃	۱۴	سر ہوتی	متغیر ہوتی
〃	۷	سے	سے	۴۴	۱	توصیح	توضیح
۳۲	۱۴	SCINCES	SCIENCES	〃	۱	ہوگو	ہوگا
۳۳	۱	اڈین	مادین	〃	۱۰	تولے	قوا سے
〃	۳	اپنی	اتنی	〃	۱۴	عرفا	عرفاً
〃	۱۰	کرنے میں دیگا	کرنے میں مدد دیگا	۴۶	۱۴	سلا	نوٹ صفحہ گزشتہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۷۶	۴	بقائے و صلح	بقائے اصلح	۴۸۷	۱۱	دال	داخل
″	۱۴	کشف ہوا ہے	کشف ہوتا ہے	″	۱۶	نواب	تواب
۴۷۷	۶	آگ	کاگ	۴۸۹	۱۳	یہ ہر کہ سعی فرور کا	یہ ہر کہ سعی ضروری ہے
۴۷۸	۲	ظاہر سے	مظاہر سے	۴۹۰	۵	ترمی	ترقی
″	۱۶	تحلل بسبب منطقی	تحلل بسبب منطقی	″	۷	تاکر	تاکہ
۴۷۹	۱	معقول نتائج عمل	معقولی نتائج عمل دوسرے	″	۱۲	بے ذر	بے حد
			مناہج عمل	۴۹۱	۲	اصحاب	انتخاب
″	۱۱	اور یہ طریقہ کار	اور نظامانہ طریقہ کار	″	۱۵	نوعی بدل	نوعی تبدل
″	۱۲	تدریجی	تدریجی بنا	″	″	مائل	حائل
۴۸۰	۳	روشن ضمیر	روشن ضمیری کی	۴۹۲	۴	قول عمل	ماحول کا عمل
″	۱۷	نہیں کیا	نہیں، جتنا	۴۹۴	۹	مادبیت	مادّیت
۴۸۱	۲	دم بھر نہ ہوا	دم بھر نہ ہوا ہو	″	۱۳	دمہ کسادی	وہ کیمیاوی
″	۴	بوجھ	بجز	″	۱۷	غیر منضط	غیر منضبط
۴۸۲	۱۲	جائز ور	جائز طور	۴۹۷	۱	بنانے من ہمیشہ	بنانے میں ہمیشہ
″	۵ و ۶	ان کی	بچوں کی زبانی	″	۲	بستر	بستر
″	۱۰	ردعمل	انفعالیت	″	۱۰	غائیت	غائیت
″	۱۱	ہو	ہول	″	۱۴	جانب بیک	جانب ۔ یہ بیک
۴۸۳	صفحہ کا نمبر	۴۸۰	۴۸۳	″	۱۷	آدم ریں	آدم میں
″	۲	شہ	شہر	۴۹۸	۴	۳/۵۲	۱/۵۱
۴۸۴	۱۵	ذریعے	ذریلیے	۵۰۰	۱۶ / ۱	ہی سادھی	ہی سیدھی سادھی
۴۸۵	۱	خلیوں	×	″	۷	آ خوروں	آخوروں
″	۱۳	ست	بحث	″	۱۲	تفتیشی	تفتیشی ہے
۴۸۶	۶	سے)	سے	۵۰۵	۱۳	زماوں	زمانوں
″	۸	اتفاق	اتفاقی	۵۰۷	۱۶	پاچر	پاچر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	تصحیح
۵۱۸	۹	یٔن سے	ہیں سے	۵۲۲	۱۳	لاطینی اور مصدر	لاطینی مصدر
〃	۱۱	MAXWOL	MAXWELL	〃	۱۶	جید	جیّد
〃	۱۲	الٰی درجہ	اعلیٰ درجہ	〃	۱۷	س کی	اس کی
〃	〃	ریاضی حائل	ریاضی کی حائل	〃	〃	IHONGHTS	THOUGHTS
〃	۱۳	عالم صبیعات	عالم طبیعات	〃	〃	جمالیاتی تخیلی	جمالیاتی اور تخیلی
۵۰۹	۱۴	تحفظی	تحفظی	۵۲۴	۱۳	ALDONS	ALDOUS
۵۱۰	۱۵	ذ نی یعنی	ذہنی سعی	〃	۱۷	ALDO S	ALDOUS
۵۱۱	۵	فرنست	فرضیت	۵۲۵	۲	تجربہ	تجزیہ
〃	〃	مسد	مفید	۵۲۷	۱	خلاقی	اخلاقی
〃	۱۱	زات	بالذات	〃	۱۰	اسائیز	اعجاز
۵۱۲	۷	بن جائیں	ہو گی	۵۲۸	۱۲	بوجائے گی	ہو جائے گی
〃	۱۶	ل جائیں گے	مل جائینگے	〃	۱۵	معقولی تفکر	عقلی تخیل سے
۵۱۳	۱	ہمسائے اپنے	ہمسائے کو اپنے	〃	۱۶	انفیشنا —	سائنس کے
〃	〃	حلانے	جلانے	۵۳۰	۱	حائل	حاصل
〃	۹	قابلہ	مقابلہ	〃	۸	یت	عقلیت
〃	۱۵	ولا لضالیں	ولاالضالین	۵۳۲	۹	معقولوں	مقولے
〃	۱۷	الصلاۃ	الصلوٰۃ	۵۳۳	۱۲	انفرادی	کہ انفرادی
۵۱۴	۹	ل جاتا ہے	مل جاتا ہے	۵۳۴	۱۱	کابوشیس	کنفیوشیس
[illegible]	۱۵	LAVISIAR	LAVOISIR	〃	۱۴	تحسیہ	تحیۃ
〃	۱۷	LAVODSIR	LAVOISIR	۵۳۵	۲	اجو	اجر
۵۱۰	۱۲	او —	اور	〃	۱۷	ملکت	مملکت
۵۲۱	۱۲	اور	یعنی	۵۳۶	۱۵	رسے	لوہے
〃	۱۷	جس ہم آہنگی	جسکی ہم آہنگی	〃	۱۷	بوسیدہ	×
۵۲۲	۱۳	INTI LLIGINAN	INTELLIGENCE	۵۳۷	۵	ازوال	×